جملہ حقوق محفوظ
سالنامہ
شاہجہاں
سنہ ۱۹۳۷ء
(ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی کا ماہنامہ)
مرتبہ
سید انصار ناصری بی اے، ایل ایل بی
و
سید وصی اشرف
مقام اشاعت
شاہجہاں روڈ جامع مسجد دہلی
سالنامہ آٹھ آنے
قیمت سالانہ تین روپئے

نمبر ۱

# فہرست مضامین



| نمبر شمار | مضمون | صاحب مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| (۱) | پیش لفظ | جناب سید انصار ناصری بی اے، ایل، ایل، بی، دہلوی | (۳) |
| (۲) | آل انڈیا پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن | جنرل سکریٹری کی رپورٹ | (۷) |
| (۳) | ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی | سکریٹری کی رپورٹ | (۱۱) |
| (۴) | ترقی پسندوں سے دو دو باتیں | جناب مولوی عبد الحق بی اے سکریٹری انجمن ترقی اردو | (۱۲) |
| (۵) | نئے ادب کی ضرورت | جناب سجاد ظہیر بی اے (آکسن) بار ایٹ لا | (۱۷) |
| (۶) | پرستش اور مزدور | جناب احسان بن دانش | (۲۱) |
| (۷) | ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم | جناب اختر حسین رائے پوری بی اے | (۲۲) |
| (۸) | چُپ گھر | جناب شاھد احمد بی اے (آنرز) دہلوی | (۲۶) |
| (۹) | گھر کی باتیں | جناب پنڈت رام چندر شرما | (۳۰) |
| (۱۰) | اردو ادب اور منشی پریم چند | جناب صادق الخیری بی اے | (۳۳) |
| (۱۱) | پُرانا گیت | جناب انصار ناصری بی اے۔ ایل۔ ایل، بی | (۳۵) |
| (۱۲) | غزل | جناب امین حزیں سیالکوٹی | (۴۶) |
| (۱۳) | ماں کی محبت | جناب پروفیسر آر۔ گامو | (۴۷) |
| (۱۴) | اپنا بچہ | جناب ممتاز حسین بی اے۔ بی ٹی | (۵۰) |
| (۱۵) | جھونپڑی | جناب رام برکشا بینی پوری | (۵۵) |
| (۱۶) | واجپئیوں کا باغ | جناب مرزا فہیم بیگ چغتائی | (۵۷) |
| (۱۷) | برنارڈ شا | جناب سید بادشاہ حسین حیدر آبادی | (۶۴) |
| (۱۸) | اندھا فقیر | جناب تابش دھلوی | (۶۹) |
| (۱۹) | ٹھوکر | جناب قیسی رامپوری | (۷۰) |
| (۲۰) | نرالی تجویز | جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے۔ ایل، ایل، بی چیف جج | (۷۳) |
| (۲۱) | خوش نصیب فقیر | جناب ظفر قریشی بی اے دھلوی | (۸۲) |
| (۲۲) | شدھانتی | جناب اشرف صبوحی بی اے دھلوی | (۸۹) |
| (۲۳) | حقیقت انسان کا ادراک | جناب آغا رفیق بلند شہری | (۹۷) |
| (۲۴) | نئے ادب کی ضرورت پر چند مشاہیر کی رائیں | | (۱۰۵) |
| (۲۵) | نہر صفا کے کنارے | از "آدمی" مترجمہ جناب صلاح الدین قریشی دھلوی | (۱۰۹) |
| (۲۶) | بال جبریل | جناب محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی | (۱۱۳) |
| (۲۷) | ایک شام | جناب اختر انصاری بی اے۔ بی ٹی | (۱۲۱) |
| (۲۸) | رواج کی بھینٹ | وصی اشرف دھلوی | (۱۲۳) |
| (۲۹) | ظرافت | ایم اسلم | (۱۲۹) |
| | دامن گلچیں | | (۱۳۲) |

شاہد احمد

صادق الخیری - ظفر قریشی - وصی اشرف - رحیم بیگ چغتائی اشرف صبوحی - صلاح الدین قریشی - انصار ناصری ،

پروفیسر آر۔ تامو

# پیش لفظ

اخباری جرائد میں روسے سنت ہے کہ وداع سال گذشتہ و استقبال سال نو کی تقریب میں کچھ لکھا جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء کی ستم ظریفیوں نے ہمیں اس لائق نہیں رکھا کہ ہم اس قسم کی کسی "سنت" پر کاربند ہو سکیں۔

یہ منحوس سال اردو ادب کے لئے جس قدر ناسازگار ثابت ہوا وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ ہمارے کئی فضیلت مآب پیشوایان ادب ہم سے بچھڑ گئے۔ پے درپے موت کے لاتعداد جانکاہ حملوں نے گلشن ادب کو ویران کر دیا۔ سب سے پہلے علامہ راشد الخیری نے داغ مفارقت دیا۔ ان کے اٹھ جانے سے ہندوستان کے کلاسیکی ادب کو جو عظیم الشان نقصان پہنچا۔ اس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکتی۔ مرحوم نے جس روش خاص سے موتی لٹائے اور جس موثر اسلوب تحریر کا سکہ جمایا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ غیر ممکن ہے کہ ہندوستان کو مرحوم کے مرتبہ کا کوئی اور باکمال ادیب اور دردمند مصلح لیل و نہار کی ہزاروں گردشوں کے بعد بھی نصیب ہو سکے۔" ایک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے"

علامہ مرحوم کے انتقال پر ملال کے بعد ہی ہمیں منشی پریم چند کے سانحۂ ارتحال کی وحشت اثر خبر سننی پڑی۔ افسوس یہ عالم باعمل مفکر اعظم ادیب جلیل رہنمائے قوم عین اس وقت ہم سے بچھڑ گیا۔ جبکہ ہمیں اس کی امامت کی اشد ضرورت تھی۔ منشی جی کے بعد ہی رائے بہادر شیو نرائن شمیم حضرت خلیق دہلوی حضرت صغر گونڈوی۔ حضرت محمد حسین ادیب۔ حضرت نیر کاکوروی۔ حضرت عرش گیاوی وغیرہم ایک ایک کر کے ہم سے بچھڑ گئے۔

ان حادثات کی غارتگری کا اندازہ محال ہے۔ مرنے والوں میں سے ہر ایک اپنے رنگ کا اختصاصی ہی نہیں موجد بھی تھا۔ جو جگہ خالی ہو گئی شاید ہی پُر ہو سکے۔ ایسے رفیع الشان ادیب اور شاعر زمانہ باربار پیدا نہیں کرتا۔ ان اہل کمال بزرگوں کے اٹھ جانے سے ہمیں ہندوستانی ادبیات کی ترقی اور نشوونما کی طرف سے مایوسی ہو چلی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ گو حالات ناساعد کے پیہم و متواتر نے ہمیں نیم جاں کر دیا ہے لیکن زیست کے آثار ہنوز باقی ہیں اور ملک کے جواں خیال و جواں عمر ادیب ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور لحظہ بہ لحظہ بیش از بیش فتوحات حاصل کر رہے ہیں۔

فی الحقیقت ہماری توقعات تمام تر انہی نوجوان ادیبوں سے وابستہ ہیں۔ ان کی مساعی جمیلہ اور عرق ریز کاوشوں سے ہمارے خزینۂ ادب میں معتدبہ اضافہ ہو رہا ہے۔ خدائے عزوجل ان کے ارادوں میں استقامت ان کی جدوجہد میں استقلال اور ان کے حوصلوں کی بلندی برقرار رکھے تو بہت

جلد ہم اپنے نقصانات کی کافی حد تک تلافی کر سکیں گے ۔

۱۹۳۶ء کی تباہ کاریوں کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ضرور رہا کہ ہم خوابِ خرگوش سے چونک اٹھے۔ جمود و بے حسی تمام ہوئی۔ فراغت و فرصت کی رنگ رلیاں ختم ہوئیں ۔ زندگی کی مسلسل جنگ نے صحیح فکر پر مجبور کر دیا۔ مجبوریوں نے دعوتِ عمل دی۔ اور ہم پورے جوش و خروش کے ساتھ کچھ کرنے اور کر گزرنے پر تل گئے۔ تنظیم و ترتیب کے ہنگامے ہوئے۔ پہلا سوال زبان کی حفاظت کا تھا ۔

## اُردو کانفرنس

چنانچہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علیگڈھ میں مولوی عبد الحق صاحب بالقابہ کی زیر قیادت اردو کانفرنس منعقد ہوئی ۔ موصوف کی مخلصانہ سرگرمی نے ہندوستان کے ہر گوشہ سے علماء و فضلاء کو کھینچ بلایا۔ مختلف جماعتوں کے نمایندے شریک ہوئے۔ پہلی نشست کے صدر راجہ صاحب محمود آباد بالقابہ تجویز ہوئے۔ استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے نمایندوں کی آؤ بھگت کی۔ صدر نے اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد مولوی عبد الحق صاحب نے اپنی تجاویز پیش کیں۔ نہ بحثیں ہوئیں نہ تعریض و تنقید نہ لمبے چوڑے ریزولیوشن پیش ہوئے۔ مولوی عبد الحق صاحب کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔ دوسرے اجلاس کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر مقرر ہوئے۔ کمیٹی نے تجاویز پیش کیں۔ جس کی رو سے چار کمیٹیاں بنائی گئیں۔ پہلی اصلاح زبان کی کمیٹی جس کا کام رسم خط اور املا کی اصلاح، ٹائپ اور اصطلاحات وغیرہ کے متعلق کوئی لائق عمل تجویز مرتب کرنا قرار دیا گیا۔ دوسری ادبی کمیٹی جس کا کام اردو تصانیف و تالیفات و تراجم کو فروغ دینا قرار دیا گیا۔ تیسری کمیٹی اشاعت خانہ قائم کرنے کیلئے بنائی گئی اور چوتھی مرکزی کمیٹی بنائی گئی۔ علاوہ ازیں برطانوی ہند میں چوبیس اور دیسی ریاستوں میں تیئیس مرکز مقرر کئے گئے۔ جہاں ترقی اردو کی شاخیں کھولی جائیں گی۔ چند اہم قراردادیں منظور ہوئیں۔ جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ:-

**انجمن ترقی اُردو کا صدر دفتر دہلی میں منتقل کیا جائے جہاں کئی لاکھ کے سرمایہ سے اُردو کا ایک اشاعت خانہ اور ایک وسیع کتب خانہ قائم کیا جائے۔**

ہم جملہ اہالیان دہلی کی طرف سے بالعموم اور ادارۂ شاہجہاں دہلی کے ترقی پسند مصنفین کی طرف سے بالخصوص انجمن ترقی اردو کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں اور بے چینی سے منتظر ہیں اس نیک ساعت کے جبکہ انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر یہاں منتقل ہو کر آئے۔ اور ہم اپنی حقیر خدمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں۔

اس سال کی دوسری زبردست تحریک "ترقی پسند مصنفین کی انجمن" کا وجود میں آنا ہے۔ اس اہم تحریک کے متعلق ہندوستان بھر میں کافی چرچا ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں اس کی غرض و غایت، مقاصد و ضوابط وغیرہ کا اعادہ کرنا تحصیل حاصل ثابت ہوگا۔ علاوہ ازیں صدر انجمن کے جنرل سکرٹری (سید سجاد ظہیر صاحب بی اے آکسن بار ایٹ لا) کی فاضلانہ رپورٹ سے اس انجمن کی مختلف شاخوں کی کارنمایاں ظاہر ہو جائیں گی۔ دہلی کی انجمن کے سکرٹری (شاہد احمد صاحب بی اے آنرز) کی رپورٹ سے یہاں کی انجمن کے حالات اور اس کی تدریجی ترقی ظاہر ہوگی۔

## ترقی پسند مصنفین کی ہندوستانی کانفرنس

۱۴-۱۵ نومبر کو الہ آباد میں ترقی پسند مصنفوں کی

ایک ہندوستانی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اُن صوبوں کے نمایندے شریک ہوئے۔ جہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے۔ مثلاً پنجاب' یوپی' دہلی' بہار وغیرہ جیسے اجلاس کے صدر رام برکش بنی پوری صاحب مقرر ہوئے۔ سب سے پہلے منشی پریم چند مرحوم کے تعزیتی ریزولیوشن پر تقریریں ہوئیں۔ تقریر کرنے والوں میں جینندر کمار۔ سدرشن۔ رگھوپت سہائے اور سجاد ظہیر وغیرہ حضرات شامل تھے اس کے بعد مضامین پڑھے گئے۔ احتشام علی صاحب (الہ آباد) نے "ادبیات میں انقلاب کے معنی" پر ایک عمدہ مضمون سنایا۔ پھر سندر صاحب (الہ آباد) نے "ہندی افسانوں" پر اپنا دلچسپ مقالہ پڑھا۔ اس کے بعد ایس ایس چوہان صاحب نے "ہندوستانی ترقی پسند لٹریچر" کے عنوان سے اپنا نہایت بیش قیمت مضمون پڑھا۔ ان کے بعد پنڈت رام نریش تری پاٹھی نے "دیہاتی گیت" پر اپنا مضمون پڑھا۔ پروفیسر اجمل خاں صاحب استاد شانتی نکیتن نے "انڈو رومن طرز تحریر" پر ایک پُرمغز تقریر کی۔ ان کے بعد جے پرکاش نرائن صاحب نے "ایک ترقی پسند سے ہماری توقعات" پر بصیرت افروز تقریر کی۔ سید مطلبی صاحب فرید آبادی نے "شمالی ہند میں انقلابی رجحانات" پر اپنا نہایت دلچسپ مقالہ پڑھا۔

ہندوستانی کانفرنس کا نمایاں ترین کام اردو ہندی کے قضیہ کا کوئی قابل قبول فیصلہ کرنا تھا۔ اور بحمداللہ حضرات سدرشن۔ آچاریہ نرندر دیو۔ ڈاکٹر محمد عالم (علیگڈھ) شریمتی اُوما نہرو (غیرہم) کی معاونت سے یہ طے پایا کہ اردو اور ہندی کے مابین ہمیں ایک ایسی زبان پیدا کرنی ہے جس میں نہ فارسی کی زیادہ آمیزش ہو نہ سنسکرت کی ٹھونس ٹھانس۔ سیدھی سادی صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان ہو۔ جسے زیادہ سے زیادہ آدمی سمجھ سکیں۔

دوسرا ریزولیوشن شاہد لطیف صاحب (متعلم علی گڈھ) نے پیش کیا کہ طلباء کو ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے دلچسپی لینی چاہئے تاکہ وہ ادب اور تمدن میں ترقی پسند رجحانات سے واقف ہو سکیں اور رجعت کی طرف نہ مائل ہوں۔ علی اطہر صاحب (پٹنہ) نے اس تجویز کی پُرزور تائید کی۔

ایک اور ریزولیوشن کے ذریعہ سیکرٹری کو اختیار دیا گیا کہ وہ پریم چند میموریل کے لئے کوئی باضابطہ تجویز مرتب کرے۔

یہ کانفرنس ہر حیثیت سے کامیاب رہی۔

"سال گذشتہ کی برکات" کا ذکر چھڑا ہے۔ تو کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس زبردست واقع کو نظر انداز کر دیں۔ جس نے دنیا بھر میں ہل چل مچا دی یعنی شہنشاہ معظم ایڈورڈ ہشتم کا اپنی جاں نواز محبوبہ کی خاطر برطانوی حکومت کے تخت و تاج کو خیرباد کہنا اور ان کی جگہ شہنشاہ جارج ششم کا سریر آرائے سلطنت ہونا۔ ہم اپنے نئے شہنشاہ کے اجلال و اقبال کے لئے دست بدعا ہیں۔ خدا کرے کہ اُن کا عہد حکومت ان کی غریب ہندوستانی رعایا کے لئے ہر طرح سازگار اور میمون و مامون ثابت ہو!!!

# شاہجہاں کا مستقبل

نیا سال نئی امنگوں نئے ارمانوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ شاہجہاں بھی نئے روپ میں نئے نئے وعدوں کے ساتھ کارزار عمل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ یہ اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں ایام خوردہ اصولوں کی پابندی مذہباً لازمی ہو۔ اور جہاں "لکیر کا فقیر" ہونا ہی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ اس نرالی آپج والے کی قدردانی معلوم! لیکن اگر اس مقولہ میں کچھ بھی صداقت ہے کہ — "سعی پیہم ہی دراصل کامیابی ہے" — تو "شاہجہاں" اپنے آپ کو اس "کامیابی" کا مستحق ثابت کرکے رہیگا۔ انشاءاللہ!

سال نو سے شاہجہاں "ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی" کا آرگن مقرر ہوا ہے۔ جس میں یہاں کی انجمن کی روداد و مضامین وغیرہ کے ساتھ دیگر شاخوں کے حالات وغیرہ بھی درج کئے جائیں گے۔ علاوہ ازیں اس میں صرف وہی مضامین جگہ پاسکیں گے۔ جو ہمارے معیار پر پورے اتریں یا بالفاظ دیگر جن پر "نئے ادب" کا اطلاق ہوتا ہو مختصراً شاہجہاں ایسا ادب پیش کریگا۔ جو عوام کے دکھ سکھ اور جد وجہد کا ترجمان ہو عشق و محبت کی جھوٹی سچی من گھڑت کہانیاں اور گل و بل کے فرسودہ ادبی چٹخارے ہمیں گہری نیند سلانے میں میٹھی لوری کا کام دیتے رہے۔ ظاہر ہے کہ زمانہ کس طرح ہمیشہ سوتے رہنے کی مہلت دے سکتا ہے۔ آج تو ایسے ادب کی ضرورت ہے جو ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگائے جو ہم میں تفکر، ہمت اور جوش پیدا کردے۔ جو ہماری مصیبتوں کا محاکمہ کرے اور جو ہم میں عمل کی روح پھونک دے جو ہمیں کر گزرنے اور چل نکلنے کی راہیں دکھائے۔ غرض یہ کہ ایسا ادب جس میں تڑپتی ہوئی زندگی ہو، جوانی ہو، امنگ ہو —

— وغیرہ وغیرہ

لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہمارے جواں خیال ادیب و مفکر اپنی مسلسل جنبش قلم سے شاہجہاں کو مزین کرتے رہیں —— شاہجہاں آپ کی خدمت میں ایک پیغام لیکر حاضر ہوتا ہے، سوچئے اور غور کیجئے۔ آپ کیا لکھیں گے؟ آپکو کیا لکھنا چاہیئے؟ کیا آپکے آئندہ رشحات قلم ان چند مجرّب تونددار ساہوکاروں کے لئے سامان عیش فراہم کرینگے جو اپنی فاسد خواہشات کی آسودگی کے لئے جائز و ناجائز کی تفریق اٹھا چکے ہیں یا ان افلاس اور بھوک کے مارے ہزاروں بیکسوں کیلئے تسلی اور ڈھارس کا سبب بن سکیں گے، جن پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا ہے؟

**انصار ناصری**

# افسانہ نمبر

جون ۱۹۳۷ء میں شاہجہاں کا بلند پایہ افسانہ نمبر شائع ہوگا۔ جس کی ضخامت تقریباً سالنامہ کے برابر ہوگی۔

خریداروں کو مفت پیش کیا جائے گا۔

**مینجر**

# آل انڈیا پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن

## جنرل سکریٹری کی رپورٹ

ترقی پسند مصنفین کی تحریک کو شروع ہوئے ابھی ایک سال سے کچھ ہی ہوا ہے۔ یہیں الہ آباد میں آٹھ دس آدمیوں نے فروری کے مہینے میں بیٹھ کر اس کے بارے میں بات چیت کرنی شروع کی تھی۔ یہ تھوڑے آدمی کسی طرح سے بھی سارے ہندوستان کیلئے ادب کے نمائندے نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن اب ہم تجربہ کی بنا پر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ زمانے کی ضرورت کو سمجھتے تھے اور ان میں کام کا حوصلہ تھا ان چند لوگوں میں پریم چند بھی تھے۔ کس طرح سے انہوں نے صبر کے ساتھ ہمارے خیالوں کو سنا۔ کیسے انہوں نے ہمیں ٹھیک راستہ دکھایا یہ باتیں آج جب وہ دنیا سے اٹھ گئے تو بار بار مجھے یاد آتی ہیں۔ اور اب مجھے اس بات کا شاید احساس ہوتا ہے کہ بغیر ان کی رائے، مدد، حوصلہ افزائی کے ہماری ابتدائی کوششوں کو کامیابی حاصل کرنے میں اتنی مشکلوں اتنی سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا جس کی کوئی انتہا نہیں۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے پودے کو پریم چند نے اس زمانے میں سینچا ہے جب وہ بہت کمزور تھا۔ جب اس کی جڑیں زمین میں اچھی طرح دھنس کر سخت اور مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ اور جب اس بات کا ڈر تھا کہ جہالت اور تعصب کی زہریلی ہوائیں اسے سکھا کر مار نہ ڈالیں۔

ایک مہینہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ ہمارے پہلے مینیفسٹو کی آنچ ہندوستان کے ہر کونے سے اٹھی۔ میں یہ الفاظ مبالغہ کیلئے نہیں استعمال کر رہا ہوں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی ادبی مرکز (LITERARY CENTRE) کوئی بڑا اخبار کوئی مشہور رسالہ ایسا نہیں تھا جس میں پروگریسو رائٹرس کے مینیفسٹو کا چرچا نہ ہوا ہو۔ اسی کے ساتھ ہم نے تمام ہندوستان کے پروگریسو لکھنے والوں سے اس مینیفسٹو پر دستخط بھی لینے شروع کئے۔ مارچ کے ختم تک لاہور، علیگڈھ، دہلی، الہ آباد، کلکتہ اور پونا میں ہماری شاخیں قائم ہو گئیں۔ ان کے علاوہ ہمارے ممبر اور ہمدرد امرتسر، لکھنؤ، کانپور، بنارس، بمبئی، احمد آباد، بنگلور، حیدرآباد دکن میں بھی نکل آئے جنہوں نے ان تمام شہروں میں پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن کی شاخیں قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

۱۰ اپریل کو لکھنؤ میں ہم نے اپنی پہلی آل انڈیا کانفرنس منعقد کی۔ میرے خیال میں یہ ہندوستان میں پہلا موقع تھا جب ہمارے وطن کے ہر حصے سے مصنفین ایک جگہ اکٹھا ہوئے تھے۔ گو کہ یہ کانفرنس کچھ بھی دھوم دھام سے نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہمارے لٹریچر کی تاریخ میں اس کی کئی وجہوں سے ایک خاص اہمیت ہے۔ پہلے تو یہ کافی بڑی بات تھی کہ بنگالی، ہندی، اردو، گجراتی، مرہٹی، کنڑیں تامل اور تلیگو کے لیکھک ایک ساتھ ہندوستان کے ادبی مسئلوں پر غور کریں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ہمارے دیس کے ہر حصہ میں اب ایسے لوگ موجود ہیں جو متحدہ طور پر یہ چاہتے ہیں کہ ملک کی بڑی بڑی زبانوں کا لٹریچر ایک خاص دھارے پر چلے۔ ہم سب یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بھارت ورش میں جو جو زبانیں بولی جاتی ہیں انہی زبانوں میں ایک خاص طرح کا لٹریچر پیدا کرنا ہے۔ ہماری زبان کا ہونا بالکل ضروری نہیں۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ ہمارے خیالات ٹھیک ہوں ہماری پوشاک چاہے مختلف لیکن ہماری انسانیت کا انداز ایک سا ہو، ہمارا راستہ ایک ہو۔ ہماری منزل ایک ہو۔

دوسری اہمیت لکھنؤ کانفرنس کی یہ ہے کہ اس کانفرنس میں وہ راستہ وہ منزل دریافت کرنے کی کوشش کی گئی جس کا کہ میں نے ابھی ذکر کیا۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ لٹریچر کا سماجی زندگی سے بہت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ ادب زندگی کے باہر کوئی چیز نہیں۔ خیالات آسمان سے لوگوں کے ذہن میں نہیں اترتے بلکہ ان پر سماجی حالتوں کا اثر پڑتا ہے ان باتوں کا خیال کرتے ہوئے ہم نے یہ طے کیا کہ ہمارے لیکھکوں کا یہ فرض ہے کہ وہ سماج میں ان طاقتوں کی مدد کریں جو اسے ترقی کی طرف لے جاتی ہیں۔ کانفرنس نے اپنے اعلان میں اس بات کا اظہار کیا کہ وہ ترقی پسندی (PROGRESSIVE) کے کیا معنی سمجھتی ہے۔ ہم نے

یہ مانا کہ اس لفظ کے معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن آجکل کی حالت کو دیکھتے ہوئے آجکل کے واسطے۔ ہم نے اپنے اعلان میں وہ کم سے کم باتیں بتا دیں جن کو ماننا ہم پروگریسو لکھنے والے کیلئے لازمی سمجھتے ہیں اور آخر میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لکھنؤ کانفرنس میں یہ بات صاف طریقے سے کہدی گئی تھی کہ باوجودیکہ ہم اپنے ادب میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی کبھی نہیں کہ ہم اپنے قدیم یا پراچین کے ادب کو کھو دینا چاہتے ہیں یا اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہم نے اس بات کا دعوےٰ کیا کہ ترقی پسند مصنفین ہی ہماری پرانی تہذیب و تمدن CULTURE AND CIVILISATION کے بہترین ادبی خزانوں کے وارث قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لٹریچر کی زندہ روح صرف ترقی پسند مصنفین ہی میں مل سکتی ہے۔ اور زندہ ہی لوگ اپنے بزرگوں کی جمع کی ہوئی دولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مُردے مُردوں کے وارث کبھی نہیں ہو سکتے۔

## لکھنؤ کانفرنس کے بعد

لکھنؤ کانفرنس کے بعد ہماری تحریک اور تیزی کے ساتھ پھیلی۔ نئی شاخیں کھلیں ممبروں کی دلچسپی اور بڑھی اور ہم رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگے کہ ملک میں ایک نئی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ مثلاً ہماری لاہور کی شاخ کے ایک جلسہ میں ہمارے سماج کی موجودہ حالت اس طرح سے دکھلائی گئی کہ ایک ممبر نے اخباروں سے بے روزگار نوجوانوں کی خودکشیوں اور ہندوستان کی غربت کے دردناک واقعات (مثلاً لوگوں کا بھوک سے مر جانا) آزادانہ اظہار خیال اور رائے پر سرکار کی سختیاں۔ کتابوں کا ضبط ہونا۔ یہ سب ایک مسلسل طریقے سے ایک جگہ جمع کر کے سنایا اور اس طرح سے ہمارے مصنفین کے سامنے وہ سامان اکٹھا کر کے پیش کر دیا جس کی مدد سے وہ سماج کی اصلی حالت سے واقف ہو سکیں اور اپنی تصنیفوں میں ہماری سوسائٹی کے ان رستے ہوئے ناسوروں پر روشنی ڈال سکیں۔

دہلی کی شاخ نے ان تمام مضامین، نظموں، کہانیوں اور ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جو کہ وہاں کی انجمن میں پڑھی گئی تھی۔ اس مجموعہ میں ہمارے ایک نوجوان ممبر انصار ناصری کے تین ڈرامے خاص طور پر ذکر کرنے کے لائق ہیں۔ خاص کر "ہمدردی" میں چند صفحوں میں شہری سوسائٹی کے مختلف طبقوں کی بہت ہی چوکھی تصویر کھینچی گئی ہے۔ حقیقت نگاری REALISM کو انتہا تک پہنچا کر ہمارے مصنف نے طنز کے کوڑے ان لوگوں کو اتنی بیدردی کے ساتھ مارے ہیں جن سے اسے نفرت ہے اور جن سے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہم سب نفرت کریں کہ ہم اس کے آرٹ کی پوری کامیابی پر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ ان ڈراموں کے ترجموں کا انتظام ہو رہا ہے۔

الہ آباد کی شاخ کے جلسوں میں جو چیزیں پڑھی گئیں ان میں سے دو خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں۔ احمد علی کی کہانی "ہماری گلی" اور دوسرے رگھوپتی سہائے فراق کی نظم "ہم لوگ"۔ احمد علی کا نام اردو کہانی لکھنے والوں میں عرصہ سے مشہور ہے۔ حال میں ان کی ایک کتاب "شعلے" بھی چھپی ہے۔ لیکن میرے خیال میں "ہماری گلی" ان کی سب سے اچھی کہانی ہے۔ ہندوستان کے ایک بڑے شہر کی گندی گلی کے غریب اور دکھی رہنے والے وہ لوگ جن کی زندگی کی خوشیاں نہ خوشیاں ہیں اور نہ رنج، رنج ہیں۔ بلکہ جن کو غربت نے اتنا زیادہ گرا دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے حس ہو کر رہ گئے ہیں۔ احمد علی کی کہانی میں جیتے جاگتے ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ احمد علی نے اس کہانی میں یہ تو نہیں بتایا ہے کہ آخر ان گندی گلیوں کے بدلے ہندوستان میں ایسی ہوادار سڑکیں جن پر دو طرفہ ہرے ہرے پیڑ لگے ہوں کیسے بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ ان کی کہانی پڑھ کر ہمیں اپنی پستی کا خیال ہونے لگتا ہے۔

ہماری کانپور اور پٹنہ کی شاخیں ابھی دو ہی مہینے سے قائم ہوئی ہیں۔ اسلئے ان میں زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ پٹنہ کی شاخ میں بہار کے بہترین ادیب شامل ہیں۔ اور ہمیں ان سے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔ بنارس میں پریم چند جی کے اٹھ جانے سے ابھی تک کچھ کام نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اب وہاں کی شاخ کو چلانے کا ذمہ پروفیسر پی سہائے نے لیا ہے اور وہ وعدہ کرتے ہیں کہ تھوڑے دنوں میں بنارس میں ہمارا کام چل نکلے گا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ لکھنؤ میں بھی پروگریسو رائٹرس کی ایک شاخ جلد سے جلد قائم ہو جائے گی۔ اسی شہر کی زمین ہر پروگریسو سبھا کے لئے ایسی بنجر ثابت ہوئی ہے کہ مجھے وہاں سے مایوسی سی ہو چلی ہے۔ باوجودیکہ ہم کو اپنے دوستوں پر بھروسہ ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ انہیں جلد کامیابی ہوگی۔ یہ تو ہماری ان شاخوں کا حال ہے جو اتری ہندوستان کے ہندوستانی بولنے والے حصہ کا ہے۔ ان کے علاوہ بنگال، مہاراشٹر اور گجرات میں بھی ہماری ایسو سی ایشن قائم ہے۔ بنگال سے ابھی (دو تین روز ہوئے) مجھے یہ خبر ملی ہے کہ نہ صرف کلکتہ بلکہ پانچ چھ اور بنگال کے ضلعوں میں بھی ہماری ایسوسی ایشن کی شاخیں قائم ہو گئی ہیں۔

صوبہ مدراس میں ہمارے ممبر تو ہیں لیکن وہاں ابھی تک باقاعدہ شاخیں نہیں کھل سکی ہیں۔ ہم اس کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں کہ

وہاں بھی ہماری تحریک جڑ پکڑ لے۔

ہماری سب سے پہلی اور سب سے پرانی شاخ لندن کے پروگریسو رائٹرس کی ہے۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اس کے صدر ہیں۔ آپ کے دو ناول "اچھوت" اور "قلی" انگریزی میں چھپ چکے ہیں۔ "قلی" ابھی حال میں چھپا ہے اور انگلستان میں بہت زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ ولایت کے بڑے بڑے نقادوں (CRITICS) نے بہت تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر آنند کا ایک اور ناول "ALL MEN ARE EQUAL" "سب آدمی برابر ہیں" جس میں ہندوستان کے کسانوں کی موجودہ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عنقریب چھپنے والا ہے۔ میرے نزدیک یہ تینوں ناول ایسے ہیں جن کا پڑھنا ہر اس ہندوستانی پروگریسو رائٹر کے لئے ضروری ہے جو انگریزی جانتا ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے لندن کے دوستوں نے ایک انگریزی کا میگزین بھی نکالا ہے جس کا نام NEW INDIAN LITERATURE ہے۔ میری نظر سے اس رسالہ کی صرف ایک کاپی گذری ہے۔ ہندوستان میں اس رسالہ کا آنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ خالصتاً ادبی رسالہ ہے اور اس میں ہماری بے روح حکومت کے نظام کے خلاف کچھ بھی نہیں کہا گیا ہے۔

قبل اس کے کہ میں اپنی انجمن کے کاموں کی فہرست بند کروں آپ کو ان جلسوں کی بھی یاد دلانا چاہتا ہوں جو میکسیم گورکی کی یاد میں ہمارے ایسوسی ایشن نے تمام ہندوستان میں منعقد کئے۔ ان جلسوں میں ہماری انجمن کے ممبر ہی نہیں شامل ہوئے بلکہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں عام پبلک نے بھی حصہ لیا تھا۔ کلکتہ، بمبئی۔ الہ آباد میں تو بڑے بڑے جلسے گورکی کی یاد میں کئے گئے۔ دہلی، پٹنہ اور علیگڈھ اور شانتی نکیتن میں صرف ممبروں کے جلسے ہوئے۔ ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں سارے ہندوستان میں جلسے ہو جانا ایک ایسے شخص کی یاد میں جس کا رتبہ آجکل کے ترقی پسند۔ پروگریسو ادب میں بہت بڑا ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے ایسوسی ایشن نے اب اچھی طرح جڑ پکڑ لی ہے۔

یہ ہے ہمارے موجودہ ایسوسی ایشن کی حالت۔ آپ کو اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ یہ اطمینان کے قابل ہے یا نہیں۔ مجھے ذاتی طور پر تو اطمینان ہے۔ لیکن میں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ ابھی تک جو کچھ ہوا ہے۔ یہ بہت تھوڑی سی ابتدا ہے۔ اس لئے کوشش جو ہم سب کو مل کر اس تحریک کو پوری طرح کامیاب بنانے کیلئے ابھی کرنا باقی ہے۔ ہمارے اپنے وطن کی اور دنیا کی حالت ایسی نہیں کہ ہم ایک دم بھی چین سے بیٹھ سکیں۔

## ہم کیا چاہتے ہیں

پروگریسو رائٹرس MOVEMENT کا مطلب میں تو کم از کم یہ سمجھتا ہوں کہ ہم اس ملک میں ایسی کیفیت پیدا کر دیں۔ ایسی فضا قائم کر دیں جس میں ایسا لٹریچر پیدا ہونے لگے۔ جو اس دیش کے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جا سکے جس میں صرف امیروں یا صرف پڑھے لکھوں کی تفریح کا سامان نہ ہو بلکہ جو سادہ ہو صاف ہو۔ اور جو عنقا کا ہو۔ اسلئے نہیں کہ انہیں میٹھی میٹھی لوریاں دیکر سلا دیں۔ بلکہ جو انہیں جھنجھوڑ کر جگا دے۔ جو ان کے دماغ پر جھوٹی روحانیت اور رومانیت کی کالی گھٹا بن کر چھا نہ جائے۔ انہیں معطل نہ کر دے۔ بلکہ جو سورج کی تیز اور گرم روشنی کی طرح ہم میں حرارت اور تڑپ پیدا کر دے۔ آج دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ایک طرف وہ طاقتیں ہیں جو دنیا کو آگے بڑھانا چاہتی ہیں دوسری طرف وہ جو اسے پیچھے گھسیٹنا چاہتی ہیں۔ یورپ کے اہل علم۔ دودان اور لیکھک۔ مصنف۔ فلسفی اور سائنس داں یہ طے کر رہے ہیں کہ انہیں کن طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیئے۔ ایک طرف چند دولتمند طاقتوں کا طبقہ ہے دوسری طرف جمہوریت ہے۔ ایک طرف خود غرضی۔ وحشت اور بربریت جنگ۔ بھوک اور دھوکہ بازی کی شکل میں نمایاں ہو رہی ہے۔ دوسری طرف مظلوم۔ مونشت عنقا کی ان تمام مصیبتوں سے بچنے کی کوشش ہے ہر طرح محنت کرنے والے (جسمانی و دماغی) اپنی بکھری ہوئی قوت کو ایک جگہ جمع کر کے اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس موت کے بھیانک شکنجے سے نکل کر ایک نئی زندگی ایک نئے سنسار کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے مصنفین کی ایک بہت بڑی تحریک اس مقصد کیلئے چل رہی ہے کہ وہ انسانی تہذیب HUMAN CULTURE کو فاشزم اور جنگ کے خطرے سے بچائے۔ روماں رولاں اندرے جید۔ ولز۔ ہکسلے۔ ڈرائیزر وغیرہ جن کے نام سے ساری دنیا آشنا ہے اور ان کے علاوہ سینکڑوں لیکھک آج ہر طرح سے اس بات کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ دنیا کے اہل دماغ INTELECTUALS کو اس بات پر آمادہ کریں کہ ان کا کام یہ ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اپنے اپنے ملکوں کے عوام کی ہر اس تحریک کا ساتھ دیں جو ان کی سماجی آرتھک اور راجنتک بندھنوں کو توڑنے کے لئے ہے اور ان پر ظلم اور بد بختی کا خاتمہ کرنے کے لئے جاری ہے۔ یہی ایک

طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ہم قیمتی کلچر کو بچا سکتے ہیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کی مدد سے ہم اپنے ادب میں نئی روح پھونک سکتے ہیں۔

درباریوں اور ڈرائنگ روم کا لٹریچر اعلیٰ کو مبارک ہو۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے لکھنے والے جنتا سے کچھ ایسا گھل مل جائیں کہ وہ انہی کے ہو کر رہ جائیں۔ لیکن باہری اور اوپری ہمدردی سے بری اور کوئی چیز نہیں ہے۔ خواہ مخواہ مزدور اور کسان کے راگ الاپنا صرف اس وجہ سے کہ آجکل فیشن سا ہو چلا ہے۔ نہ صرف فضول اور بے اثر ہے۔ بلکہ نقصان دہ ہے۔ ایسے مصنفوں کی تصانیف پڑھکر یہ احساس ہوتا ہے جیسے کوئی بڑا آدمی اپنے سے نیچے اور کمزور شخص کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے۔ اور غریبوں کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو ان کی اور ذلت کرنا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ادب بھی جو اس طرح لکھا جائیگا سطحی اور بے سود ہوگا۔ عوام کا لٹریچر پیدا کرنے کیلئے ہمیں لازمی طور پر عوام کی جدوجہد میں حصہ لینا ہوگا۔ تبھی ایسا ہوگا کہ ہم انہیں سمجھ بھی سکیں گے اور سمجھا بھی سکیں گے۔ لیکن میرے کہنے کے یہ معنی نہیں کہ جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے وہ اچھے ادیب نہیں ہو سکتے۔ یا جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے ان کی جگہ ہمارے ایسوسی ایشن میں نہیں۔ ہاں امیروں کے مصاحبوں۔ درباری مسخروں۔ خود پرستوں SELF-CENTEREDS EGOTISTS کی ہمارے یہاں جگہ نہیں لیکن وہ ادیب۔ لیکھک جو اوپر کے طبقوں کا نقشہ سچائی کے ساتھ کھینچ سکتے ہیں۔ جن کو اس بات کا احساس ہے اور جو جانتے ہیں کہ اس زمانے کے سب سے اونچے سب سے اچھے۔ سب سے زبردست رجحانات TENDENCIES کیا ہیں جو سماج کو آگے بڑھتے ہوئے۔ حرکت کرتے ہوئے دیکھ سکنے کی سمجھ رکھتے ہیں۔ ان کے لیے ہمارے یہاں نہ صرف جگہ ہی ہے بلکہ عزت کی جگہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام اس قسم کے لیکھک ہمارے ایسوسی ایشن کے ممبر ہو جائیں۔

جہاں تک ہندوستانی بولنے والے صوبوں کا تعلق ہے ان کے لیے ہمارا یہ رویہ رہا ہے کہ ہم ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے وجود اور حفاظت کو یہاں کی ذہنی ترقی کیلئے ضروری سمجھتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ میرے خیال میں ہمیں تین باتیں اور یاد رکھنی چاہئیں (۱) جو کچھ بھی ہم ہندی یا اردو میں لکھیں یہ خیال کرکے لکھیں کہ عوام سمجھیں گے یا نہیں۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری زبان سہل ہوگی۔ صاف ہوگی۔ اور اردو ہندی کا فرق جو آئندہ جاکر ضرور مٹ جائیگا۔ ابھی سے کم ہونے لگیگا۔

(۲) ہر ہندی والا اردو سیکھے اور اردو والا ہندی سیکھے۔ کم از کم پروگریسو رائٹرز کو تو ضرور ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ ہندو مسلم کو قریب لانے کیلئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ دونوں زبانوں کا ارتقاء EVOLUTION ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ جس میں مذہب کا تعلق نہیں۔ دونوں کو سیکھنے سے ہمارا ادب اور زیادہ وسیع خیالات کو ادا کر سکے گا۔ جب ہم ایک دوسرے کا لکھا ہوا آسانی سے سمجھنے لگیں گے تو بولنے والی زبان کی طرح لکھی ہوئی زبان بھی رفتہ رفتہ ایک ہو جائے گی۔

(۳) اس بات کی کوشش کی جائے کہ اردو اور ہندی والے دونوں انڈو رومن لیپی (رسم الخط) کا استعمال کرنے لگیں۔ میں اس معاملہ پر زیادہ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جب آپ کانفرنس میں ان باتوں پر بحث کریں تو میری ان تجاویز کو بھی یاد رکھیں۔

بس اب میں اپنی رپورٹ ختم کرتا ہوں۔ ہمارے سامنے مشکلیں بہت سی تھیں اور اب بھی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایسی نہیں جس کا ہم سب مل کر مقابلہ نہ کر سکیں۔ بیٹھے بٹھائے اسٹیٹسمین نے ہمارے خلاف ایک جھوٹا بے بنیاد مضمون شائع کیا۔ جس میں یہ کہا گیا کہ P.W.A خاص موسکو کی چیز ہے۔ میں نے فوراً اخباروں میں اس مضمون کی تردید چھاپی۔ جس میں کہا کہ ہمارے ایسوسی ایشن پولٹیکل نہیں بلکہ ادبی ہے اور نہ اس کا کسی پولٹیکل پارٹی سے تعلق ہے۔ ہاں ہمارے ممبر مختلف پولٹیکل پارٹی کے ممبر ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسوسی ایشن میں وہ اس پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے شریک نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ ہمارے زیادہ ممبر کسی پارٹی کے ممبر نہیں۔ بہرحال اسٹیٹسمین کا یہ وار خالی گیا۔ اس مضمون کے بعد P.W.A کے ممبروں میں اضافہ ہو گیا اور کئی جگہوں میں ہماری نئی شاخیں کھل گئیں۔ اب دیکھیں ہمارے دشمنوں کو کیا نئی بات سوجھتی ہے۔

ہماری تحریک مجھے یقین ہے سال دو سال میں سب سے بڑی اور سب سے اہم ادبی تحریک ہو جائے گی۔ اسلیئے کہ زمانہ کا تقاضہ یہی ہے، اور جب ایسا ہوگا تو دراصل ادب آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ ہو جائیگا۔

سید سجاد ظہیر بی اے آکسن۔ بار ایٹ لا
جنرل سکریٹری آل انڈیا پروگریسو
رائٹرس ایسوسی ایشن

# ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی

## سکرٹری کی رپورٹ

الحمدللہ کہ دہلی کی ترقی پسند مصنفوں کی انجمن دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اور بفضلہ ہندوستان کی کسی ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے پیچھے نہیں ہے۔ ہمارے پہلے چار جلسوں کی روئداد اور مضامین شاہجہاں کے ترقی نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں جلسہ "سکیم گورکی" کی یاد میں منعقد ہوا تھا جسکی روئداد اور مضامین رسالہ ساقی دہلی بابت نومبر سنہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئے۔ اب تک ہمیں سخت تشویش تھی کہ ہمارا کوئی آرگن نہیں تھا۔ لیکن الحمدللہ کہ سال نو سے کارکنان "شاہجہاں" نے اس وسیع رسالہ کو ترقی پسند مصنفین کی تحریک کیلئے وقف کر کے اپنی اعلےٰ ادب نوازی کا ثبوت دیا۔ ہمیں بھروسہ ہے کہ ہم ان کے اس ایثار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے اور ترقی پسند ادب کے پاکیزہ نمونے پیش کر کے ملک میں صحیح ادبی ذوق کا پرچار کر سکیں گے۔

ذیل میں دہلی کی انجمن کے جلسوں کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

### کارروائی جلسہ منعقدہ ۲۶ ستمبر سنہ ۳۶ء

اس انجمن کا یہ جلسہ بتاریخ ۲۶ ستمبر بوقت ۷ بجے شام مسٹر صادق الخیری کے مکان (دفتر "عصمت") پر ھیتندر کمار صاحب کی صدارت میں ہوا تھا۔ حاضرین میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

پروفیسر مرزا محمود بیگ ایم اے۔ ممتاز حسین بی اے آنرز بی ٹی مسٹر رام سنگھ اڈیٹر "ہند نئی" ظفر قریشی بی اے۔ صادق الخیری بی اے سید انصار ناصری بی اے ایل ایل بی۔ مرزا فہیم بیگ چغتائی۔ رازق الخیری اڈیٹر عصمت۔ محمد مرزا آزاد اڈیٹر اقدام۔ شاہد احمد سکرٹری

سکرٹری نے گذشتہ جلسہ کی کارروائی سنائی۔ اس کے بعد مسٹر ممتاز حسین صاحب نے وکٹر ہیگو کے ناول منیمکہ کے ایک باب کا ترجمہ سنایا۔ اس کے بعد مرزا محمود بیگ صاحب نے "عدل عدالت میں" کے عنوان سے اپنا پر لطف مضمون سنایا اس میں انہوں نے دنیا میں خدا کے عدل و انصاف کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا

اس کے بعد مرزا فہیم بیگ صاحب نے ایک مختصر افسانہ "تبلیغ" سنایا جو خیال و بیاں دونوں حیثیتوں سے اعلےٰ درجہ کی چیز تسلیم کیا گیا۔ پھر محمد مرزا صاحب آزاد نے اپنی زیر تصنیف "فلسفۂ اخلاق" کے چند ابواب سنائے آخر میں ممتاز حسین صاحب نے ایک ایکٹ کا ڈرامہ سنایا جس کا عنوان تھا "ملا مردود ہی عدالت خداوندی میں" اس میں ایک کور باطن اور متعصب ملا کی ذہنیت پیش کی گئی تھی۔ ۹ ½ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

### کارروائی جلسہ منعقدہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء بیادگار منشی پریم چند مرحوم

یہ غیر معمولی جلسہ منشی پریم چند مرحوم کی تعزیت میں ۱۱ اکتوبر کو مسٹر انصار ناصری کے مکان پر پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن کی صدارت میں ہوا۔ حاضرین میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن۔
پنڈت گوپی ناتھ امن اڈیٹر تیج۔
حامد علی خان صاحب۔
سید محمد اویا صاحب۔
سید عبدالرحمٰن صاحب۔
سید ممتاز حسین بی اے آنرز بی ٹی۔
حسین حسان اڈیٹر پیام تعلیم۔
پروفیسر محمد عاقل ایم اے۔
پنڈت رام چندر شرما اڈیٹر "بھارتی"۔
سید محمود مورخ بی اے۔
صلاح الدین قریشی۔
سید انصار ناصری بی اے ایل ایل بی
شاہد احمد سکرٹری۔

سکرٹری نے گذشتہ جلسہ کی کارروائی سنائی اس کے بعد پنڈت رام چندر شرما نے منشی پریم چند کے متعلق نہایت موثر تقریر

کی اس کے بعد مسٹر محمود مورخ کا مضمون پڑھ کر سنایا گیا جس میں انہوں نے مرحوم کے سوانح حیات مختصراً بیان کئے تھے اور ان کی تصانیف پر مجملاً اظہار خیال کیا تھا۔ اس کے بعد پنڈت گوپی ناتھ امن نے پرزور تقریر کی ان کی تقریر کے بعد صادق الخیری صاحب نے اپنا مضمون سنایا جس میں انہوں نے پریم چند کو بحیثیت ایک مثالی ترقی پسند مصنفین کے پیش کیا تھا۔ آخر میں انصار ناصری نے تجویز پیش کی کہ مرحوم کے احترام میں حاضرین دس سیکنڈ تک خاموش کھڑے رہیں اس تجویز پر فوراً عمل کیا گیا۔ ۹ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

## کارروائی جلسہ منعقدہ ٢٢ اکتوبر ١٩٣٦ء

یہ جلسہ ٢٢ اکتوبر کو صادق الخیری صاحب کے مکان (دفتر عصمت) پر قاری عباس حسین صاحب کی صدارت میں ۶ بجے منعقد ہوا۔ حاضرین میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے

پروفیسر مرزا محمود بیگ ایم اے۔
پروفیسر محمد عاقل ایم اے۔
سید ممتاز حسن بی اے آنرز بی ٹی
ملک حبیب احمد بی اے۔
مسٹر رشبھ چرن جین
ظفر قریشی بی اے۔
رازق الخیری صاحب ایڈیٹر عصمت۔
پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن
پنڈت رام چند شرما ایڈیٹر مہارتی
سید انصار ناصری بی اے ایل ایل بی
صلاح الدین قریشی
محمد مرزا آزاد ایڈیٹر اقدام
شاہد احمد سکرٹری

سکرٹری نے گذشتہ جلسہ کی روداد سنائی اس کے بعد مسٹر ظفر قریشی دہلوی نے اپنا مضمون "داراشکوہ کا نظریۂ حیات" سنایا۔ اس مضمون پر پندرہ منٹ تک بحث مباحثہ ہوا۔ اس کے بعد مسٹر جاذب قریشی نے اپنی ایک ولولہ انگیز نظم سنائی۔ پھر مسٹر صلاح الدین نے مسٹر اختر حسین رائپوری کا مضمون "ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم" سنایا۔ اس مضمون میں کئی تجویزیں لائق غور تھیں۔ اس کے بعد مسٹر انصار ناصری نے اپنا ایک ایکٹ کا ڈرامہ "پرانا گیت" سنایا یہ ڈرامہ بہت پسند کیا گیا۔ پنڈت رام چند شرما اڈیٹر مہارتی نے "گھر کی باتیں" ایک مکالمہ سنایا جس میں نئی اور پرانی تہذیب کی آویزش دکھائی تھی۔ اسکے بعد مسٹر ممتاز حسین نے اپنا ڈرامہ "اپنا بچہ" سنایا جسکی بہت تعریف کی گئی اسکے بعد مسٹر انصار ناصری نے مارک ٹوین کے ایک ادب پارہ کا ترجمہ "دعائے جنگ" سنایا۔ پھر شاہد احمد نے گالزوردی کے ایک مضمون کا ترجمہ "چپ گھر" سنایا جس میں قید سکوت وقید تنہائی پر بحث کی گئی تھی۔ آخر میں مسٹر تابش دہلوی کی نظم "فقیر" پڑھکر سنائی گئی ۹ بجے جلسہ برخاست ہوا۔ آئندہ ہمارے جلسوں کی کارروائی شاہجہاں میں ماہ بماہ باقاعدہ اشاعت پذیر ہوتی رہے گی۔

**شاہد احمد سکرٹری**

بقیہ صفحہ ١٦

یہ سب سہاگر اپنے عزم سے نہ پھرے۔ اس کتاب میں صرف معلومات ہی نہیں فراہم کی گئی تھیں۔ بلکہ انسان کی روشنخیالی خیالات کی انقلاب انگیزی اور توہمات و تعصبات کی بیخ کنی کا سامان بھی جمع کیا گیا تھا۔ اس کے مولفین کی غایت نظریات نہیں تھی بلکہ عمل تھا۔ ادبی شان دکھانی مقصود تھی۔ بلکہ ان کا نشاء زندگی کی تعمیر تھی۔ یہ لوگ سچے مجاہد تھے۔ باوجود منع ہونیکے اس کتاب کا اثر صرف فرانس ہی تک نہیں رہا۔ بلکہ دور دور تک پہنچا۔ انیسویں صدی میں جو عقلیت کی ہوا ہندوستان میں چلی تھی۔ اس کا اگر آپ سراغ لگائیں گے تو اس کا سلسلہ بھی انہیں چند پاک نفوس تک پہنچے گا۔ اس کتاب کو اب کوئی نہیں پڑھتا۔ اور بہت ہی کم ایسے لوگ ہوں گے جنہیں اس کی کبھی زیارت نصیب ہوئی ہوگی۔ لیکن اس کا اثر اور فیض اب تک جاری ہے یہ صرف چند نفوس تھے۔ مگر دھن کے پکے اور عقیدہ کے سچے تھے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ ان کے کاموں کو دیکھیئے اور ان کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کیجئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ کامیاب نہ ہوں۔

نوٹ:۔ یقین ہے کہ ہمارے "ترقی پسند" احباب مولوی عبدالحق صاحب کے اس فاضلانہ خطبہ کو بنظر غائر پڑھیں گے۔ اور ان کی بصیرت افروز تجاویز کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں گے۔

# ترقی پسندوں سے دو دو باتیں

جناب مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد

ترقی پسند ادیبوں کا پہلا جلسہ ماہ اپریل ۳۶ء لکھنؤ میں ہوا تھا شعبۂ اردو کی صدارت کے لئے انہوں نے مجھے طلب کیا تھا۔ میں جانے کیلئے تیار تھا۔ لیکن میں وقت پر ایک ناگزیر وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ اس جلسہ کیلئے جو خطبہ میں نے لکھا تھا۔ وہ اب شائع کیا جاتا ہے۔

میرے نوجوان رفیقو اور دوستو!

آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ ایک بڈھا کہیں جا رہا تھا۔ چلتے چلتے راستے میں ٹھوکر لگی اور گر پڑا۔ اس وقت بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "ہائے رے جوانی" پھر جھٹ اٹھکر ادھر ادھر نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا "جوانی ہی میں کون سے تیر مارے تھے" جب میں ایسے قابل جوانوں کی جماعت اپنے سامنے دیکھتا ہوں جیسی کہ اسوقت میرے سامنے ہے تو مجھے وہ شریف بڈھا یاد آتا ہے۔ ایک دو بار نہیں بارہا میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ پہلے کے نوجوان (یعنی تیس چالیس برس پہلے کے) زیادہ قابل ہوتے تھے۔ میں نے اس کی ہمیشہ تردید کی۔ بات یہ ہے کہ انسان طبعاً گذشتہ سے بہت حسن ظن رکھتا ہے اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو تو بھول جاتا ہے اور خوبیاں یاد رہ جاتی ہیں مثلاً یہی وجہ ہے کہ سارے ہندوستان میں بچوں کا کوئی اچھا مدرسہ نہیں۔ بچپن میں جو ہمیں قدم قدم پر مشکلات پیش آئی تھیں بڑے ہوکر بھول گئے اور یاد رہا تو یہ کہ مکتب میں خوب پٹے تھے اور جب ہمیں پڑھانے کا موقع ملا تو ہم نے بھی خوب کان اینٹھے اور قمچیاں لگائیں۔ یہ کچھ انسان کی فطرت سی ہوگئی ہے کہ گذشتہ کو سراہتا اور حال کو سراہتا ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آجکل کے نوجوانوں میں جو عقل و شعور اور مستعدی ہے وہ میرے طالب علمی کے زمانے میں نہیں تھی۔ اسلئے مجھے آپ کی جوانی پر نہیں، آپ کی ذہانت، طباعی اور مستعدی پر رشک آتا ہے۔ میں جب کسی قابل نوجوان کو دیکھتا ہوں تو میرا جی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے یہ حسرت ہوتی ہے کہ کاش اس عمر میں اگر مجھ میں اتنی قابلیت ہوتی تو میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن گیا وقت اور خاص کر جوانی کبھی واپس نہیں آتی تو پھر میں نے گذشتہ کی تلافی نہیں بلکہ کفارہ کی یہ تدبیر سوچی کہ بدنصیبی سے جب میں خود کچھ نہیں کر سکا تو لاؤ جب نوجوانوں کی خدمت کیوں نہ کروں جو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ صاحبو! یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے ارشاد پر آپ کی خدمت میں اس طرح کھنچا چلا آیا جیسے حاتم طائی کے قصے میں بعض جانہار کوہ ندا کی صدا پر کھنچے چلے جاتے تھے۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی، جدت اور توانائی پائی جاتی ہے۔ اور تازگی اور جدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہو۔ جس پر ہمارا ایمان ہو اور جس کے حصول کیلئے ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہوں جب کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا تو جدت، تازگی اور توانائی بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان اکتا جاتا ہے۔ اور اس بیزاری کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ عیاشی اور طرح طرح کی لغویات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس وقت آثار حیات گھٹنے لگتے ہیں۔ قوٰی میں انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے۔ دل میں امنگ نہیں رہتی۔ دل و دماغ کے ابھارنے کیلئے طرح طرح کے محرکات استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخر اسی عالم میں جان ہی میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے پر صادق آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ روما کی عظیم الشان سلطنت کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہل روما جو کچھ کرنا تھا کر چکے اور ان کے پیش نظر کوئی خاص مقصد نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ لہو و لعب اور عیاشی میں مبتلا ہو گئے۔ اولوالعزمیاں جاتی رہیں۔ حوصلے پست ہو گئے۔ کاہلی میں جس کا دوسرا نام عیاشی ہے، مزہ آنے لگا۔ انحطاط نے استقبال کیا اور زوال نے انہیں لے جاکر دفن کر دیا۔

ہمارے اصول، عقائد اور خیالات کیسے ہی اعلےٰ کیوں نہ ہوں اور خواہ وہ ہمیں کیسے ہی عزیز کیوں نہ ہوں۔ اگر زمانے کے اقتضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی نہیں پیدا کی جائیگی تو ایک رکے ہوئے پانی کی طرح ان میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور ان میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہوجائیں گے جو ان کی ہلاکت کا باعث ہونگے۔ بندریا کو اپنے بچے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بچہ مرجاتا ہے تو بھی اسے جدا نہیں کرتی اور اپنے سینہ سے چپٹائے پھرتی ہے۔ آخر اس میں تعفن پیدا ہوجاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو گل سڑ کر گرنے لگتا ہے۔ یہی حال افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبے کا ہوتا ہے۔ جب لوگ اپنے مرغوب رسم و رواج اور توہمات کو سینے سے چپٹائے پھرتے ہیں تو وہ تو خیر زمانے کے دستور سے گل سڑ کے گر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی انہی کے ساتھ فنا ہوجاتے ہیں۔

ایک شخص کو تسخیر جن کا بہت شوق تھا اور اس کا عمل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک عامل ملا۔ بڑی خوشامد اور خدمت کے بعد یہ عمل سکھایا۔ سنا ہے کہ یہ عمل بہت سخت ہوتا ہے اور اکثر اس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس نے شوق کی دھن میں یہ سب تکلیفیں سہیں اور جن کو تسخیر کرکے رہا۔ جن دست بستہ حاضر ہوا اور کہنے لگا فرمائیے کیا ارشاد ہے۔ جو حکم ہوگا اسے بسر و چشم بجا لاؤنگا۔ عامل صاحب بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنی دانست میں بڑے بڑے مشکل کام اسے بتائے جن نے جھٹ پٹ کر دئے اور اور کام لینے کے لئے حاضر ہوگیا، کہتے ہیں کہ جن کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ ہر وقت اس کیلئے کچھ نہ کچھ کام ہونا چاہیئے۔ اگر کام نہ دیا جائے تو وہ ستانا شروع کر دیتا ہے اور شرارتیں کرنے لگتا ہے۔ عامل صاحب کچھ نہ کچھ کام دیتے رہے مگر اس جن کیلئے جو ہر وقت "ہل من مزید" کی صدا دیتا تھا۔ اتنے کام کہاں سے لاتے۔ اب جن نے انہیں ستانا شروع کیا اور وہ بہت پریشان ہوئے۔ آدمی تھے ذہین۔ انہیں ایک تدبیر بہت خوب سوجھی کہا کہ ہمارے صحن میں جو املی کا درخت ہے اس پر اترو اور چڑھو اور چڑھو اور اترو اور جب تک ہم حکم نہ دیں برابر اترتے چڑھتے رہو کچھ دن تو وہ اترتا چڑھتا رہا۔ لیکن کب تک آخر اس قدر عاجز اور تنگ ہوا کہ چیخ اٹھا اور عامل صاحب کی دہائی دینے لگا کہ خدا کیلئے مجھے اس عذاب سے بچائیے آپ جو کہیں گے وہی کروں گا۔ عامل صاحب نے حکم دیا کہ اچھا اب اترنا چڑھنا بند کردو۔ جب ہم کسی کام کا حکم دیں اسے کرو ورنہ چپ چاپ یہاں بیٹھے رہو۔ بیکار بیٹھے بیٹھے وہ اکتا جاتا تو شرارت کی سوجھتی، مگر معاً املی کے درخت کا خیال آتا تو وہیں دبک کر بیٹھ جاتا۔ اب بیکاری کی وجہ سے جن صاحب کا یہ حال تھا کہ کونے میں بیٹھے اونگھا کرتے اور منہ پر مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔

یہ قصہ جھوٹ سہی، لیکن نہایت سبق آموز ہے۔ اول یہ کہ کام کی یک رنگی اور یکسانی ایسی بد بلا ہے کہ جن جیسی ہستی جس میں توانائی اور تندی کوٹ کوٹ کے بھری وہ بھی اس سے عاجز آجاتی ہے، دوسرے بیکاری انسان کے قوےٰ کو مضمحل اور بیکار اور شوق اور امنگ کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں حیات کی دشمن ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ توانائی آدمی کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کا اقتضا ہے کہ کچھ نہ کچھ کیا جائے یہ انسان کی تمیز اور شعور پر ہے کہ کونسا ایسا کام کرے جو ممد حیات ہو اگر وہ املی کے پیڑ ہی پر اترتا چڑھتا رہا تو سمجھو کہ کھو یا گیا۔

ممد حیات وہ کام ہیں جن میں تازگی اور جدت ہوتی ہے اور جو اپنے اثر سے لوگوں کے خیالات اور عمل میں تازگی اور جدت پیدا کرتے اور نئی راہیں سجھاتے ہیں اور شوق کو مردہ نہیں ہونے دیتے۔ آپ نے ادب کو اپنا مقصد قرار دیا ہے یہ بھی ممد حیات کاموں میں سے ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ دلوں میں امنگ اور خیالات میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ زندگی کو زیادہ پر لطف اور زیادہ کارآمد بنا سکتے ہیں اور ملک و قوم کو ترقی کے راستے پر لگا دینے میں مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن ادب وہی کارآمد ہو سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے جو اپنے اثر سے حرکت پیدا کرنے کی قوت رکھتا ہے اور جس میں زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچنے اور ان میں اثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ ترقی پذیر ادب کی یہی تعریف ہو سکتی ہے

لیکن ترقی کا راستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہے یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر و استقلال اور بہت پتا مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آزادی نہ ہو۔ ترقی سرزمین آزادی ہی میں پھول پھل سکتی ہے۔ ادیب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے۔ ادیب کو حق حاصل ہے کہ اور اسے آزادی ہونی چاہیئے کہ جو چاہے لکھے۔ لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے "بھونڈے پن" کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ اگر اس سے بچنا ممکن ہے تو

وہ ادب قابل مبارکباد ہے ۔ ترقی پسند مصنفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیئے ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی ۔

آپ کو اپنے خیالات صرف تعلیم یافتہ طبقے تک محدود نہیں رکھنے چاہیں بلکہ اس کثیر طبقے تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے جو ان سب نعمتوں سے محروم ہے جو آپ کو حاصل ہیں ۔ تعلیم عام نہ ہونے سے اس میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی ۔ لیکن پھر بھی ان کا خیال مقدم ہے ۔ اس لئے کہ ان کے ذہن میں جو ابھی بہت سی آلائشوں سے پاک ہیں ان خیالات کا جانا آسان ہے ۔ بہ نسبت ان لوگوں کے جو کہلاتے تو تعلیم یافتہ ہیں مگر دل رنگ آلودہ ہیں ۔ اسپر آپ کو اپنی کانفرنس میں غور کرنا ہوگا ۔ یہ نہایت دشوار کام ہے اور اس کام کو انجام دینے والے بہت مشکل سے ملیں گے زندگی مسلسل ہے اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے ۔ اسلئے گذشتہ کا مطالعہ حال کے سمجھنے میں اور ماحول کا مشاہدہ حال کی اصلاح اور آئندہ کی تیاری میں مدد دے گا ۔ ممکن ہے کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سراسر تخریب اور استیصال کار آمد ہو ۔ یعنی جب تک ہر پرانی چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے نئی تحریک سرسبز نہیں ہوسکتی ۔ اس کی مثال عموماً یہ دی جاتی ہے کہ جب تک یہ بوسیدہ مکان بالکل نہ ڈھا دیا جائے نئی تعمیر نہیں بن سکتی ۔ یہ تشبیہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں ٹھیک ہو ۔ لیکن ادب کے معاملہ میں یہ کامل طور پر منطبق نہیں ہوسکتی ۔ ترقی کیلئے تخریب ضروری مگر لازم نہیں ۔ ادب میں بیشک آپ کو نئے اسلوب نئے خیالات پیدا کرنے ہونگے اور بہت سے پرانے مضر خیالات اور توہمات کی بیخ کنی کرنی ہوگی ۔ سوکھی شاخیں چھانٹنی ہونگی اور مرجھائی ہوئی ٹہنیوں کو پانی دے دیکر پھر ہرا کرنا ہوگا ۔ اور درخت کی جڑ میں کھاد اور پانی ڈال کر سرسبز کرنا ہوگا ۔ تاکہ نئی کونپلیں اور نئے پتے پھوٹیں ۔ لیکن اگر آپ درخت ہی کو جڑ سے کاٹ ڈالیں گے تو کام کا موقع کہاں رہے گا ۔ ہمیں پچھلوں کے کام اور ان کی محنتوں سے حسب ضرورت ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ایسے ادب کی بنیاد ڈالنی چاہیئے جو ہماری زندگی میں تازگی پیدا کرے اور ہماری جدید ضروریات کے مطابق ہو اور پھر آئندہ آنے والے اپنی نئی ضروریات اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم اور اصلاح کریں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے مجھے معاف فرمائیے گا ۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں ۔ جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا ۔ ممکن ہے وہ یہ جواب دیں کہ ہمارے خیالات اس قدر اعلیٰ ہیں کہ عام فہم سے بالا ہیں ۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا اور غالباً کوئی بھی تسلیم نہ کرے گا ۔ ہمیں اسپر غور کرنا چاہیئے کہ کیوں ایسا ہے ۔ یہ ایک عام اور معمولی بات ہے لیکن کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ہر پرانی چیز بری نہیں اور ہر نئی چیز اچھی نہیں ہوتی ۔ رجعت یا ترقی کوئی نئی چیز نہیں ۔ رجعت پسند اور ترقی پسند ہر زمانے میں ہوئے ہیں ۔ اب ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں ۔ کائنات کا ہر ذرہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیر کا عمل جاری ہے ۔ رجعت یا ترقی بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکتیں ۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت یا ترقی ہر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے ۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گذشتہ زمانے سے ہے سراسر رجعت سے آلودہ ہے ، صحیح نہیں ۔ محض ہم اس بنا پر کہ ہم لوگ آگے بڑھ گئے ہیں گذشتہ سے اپنا تعلق بالکل قطع نہیں کرنا چاہیئے ۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے ۔ ہم گذشتہ کے وارث ہیں ۔ اگر کوئی وارث اپنے ارث سے بے خبر ہے یا کما حقہ واقفیت نہیں رکھتا تو خواہ وہ کیسا ہی ذہین ، مستعد اور انقلاب پسند کیوں نہ ہو نہ کوئی اصلاح کر سکتا ہے ، نہ خود فائدہ حاصل کر سکتا ہے ، ورنہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے ۔ اسلئے ہر ترقی پسند ادیب کا فرض ہے کہ گذشتہ تاریخ اور گذشتہ ادب کا غور سے مطالعہ کرے اور دیکھے کہ ہمارے ادب میں کہاں تک آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے ۔ کن چیزوں کا ترک کرنا مناسب ہے اور کن ذرائع سے اسے بلند مقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ جو چیز آپ کو ارثاً ملی ہے ۔ اگر آپ اس کے حسن و قبح سے واقف نہیں تو اصلاح کس کی اور انقلاب کیا ؟ لیکن "میراث پدر خواہی علم پدر آموز" ہی کافی نہیں ۔ علم پسر آموز بھی لازم ہے ۔ ہم صرف حال کے ہی سامنے جواب دہ نہیں ۔ آئندہ کے بھی جواب دہ ہیں ۔ اسلئے زندگی کے جس شعبے میں بھی ہم ہاتھ ڈالیں ، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہمارے اعمال و افعال کا اثر آئندہ نسلوں پر کیا ہوگا ۔ کیونکہ آئندہ زمانہ میں ہمارے کاموں کی تنقیح و تنقید اسی اصول پر ہوگی ۔

دوسری چیز جو آپ کے قابل غور ہے یہ ہے کہ جس زبان میں آپ اپنے خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں اسپر پوری قدرت ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم اپنے گذشتہ ادب کو اس نظر سے مطالعہ کریں گے ۔ زبان کیا ہے ؟ خیال کے ادا کرنے کا آلہ ۔ اگر کسی کاریگر کا اوزار بھدا ہے تو اس کا کام بھی بھدا ہوگا ۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہماری زبان میں ہمارے خیالات سما نہیں سکتے ۔ کوئی زبان ایسی نہیں جس میں خیال ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو ، بشرطیکہ کسی میں ادا کرنے کی صلاحیت بھی ہو ۔ زبان بھی ارثاً ملی ہے ۔

اور جب تک ہم اسپر قدرت نہ حاصل کریں گے اپنے خیالات ادا کرنے پر قادر نہ ہونگے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس خیال کو ہم نے ادا کرنے کی کوشش کی ہے شاید وہ ہمارا نہیں۔ اصل نہیں نقل ہے شاید مستعار ہے۔ کہیں سے بہتا ہوا چلا آیا ہے۔ ہمارے دل پر اس کا گہرا نقش نہیں۔ اس نے ہمارے دل میں گھر نہیں کیا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ ادا نہ ہوتا۔ خیال اپنا ہو۔ یعنی جسے ہم نے خود سوچ کے پیدا کیا ہے یا کسی دوسرے کا۔ لیکن ہمارے دماغ میں اسقدر صاف اور روشن ہونا چاہیئے کہ جس وقت ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحہ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ لیکن جب ہمارے دماغ میں صاف اور روشن نہیں ہوتا تو بیان لامحالہ تاریک اور مبہم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر ادیب اپنی زبان کی صرف و نحو اور لغت سے واقف ہوتا ہے لیکن اس میں سب سے بڑی چیز لفظ کا صحیح استعمال ہے۔ اسے معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیئے۔ لکھنے والوں میں کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس گر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا۔ اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔

یہ دو چیزیں ہیں ایک ادب کا ظاہر یعنی زبان اور دوسرے ادب کا باطن یعنی خیال۔ اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انہی کے میل سے اسلوب بیان یعنی اسٹائل بنتا ہے۔ اسلئے ترقی پسند نوجوانوں کی خدمت میں میری یہ عرض ہے کہ وہ اپنے ادب اور زبان کا گہرا مطالعہ کریں ورنہ ان کی سادہ کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ اور ان کے خیالات کیسے ہی بلند اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں۔ پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔

ادب و زبان کے علاوہ جو ایک بات میں آپ کی خدمت میں عرض کرنی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کیلئے اخلاقی آزادی اور اخلاقی جرات سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت اور ہر دلعزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیئے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے۔ اور اگر ابتدا میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تو اس کے رفع کرنے میں بڑی مدت درکار ہوگی۔ بنیاد اگر بگڑ گئی تو عمارت کا خدا حافظ ہے۔ آپ کے ایک قابل رکن کا یہ کہنا کہ "ہم بعض حضرات کی رجعت پسندی سے ناواقف نہیں ہیں مگر ابھی ہم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ صرف اپنے بل پر کھڑے ہو سکیں۔ تنہا اپنے عقائد کی پاکی یا استقامت سے ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ اگر یہ بڑھکر سماج کے خیالات اور بنائے عمل نہیں بن سکتے تو اسی طرح بیکار رہیں گے جس طرح کوئی مذہبی عقیدہ" سراسر غلطی نہیں بلکہ گمراہ کن ہے۔ اگر آپ رجعت پسندی کے سہارے ترقی کی طرف جانا چاہتے ہیں تو شروع ہی میں سیدھے راستے سے بھٹک جائیں گے اور کبھی منزل مقصود تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔ حیرت ہے کہ آپ رجعت اور ترقی کو ایک ساتھ کیسے نبھا سکتے ہیں۔ شاید تیل اور پانی کا ایک جا ہونا ممکن ہے لیکن رجعت اور ترقی کا ایک جا ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ یہ کھلی مداہنت اور ریاکاری ہوگی اور یہی ایک چیز آپ کی ترقی پسندی کو بے وقعت کر دے گی۔ اگر آپ کو "اپنے عقائد کی پاکی اور استقامت" پر اطمینان نہیں تو بہتر ہے کہ آپ اس خیال کو ترک کر دیں۔ رجعت پسندی کے بل کھڑے ہونے سے بہتر ہے کہ آپ نہ کھڑے ہوں۔

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت!

سعدی اس خیال میں آپ سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ وہ تو ہمسایہ کی امداد سے بھی بہشت میں جانا پسند نہیں کرتا۔ اور آپ رجعت پسندوں کی مدد سے جنت ترقی میں جانا چاہتے ہیں۔ یہ خیالات نہایت پست اور کم ہمتی کے ہیں۔ آپ کو کوئی ضرورت تعداد بڑھانے اور شاخیں پھیلانے کی نہیں۔ اگر آپ کے ساتھ بارہ بلکہ بارہ بھی نہیں تین چار بھی ثابت قدم اور راسخ العقیدہ شخص ہیں تو ہندوستان بھر میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ ایک ایک آدمی نے دنیا کو ہلا دیا ہے اور آپ اتنی تعداد میں ہو کر رجعت پسندی کی آڑ لیتے پھرتے ہیں۔

آپ کا کام اسوقت وہی ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی میں انسائیکلو پیڈسٹ (ENCYCLOPAEDIST) نے فرانس میں کیا تھا۔ انہوں نے رجعت پسندوں کے ہاتھوں کیسی کیسی سختیاں جھیلیں، قید میں رہے۔ جلاوطن کئے گئے۔ کتاب چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ آخری پردوں میں تحریفیں کی گئیں اور اصل مسودے جلا دیئے گئے۔ (باقی بر صفحہ ۱۲)

# نئے ادب کی ضرورت

جناب سجاد ظہیر بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لار

معلوم نہیں کہ آپ کو ادب سے دلچسپی بھی ہے یا نہیں۔ مجھے تو بہت ہے۔ آپ اس لفظ کے معنی بھی سمجھے؟ یہ وہ "ادب" نہیں ہے جس کی ہمارے یہاں بہت کمی ہے، یعنی "بے ادبی" والا "ادب"۔ میری مراد اس ادب سے ہے جو کتابوں میں ہوتا ہے یا رسالوں یا میگزینوں میں یا کبھی کبھی اخباروں میں۔ میری مراد اس ادب سے ہے جس کو ہمارے ہندی داں بھائی ساہتیہ کہتے ہیں یا جسے انگریزی میں لٹریچر کہتے ہیں۔

آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہو لیکن ادب ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں ہزاروں برس سے موجود ہے۔ ادب اس وقت بھی تھا جب انسان بالکل وحشی تھے اور جنگلوں میں درندوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے یا جب آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے قبیلے شکار کھیل کر زندہ رہتے تھے۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس اس زمانہ کے ادب کے نمونے باقی نہیں رہے۔ لیکن اس بات میں کسے شک ہو سکتا ہے کہ وہ انسان جو اس تاریک زمانے میں قدرت کی اندھی طاقتوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے، وہ انسان جنہیں بھوک، موسم، جانور، دریا اور سمندر بیدردی کے ساتھ اپنے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے ان کے دلوں میں ڈر، استعجاب، خوشی اور بے بسی کے جذبات بار بار ابل نہ پڑتے ہوں گے مذہب کی ابتدا، موسیقی کی ابتدا، اور ادب کی ابتدا، ہمیں انہیں جذبات کے اظہار میں ملتے ہیں۔ جب انسانوں میں تہذیب اور تمدن کا آغاز ہوتا ہے اور وہ کھیتی کرنا سیکھتے ہیں اس وقت کا ادب اس وقت کی زبان کے نمونے ہمارے پاس آج بھی موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "ادب" اس کے پہلے بہت سی مشکل منزلیں طے کر چکا ہوگا۔ ہندوستان کا ہمیں سب سے پرانا ادب ویدوں میں ملتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا [illegible] ن ترانوں [illegible] کا مجموعہ ہے جو آرین نسل کے ہندوستانی گروہ والے لوگوں [illegible] دوں برسوں میں پیدا کیا۔ لیکن ان گیتوں کے پہلے کتنی [illegible] وہ زبان جس میں سب سے شروع کے وید کے حصے تصنیف ہوئے ہیں ان تصنیفوں کے پہلے سیکڑوں ہزاروں برس تک ارتقار کی منزلیں طے کرتی رہی ہوگی۔

آپ کہتے ہوں گے بھلا ان باتوں سے اور نئے ادب کی ضرورت سے کیا مطلب؟ شاید آپ ویدوں کی تاریخ سننے کے لئے تیار نہیں لیکن ڈرئیے مت۔ میں کوئی سنسکرت کا پنڈت نہیں۔ میں تو آپ سے صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا ہوں کہ ادب بہت دلچسپ چیز ہے۔ آپ نے چاہے آج تک کوئی ناول نہ پڑھا ہو۔ چاہے آپ کو شاعری سے بالکل نفرت ہو، چاہے آپ کو ہمارے رسالے اور میگزین یکسر ناپسند ہوں لیکن جناب آپ ادب سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ جس طرح عہد قدیم کے وحشی انسان اپنے جذبات کا بے ساختہ اظہار کر کے ادب کی بنیاد ڈالتے تھے اسی طرح آج کل کے زمانہ میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس کا کسی نہ کسی طرح سے ادب سے تعلق نہ ہو۔ اگر آپ ہندو ہیں تو کبھی کبھی آپ نے رامائن کے دوہے ضرور پڑھے ہوں گے جو لوگ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے انہوں نے یہ سنے ضرور ہوں گے۔ اگر آپ مسلمان ہیں تو قرآن شریف آپ نے ضرور پڑھا یا سنا ہوگا، میر انیس کے مرثیے، حالی کا مسدس، ڈاکٹر اقبال کی نظمیں کہیں نہ کہیں سنی ہی ہوں گی۔ اور آپ پھر چاہے جس مذہب کے ہوں ہمارا مشترکہ ترکہ ہندوستان کی گیتیں اور غزلیں، جو ہمارے دیہاتوں اور شہروں کی

گلیوں میں گائی جاتی ہیں، بھلا کون ایسا ہو گا جس نے ان سے لطف نہ اٹھایا ہو؟ ہمارے ملک میں جہاں تعلیم کی بہت کمی ہے، جہاں کہ صرف آٹھ فی صد باشندے پڑھنا لکھنا جانتے ہیں وہاں اس قسم کے ادب کی جو عوام الناس جنتا کی گیتوں، قصوں اور کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے میرے ایک دوست ہیں جو میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ آدمی تو بہت اچھے ہیں، ٹھوس بھروسے کے لائق، لیکن ان کے دماغ میں ذرا خشکی آگئی ہے۔ ان سے شعر مشکل سے موزوں پڑھا جاتا چاندنی رات ہو یا برسات کی شام اس شخص کے لئے سب یکساں ہے۔ ہم لوگ کالج میں ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ آج کل وہ منصف ہیں اور دو بچوں کے باپ۔ مجھ سے ان سے کئی برس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب میں انگلستان سے واپس آیا تو معلوم ہوا وہ لکھنؤ میں ہیں میں ان سے ملنے گیا۔ نوکر نے کہا "صاحب غسل خانہ میں ہیں" میں ڈرائنگ روم میں جا کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں برابر کے کمرے سے آواز آئی۔ کوئی گنگنا رہا تھا۔ آواز میرے دوست کی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ آواز میں تال اور سر کا کہیں پتہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ایک عجیب قسم کا اتار و چڑھاؤ اس گانے میں تھا۔ لیکن اس سے کیا گانے والا تو اسے گانا سمجھ رہا تھا! میں نے ذرا غور سے سنا تو مجھے معلوم ہوا جناب یہ شعر بار بار دہرا رہے تھے:۔

درد دل پیدا ہوا میرے لئے    میں ہوا پیدا برائے درد دل

میں سکتے میں رہ گیا۔ میرا دوست، میرا عزیز دوست اور "درد دل"! کیا دراصل الٹی گنگا بہنے لگی؟ یہ آخر ماجرا کیا ہے؟ خیر پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے خوب اچھی طرح سے ان کو دیکھا۔ بظاہر کوئی تبدیلی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ سوائے سن کے ترقی کے وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے چار پانچ برس پہلے ہوا کرتے تھے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا شاید یہ شخص عشق میں مبتلا ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے اس موثر طریقہ سے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر رہا ہے۔ لیکن ان سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو دو بچوں کے باپ ہیں، اور ان کی شادی ہوئے کوئی پانچ برس ہو گئے ایسے حالات میں عشق کا گمان تک بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر آخر کیا؟

"بھئی تمہیں شاعری سے کب سے دلچسپی ہو گئی ہے" میں نے آخر کار ان سے باتوں باتوں میں پوچھ ہی لیا۔ انہوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ میرا سوال سمجھے ہی نہیں۔ پھر بولے:۔ "شاعری؟ مجھ سے شاعری سے کیا مطلب؟"

میں نے جواب دیا "یہی جو آپ بار بار 'درد دل' کا رونا ابھی رو رہے تھے اس کی وجہ سے مجھے خیال ہوا"

لیکن میرے دوست نے کچھ ایسا منہ بنایا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ میں ان کو کسی پرانے بھولے ہوئے واقعہ کی یاد دلا رہا ہوں خیر اس وقت تو بات ٹل گئی لیکن بعد کو میں نے جو اس واقعہ پر غور کیا تو اس میں طرح طرح کی اور باتیں نکلیں ایک تو یہ کہ چاہے کیسا خشک سے خشک انسان ہو، اس کے گرد و پیش کی زبان، بول چال، شاعری، اور ادب کا اثر اس پر ضرور پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ صحیح ادبی مذاق انسان میں اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ اپنے ادب کی تاریخ سے واقف ہو، جب اس نے گزشتہ ادب کے بیش بہا خزانوں سے اچھی طرح فائدہ اٹھایا اور اسی کے ساتھ ساتھ جب زمانۂ حال کی زندگی اور اس کی گوناگوں کیفیتوں کو سمجھتا ہو، جب اسے اس بات کا احساس ہو کہ زندگی کو کبھی سکون نہیں جب وہ یہ سمجھتا ہو کہ "ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں" اور اس بات کو سمجھ کر اپنی زندگی کو اس راستہ پر لگائے جو ہمیں "ہمالیہ نما" بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔

میرے دوست بچارے ان باتوں سے بے بہرہ تھے۔ ایک پوچ اور لچر شعر کہیں سے ان کے کان میں پڑ گیا تھا۔ بلا ارادہ وہ انہیں یاد ہو گیا۔ بلا ارادہ وہ دہرانے لگے۔ اور یہ انہیں پر کیا

منحصر ہے۔ ہمارے یہاں آج کل اکثر پڑھے لکھے لوگ یہی کرتے ہیں۔ اپنے گزشتہ ادب سے واقفیت حاصل کرکے اور موجودہ زندگی کو سمجھنے کے بعد کون ایسا ہے جو اس قسم کے شعر لکھے گا اور سنے گا؟ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کن صاحب کا شعر ہے۔ امید ہے کہ وہ مجھے معاف کریں گے لیکن میرا اعتراض تو کہیں وسیع تر ہے۔ میں نے تو آپ کے سامنے موجودہ ادب کا دکھڑا رونا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے یہاں کے ادب میں جو سب سے بری چیز ہے وہ اس کی اصلی حالتوں کا اظہار کرتے ہوئے گھبراتے ہیں یا اگر ذکر بھی کرتے ہیں تو اسے ایک نہایت مہمل اور بازاری قسم کی "رومانیت" میں رنگ دیتے ہیں۔ "مزدور" کا اگر کبھی ذکر کریں گے تو اس میں وہ تمام اچھائیاں کھانے کی کوشش کریں گے جو ایک خدا رسیدہ بزرگ یا مہاتما میں ہوتی ہیں "کسان" کا تذکرہ ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانیت میں ڈوبا ہوا آدمی ہے جو دنیا میں بھلائی کا سبق دینے کے لئے پیدا ہوا ہے اور پھر ایک بات اور میری سمجھ میں نہیں آتی جس کو دیکھو وہ پریم و محبت ہی پر اپنی تان توڑتا ہے۔ میں نے تو آجکل کے رسالوں، ناولوں، قصوں، کہانیوں، میں ہر صفحہ پر عشق ہی کا چرچہ پایا۔ مرد عورت کا عشق تو خیر ہے ہی۔ اب ہندو مسلمان ایک دوسرے سے محبت کریں۔ مزدور اور سرمایہ دار پریم کے راگ الاپیں برہمن اور ہریجن گلے مل کر روئیں، غرض کسی نہ کسی طرح سے ہمارے ادیب یہ سہل نسخہ ہمارے سماج کے ہر دکھ درد کا علاج تجویز کر ہی دیتے ہیں۔ گویا ادب نہ ہوا اسٹیگل اور آما کا گانا ٹھہرا۔ جدھر دیکھئے پریم کی ایک چھوٹی سی ناؤ بہتی ہوئی چلی جا رہی ہے جس طرح رس گلے سے شیرہ ٹپکتا ہے اسی طرح سے ہمارے بہت سے ادیبوں کے قلم سے اس قسم کے مضامین! مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ کہیں اس چپ چپے شیرہ کے سمندر میں ڈوب نہ جائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے عشق یا محبت سے چڑ ہے، کسی انسان کو خصوصاً نوجوان کو ان لفظوں سے بھلا نفرت ہو سکتی ہے، لیکن ان جذبات کا بکثرت

استعمال موقع بے موقع نہ صرف ہماری جذباتی کمزوری کی دلیل ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے سماج اور اپنے ذاتی معاملوں میں سمجھ اور عقل سے کام لیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ٹھنڈے دل سے کسی معاملہ پر غور کرنا اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچنا تہذیب کی نشانی ہے۔ آخر ہم عقل سے کیوں ڈرتے ہیں؟ میں یہ مانتا ہوں کہ آرٹ اور سائنس میں فرق ہے۔ ایک سائنس داں گانے کی حقیقت آپ کو یوں بتائے گا کہ یہ آواز کی لہروں کے ایک خاص تناسب کا نام ہے۔ ایک شاعر آپ سے ان کیفیتوں، احساسات، جذبات کا ذکر کرکے آپ کو گانے کی حقیقت سمجھائے گا جو کسی خاص وقت میں آپ پر گانا سننے سے طاری ہوتی ہیں۔ دونوں ضروری حقیقتیں ہیں، دونوں کا سمجھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ تو پہلی بات ہم کو اپنے ادیبوں اپنے لیکھکوں سے یہ کہنا چاہئے کہ آپ مہربانی کرکے سچ بولئے۔ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ آپ سائنس داں ہو کر شاعری کرنا، قصے، کہانیاں، اور ناول لکھنا چھوڑ دیجئے، ہم آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ اپنے آرٹ کو، اپنے فن کو ایسا بنائیے جس میں رنگ و بو، لوچ اور تازگی، لطافت اور شیرینی سب کچھ ہو لیکن ان تمام چیزوں کی نیو محض جھوٹی اور ہوائی باتوں پر نہ ہو۔ وہ ادب جس کی ابتدا مغلیہ سلطنت کے زوال کے زمانے میں ہوئی تھی، ہمیں مردہ، اور بیمار، اور مفلوج معلوم ہوتا ہے۔ جو ادیب اور لیکھک، بڑے بڑے امیروں کی درباداری کرکے اپنی روزی کماتے ہوں ان بدنصیبوں سے ہم سوائے اس کے اور کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ ادب کی مناسب نشو و نما کے لئے یہ ضروری ہے کہ ادیب کسی خاص طبقہ کا غلام ہو۔ ہمارے جو بڑے شاعر ہوئے ہیں انہیں خود اس بات کا احساس تھا۔ چنانچہ میر تقی میر اردو کے سب سے بڑے شاعر، نے سخت غریبی کی زندگی صرف اس وجہ سے بسر کی کہ وہ امیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اپنی ذلت سمجھتے تھے۔ انشا بیچارے پاگل ہو گئے، اور غالب کی

خودداری کو مالی مشکلوں کی وجہ سے بڑے دھکے لگے۔ ہر شخص کی ذہنیت پر اس سماج اور اس طبقہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس زوال کے زمانہ کا ادب اتنا مایوس کن اسی وجہ سے ہے کہ ہندوستان اس وقت بڑی مشکل میں تھا۔ ہمارے حکمران نواب اور بادشاہ اور راجہ تاریخی حیثیت سے مرچکے تھے۔ ان کے درباروں کی فضا کا نقشہ اس زمانہ کی بہترین شاعری میں ملتا ہے، اور وہ مردنی جو سارے سماج پر چھائی جارہی تھی اس کا پتہ بھی ہمیں وہیں مل جاتا ہے۔

"شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا"

کی بے تحاشا مغمومی اسی عہد میں پیدا ہوسکتی تھی۔

ہر زمانے میں، ہر عہد میں ہر سماج میں مختلف طاقتیں کام کرتی رہتی ہیں۔ ایک تو وہ طاقتیں جو اسے پستی، رجعت پسندی، فرسودہ خیالی کی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ طاقتیں جو چاہتی ہیں کہ ہم لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنی موجودہ حالت پر قایم رہیں!۔ دوسری وہ طاقتیں ہیں جو ہمیں ترقی، بہتری، اور خوشحالی کی طرف لے جاتی ہیں، ایک ادیب اس وقت اچھا ادیب کہا جانے کا مستحق ہے جب وہ اپنے عہد کے اعلیٰ ترین رجحانات، اپنے زمانے کی بلند ترین امیدوں، اپنے سماج کے عظیم ترین منصوبوں کی تصویر ہمارے سامنے اس طرح کھینچے کہ ہم میں خود اس بات کی خواہش ہونے لگے کہ ہم اس جدوجہد کو سمجھیں جو سماج میں جاری ہے اور اسکے سمجھنے کے بعد ہم خود ایک بہتر دنیا، ایک نئے سنسار کے بنانے میں مدد دیں۔

میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ادب کا کام پروپگینڈا کرنا نہیں یہ وہ لوگ ہیں جو "خالص ادب" یا "آرٹ صرف آرٹ کی غرض سے" کے نظریہ کے قائل ہیں۔ میں ان لوگوں کے جواب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمام دنیا کے ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہترین ادب وہی ہے جس میں کسی خاص خیال، کسی خاص اصول کسی خاص اخلاق، کیلئے پروپگینڈا کیا گیا ہو۔ ہومر، ورجل، دانتے، گوئٹے کالی داس، تلسی داس، فردوسی، سعدی، رومی، یونان کے سارے ڈرامہ نویس، آج کل کے بڑے بڑے ادیب میکسیم گورکی، رومال رولاں، برنارڈ شا، اور ہمارے اردو کے ادیب مولانا حالی، اکبر، اقبال، جوش ملیح آبادی ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو ہمیں ایک خاص سبق دینے کیلئے نہ لکھتے تھے یا نہ لکھتے ہوں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ بھونڈے پن سے پروپگنڈا کرنا ادب کو تباہ کرنا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ آج ہماری تحریروں میں اثر پیدا ہو تو ہمیں حقیقت نگاری، اور سہل زبان میں لکھنا سیکھنا پڑیگا۔

لیکن صرف یہی کافی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب عوام میں پھیلے، ان کے دکھ اور سکھ کا نقشہ کھینچے، اور بہادرانہ جدوجہد جو آج اس دیس کی جنتا اپنی حالت کو بہتر کرنے کیلئے کر رہی ہے اسے کامیاب بنانے میں مدد دے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب فرقہ بندی، پرانی باتوں کی پوجا، "مذہب زدگی"، کی بدبودار نالیوں سے نکلکر گنگا کی سی فراوانی حاصل کرے، اور اصلی معنوں میں ملک کا قومی ادب بنجائے۔ کسی نے کہا ہے کہ "ادیب روحانی عمارتوں کے انجینئر ہوتے ہیں"، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روح کی عمارتوں میں تنگ و تاریک کوٹھریاں نہ ہوں، اگر ہم ایک ایسا گھر بنانا چاہتے ہوں جس میں تازہ ہوا کا گزر ہو اور روشنی کا بھی تو ہمارے ادیبوں کیلئے لازمی ہے کہ وہ ملک کی ترقی پسند تحریکوں میں حصہ لیں، کیونکہ سچائی اور خلوص اس وقت تک ہماری تحریر میں نہیں آسکتا جب تک ہم اس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر نہ ڈالیں۔

زندگی کا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ ہم جبتک کنارے ہو کر اسکا دور سے تماشہ دیکھتے رہیں گے، ہم پر موت کی سی اداسی چھائی رہیگی، ہمارے ادب میں اسوقت جان پڑسکتی ہے، جب ہم ہمت کرکے اس سمندر میں کود پڑیں موجوں، اور تھپیڑوں کے طوفان کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کریں، اور اب اس کی بہت ضرورت ہے۔

(سجاد ظہیر۔ بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا)

# پرستش اور مزدور

سامنے سیتلا کے مندر میں — چند مزدور ہیں غریق نیاز
جھک رہے ہیں قدم پہ دیوی کے — دہر کے شیر سینہ و سرباز
صبح کی دلنشیں ملاحت میں — سنکھ اور گھنٹوں کی ہے آواز
دھوپ ہے یوں کلس پہ جلوہ فروز — ضبط الفت سے جیسے سوز و گداز
گرد میں اَٹے ہوئے چہرے — مشکلوں میں شباب کا آغاز
زرد پیشانیوں پہ قشقۂ سرخ — انکھڑیوں میں خشوع کے دریاز
خشک ہونٹوں کے بھیگے بھیگے خط — سرد پلکوں کی پنکھیاں ناساز
ضعف دل سے بڑھی ہوئی دھڑکن — اشتہا سے گھٹی ہوئی آواز
سوز غم سے تپی ہوئی سانسیں — آنسوؤں سے بجھے ہوئے انداز

۲

ایک جس کو روا ہے سجدۂ شوق — ایک شایاں ہے جس کو عجز و نیاز
تو اگر واقعی ہے تو یہ بتا — کیوں ہیں یہ حادثات روح گداز
ہوں پرستار تیرے آشفتہ — اور غیروں پہ تیری بارش ناز
بھوک سے جاں بلب رہیں مزدور — اور تو منعموں میں جلوہ طراز

کارساز جہاں ہے تو لیکن
یہ کرم کا ہے کون سا انداز؟؟

احسان بن دانش

خودداری کو مالی مشکلوں کی وجہ سے بڑے دھبّے لگے۔ ہر شخص کی ذہنیت پر اس سماج اور اس طبقہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس زوال کے زمانہ کا ادب اتنا مایوس کن اسی وجہ سے ہے کہ ہندوستان اس وقت بڑی مشکل میں تھا۔ ہمارے حکمران نواب اور بادشاہ اور راجہ تاریخی حیثیت سے مر چکے تھے۔ ان کے درباروں کی فضا کا نقشہ اس زمانہ کی بہترین شاعری میں ملتا ہے۔ اور وہ مردنی جو سارے سماج پر چھائی جا رہی تھی اس کا پتہ بھی ہمیں وہیں مل جاتا ہے۔

"شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا"

کی بے پناہ مغمومی اسی عہد میں پیدا ہو سکتی تھی۔

ہر زمانے میں، ہر عہد میں ہر سماج میں مختلف طاقتیں کام کرتی رہتی ہیں۔ ایک تو وہ طاقتیں جو اسے پستی، رجعت پسندی، فرسودہ خیالی کی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ طاقتیں جو چاہتی ہیں کہ ہم لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنی موجودہ حالت پر قایم رہیں۔ دوسری وہ طاقتیں ہیں جو ہمیں ترقی، بہتری، اور خوشحالی کی طرف لے جاتی ہیں، ایک ادیب اس وقت اچھا ادیب کہا جانے کا مستحق ہے جب وہ اپنے عہد کے اعلیٰ ترین رجحانات، اپنے زمانے کی بلند ترین امیدوں، اپنے سماج کے عظیم ترین منصوبوں کی تصویر ہمارے سامنے اس طرح کھینچے کہ ہم میں خود اس بات کی خواہش ہونے لگے کہ ہم اس جد و جہد کو سمجھیں جو سماج میں جاری ہے اور اسکے سمجھنے کے بعد ہم خود ایک بہتر دنیا، ایک نئے سنسار کے بنانے میں مدد دیں۔

میں جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ادب کا کام پروپگینڈا کرنا نہیں یہ وہ لوگ ہیں جو "خالص ادب" یا "آرٹ صرف آرٹ کی غرض سے"، کے نظریہ کے قائل ہیں۔ میں ان لوگوں کے جواب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمام دنیا کے ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہترین ادب وہی ہے جس میں کسی خاص خیال، کسی خاص اصول کسی خاص اخلاق کیلئے پروپگینڈا کیا گیا ہو۔ ہومر، درجل، دانتے، گوئٹے کالی داس، تلسی داس، فردوسی، سعدی، رومی، یونان کے سارے ڈرامہ نویس، آج کل کے بڑے بڑے ادیب میکسم گورکی، رومال رولاں، برنارڈ شا، اور ہمارے اردو کے ادیب مولانا حالی، اکبر، اقبال، جوش ملیح آبادی ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو ہمیں ایک خاص سبق دینے کیلئے نہ لکھتے تھے یا نہ لکھتے ہوں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ بھونڈے پن سے پروپگنڈا کرنا ادب کو تباہ کرتا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ آج ہماری تحریروں میں اثر پیدا ہو تو ہمیں حقیقت نگاری، اور سہل زبان میں لکھنا سیکھنا پڑیگا۔

لیکن صرف یہی کافی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب عوام میں پھیلے، ان کے دکھ اور سکھ کا نقشہ کھینچے، اور بہادرانہ جد و جہد جو آج اس دیس کی جنتا اپنی حالت کو بہتر کرنے کیلئے کر رہی ہے اسے کامیاب بنانے میں مدد دے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب فرقہ بندی، پرانی باتوں کی پوجا، "مذہب زدگی"، کی بدبودار نالیوں سے نکلکر گنگا کی سی فراوانی حاصل کرے، اور اصلی معنوں میں ملک کا قومی ادب بنجائے۔ کسی نے کہا ہے کہ "ادیب روحانی عمارتوں کے انجینئر ہوتے ہیں"، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روح کی عمارتوں میں تنگ و تاریک کوٹھریاں نہ ہوں، اگر ہم ایک ایسا گھر بنانا چاہتے ہوں جس میں تازہ ہوا کا گزر ہو اور روشنی کا بھی تو ہمارے ادیبوں کیلئے لازمی ہے کہ وہ ملک کی ترقی پسند تحریکوں میں حصہ لیں، کیونکہ سچائی اور خلوص اس وقت تک ہماری تحریر میں نہیں آسکتا جب تک ہم اس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر نہ ڈالیں۔

زندگی کا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ ہم جبتک کنارے ہوکر اسکا دور سے تماشہ دیکھتے رہیں گے، ہم پر موت کی سی اداسی چھائی رہیگی، ہمارے ادب میں اسوقت جان پڑ سکتی ہے، جب ہم ہمت کرکے اس سمندر میں کود پڑیں موجوں، اور تھپیڑوں کے طوفان کا دلیری کے ساتھ مقابلہ کریں، اور اب اس کی بہت ضرورت ہے۔

(سجاد ظہیر بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا)

# پرستش اور مزدور

سامنے سیتلا کے مندر میں / چند مزدور ہیں غریق نیاز
جھک رہے ہیں قدم پہ دیوی کے / دہر کے شیر سینہ و سرباز
صبح کی دلنشیں ملاحت میں / سنکھ اور گھنٹوں کی ہے آواز
دھوپ ہے یوں کلس پہ جلوہ فروز / ضبط الفت سے جیسے سوز و گداز
گرد رہ میں اَٹے ہوئے چہرے / مشکلوں میں شباب کا آغاز
زرد پیشانیوں پہ قشقۂ سرخ / انکھڑیوں میں خشوع کے درباز
خشک ہونٹوں کے بھیگے بھیگے خط / سرد پلکوں کی پنکھیاں ناساز
ضعف دل سے بڑھی ہوئی دھڑکن / اشتہا سے گھٹی ہوئی آواز
سوز غم سے تپی ہوئی سانسیں / آنسوؤں سے بجھے ہوئے انداز

۲

ایک جس کو روا ہے سجدۂ شوق / ایک شایاں ہے جس کو عجز و نیاز
تو اگر واقعی ہے تو یہ بتا / کیوں ہیں یہ حادثات روح گداز
ہوں پرستار تیرے آشفتہ / اور غیروں پہ تیری بارش ناز
بھوک سے جاں بلب رہیں مزدور / اور تو منعموں میں جلوہ طراز

کارساز جہاں ہے تو لیکن
یہ کرم کا ہے کون سا انداز؟؟

احسان بن دانش

# ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم

(از جناب اختر حسین رائے پوری)

جب ہم کسی چیز کے متعلق لفظ "ترقی" کا استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس چیز میں بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت ہے دوسرے یہ کہ وہ اپنی ابتدائی شکل پر قائم نہیں ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ مزید یہ۔ ترقی ایک نسبتی شے ہے جو اپنی ضد بھی رکھتی ہے۔ یہ ضد رجعت ہے۔ جو چیز آگے نہیں بڑھتی وہ پیچھے ہٹتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ادب کے بعض بنیادی مسائل کے متعلق ہم سب متفق ہیں۔ غالباً ہم سب مانتے ہیں کہ ادب ایک سماجی فریضہ ہے اور یہ کہ ادیب اپنے ماحول سے کچھ لیتا ہے اور اس قرض کو اپنی شخصیت کے سود کے ساتھ واپس کرتا ہے۔ یعنی ادب کی تخلیق میں دو طاقتیں کام کرتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ماحول اور شخصیت۔ ماحول کا تجزیہ نسبتاً آسان ہے۔ اس کے عناصر خارجی ہیں اور سماجی انسان پر اس کا ردعمل جانچا جا سکتا ہے۔ لیکن شخصیت ایک لاینحل گتھی ہے ابھی ہمارے علم میں اتنی گہرائی نہیں آئی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں۔ اس کی سرحد مافوق الشعور سے جا ملتی ہے اور کوئی معاشی تجزیہ اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا اس کے یہ معنی نہیں کہ شخصیت ماحول کے اثر سے سرتاسر آزاد ہے۔

ادب کو کسی ضابطہ میں لانے کے معنی یہ ہیں کہ ماحول کے متعلق ایک صاف و صریح تخیل آپ کے دماغ میں ہو اور پھر یہ کہ آپ کو اپنی شخصیت پر قابو ہو۔ جب تک یہ نہ ہوگا آپ ایسا ادب پیدا نہیں کر سکتے جس کا کوئی مقصد ہو۔

میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ادب کا کوئی مقصد ہونا چاہئے یا نہیں۔ میں نے اپنا بیان اس مفروضہ کے ساتھ شروع کیا ہے کہ ہم سب ادب کو ایک سماجی فریضہ مانتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہر فرض کسی نیت سے شروع ہوتا ہے اور کسی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارا فلسفہ زندگی ترقی پسند ہو اور کیونکہ اس کے حصول کا ذریعہ ہمارے پاس ادب ہے اس لئے ہم اپنے ادب کو ترقی پسند بنائیں۔

سماج ایک بڑا درخت ہے جس کی کئی ٹہنیوں میں سے ایک ادب ہے۔ ہم یہ سب مانتے اور جانتے ہیں لیکن اس ٹہنی کی نشو و نما کا رمز سمجھنے کے لئے آپ کو اس درخت کی جڑ اور تنے کا جائزہ لینا ہے سورج کی تپش اور بادلوں کے پانی کو دیکھنا ہے۔ جب تک پورے درخت کی اٹھان پر آپ کی نظر نہ ہو۔ آپ اس ٹہنی کو کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ لہذا اب میں سماج کے درخت پر ایک سرسری سی نظر ڈالتا ہوں اور یہ جتائے دیتا ہوں کہ ہمارے موضوع سے اس کا تعلق براہ راست ہے۔

سماج کی بناوٹ میں دو چیزیں کام کرتی ہیں۔۔۔ مادی ضروریات اور اخلاقی مطالبات۔ فرد کی یہ تمنا کہ وہ زندہ رہے اور یہ خواہش کہ وہ خوش رہے۔۔۔۔۔ ہر تہذیب اور نظام کا مقصد اور معیار ہے۔ جب ہم کسی تہذیب کو بہتر اور برتر بتلاتے ہیں تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں فرد کی ذہنی اور جسمانی آسائش کا سامان زیادہ تھا اور حفظ حیات کے مواقع بھی زیادہ تھے۔

دنیا میں تغیر کے سوا کوئی چیز غیر فانی نہیں۔ ہر ادارہ فنا

ہوتا ہے اور اپنا قایم مقام چھوڑ جاتا ہے۔ اور کیونکہ انسان مسلسل اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ اس کی زندگی زیادہ محفوظ اور بہتر ہو اسلئے ارتقار کا جو قدم اٹھتا ہے وہ آگے کی طرف اٹھتا ہے۔

آج ہمارا دور تاریخ کے دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔ آج تک ہماری دنیا میں آرام و آسائش کے لوازمات کی ایسی فراوانی نہ تھی۔ انسان نے قدرت کو اس حد تک زیر کر لیا ہے کہ وہ اب اپنی حیوانی ضروریات کو بڑی آسانی سے پورا کر سکتا ہے اور زندگی کا بڑا حصہ اپنی انفرادیت کی تکمیل پر لگا سکتا ہے۔

لیکن ہم کیا دیکھتے ہیں کہ سماج میں تعمیر اور تخریب کی طاقتوں میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ایک طبقہ یہ چاہتا ہے کہ بنی نوع انسان ہمیشہ کے لئے مادی اور ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ لیکن دوسرا طبقہ ایسا نہیں ہونے دیتا۔ دراصل یہ غلاموں اور غلام فروشوں کی جنگ ہے۔

ہم سب ایسی ہی دنیا میں رہتے ہیں۔ اس صورت حال میں ترقی کی راہ کدہر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ غلاموں کی آزادی کی طرف یا غلام فروشوں کی ہوسناکی کی طرف؟ ہم جس طبقہ کے افراد ہیں وہ خود سرمایہ داری کا بھیڑوا ہے۔ کیونکہ ہم عوام سے بیگانہ ہیں اسلئے نہ ادیب مظلومیت کی فریاد کو سمجھ سکتا ہے اور نہ مظلوموں کو اپنا پیغام سنا سکتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی سرمایہ داروں کی بساط کے مہرے ہیں۔ اپنی روٹیوں کے لئے ہم ان کے محتاج ہیں اور وہی راگ گاتے ہیں جو یہ سننا چاہتے ہیں۔

یہیں ہماری شخصیت کا امتحان ہوتا ہے۔ ہمارا سماجی فرض تو یہ ہے کہ اس ماحول کو بدلیں اور نظام زندگی کی باگ ڈور ایسے طبقہ کے ہاتھ میں دیں جو سماج کو ترقی کی طرف لیجائیگا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انسانیت کی خانہ جنگی کو بند کر دیگا اور انسان کو انسان کا نہیں بلکہ انسانیت کا خادم بنا دیگا۔ مگر یہاں ہماری شخصیت سد راہ بن جاتی ہے۔ وہ اس ماحول کی گود میں پلی ہے جہاں ادب روپیوں کے لئے عشوہ فروشی کرتا رہا ہے۔ ہماری شخصیت نے ایثار کا سبق نہیں پڑھا وہ ضبط نفس سے بیگانہ ہے وہ خودی کی کینچلی میں دبی ہوئی ہے۔ اس پر تن آسانی نے چربی کی تہیں چڑھا دی ہیں۔

آج سچے ادب کی تخلیق صرف اسی وقت ممکن ہے جب شخصیت ماحول کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر حق کے اذن پر لبیک کہے۔ ماحول کو بدلنے کے پہلے ہمیں اپنے کو بدلنا ہوگا لیکن ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں اس میں حقیقت نہیں ہوتی وہ کذب و افترا کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور اگر ہماری طبیعت حق کی طرف جاتی ہے تو ماحول سے مانوس نہ ہو کر نامراد رہ جاتی ہے۔

میری دانست میں ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہماری شخصیت فوٹوگرافر بھی ہو اور مصور بھی ہو۔ فوٹو اسوقت اترتا ہے جب انسان بے حرکت ہو جائے۔ لیکن حقیقی زندگی میں موت سے پہلے کوئی چیز بے حرکت نہیں ہوتی۔ اسلئے آرٹ فوٹوگرافی نہیں بلکہ مصوری ہے جس میں خط کی ایک کشش ہیجان اور حرکت کے دفتر لکھ دیتی ہے۔ ترقی پسند ادیب صرف حقیقت پسند نہ ہوگا بلکہ اس کے سامنے حقیقت کا ایک صاف تخیل ہوگا اور وہ ہر تصویر ایسی نقطہ نظر سے بنائیگا۔ یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنے سماجی فرض کو نہ سمجھیں۔ اور یہ فرض وہ ہے جو میں اوپر بتلا چکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی دور حاضر کی سماجی جنگ میں اس طبقہ کی تائید کرنا جو ظالموں اور غاصبوں کے ہاتھ سے عنان حکومت چھین کر بنی نوع انسان کی آزادی کے علم برداروں کو دے رہا ہے۔

حضرات ادب اپنا سماجی فرض اس وقت تک ادا نہیں کر سکتے جبتک اس طبقہ کا ہمنوا اور ہم کوش نہ ہو جائے۔

(۲)

۱۸۵۷ء کا غدر تاریخ ہند کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ یہ گرگھے اور مشین، ہل اور ٹریکٹر، اندھی کے دیئے اور بجلی کے لیمپ کی ٹکر تھی۔ مختصراً یہ سامنتی نظام زندگی اور صنعتی نظام زندگی یعنی مشرق و مغرب کی ٹکر تھی۔ سرمایہ داری نے جو اس زمانہ میں ایک ترقی پسند طاقت تھی، ہمارے دقیانوسی اداروں کو بے نشان کر دیا۔ یہ ادارے منو بھگوان کے زمانہ سے ایک نیک پر ایک رفتار سے چل رہے تھے غدر کے بعد ہر چیز بدلی اور ہمارے ادب میں بھی نئے نئے رجحان پیدا ہونے لگے۔

ہمارا ادبی انقلاب لبرلزم ( ) کے ساتھ شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے یورپ کی ذہنی فضا پر لبرلزم چھایا ہوا تھا۔ جب ہم نے انگریزی پڑھنی شروع کی تو ہم بھی لبرلزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارے ادب میں رواداری خود تنقیدی اور جمہوریت کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اردو ادب میں حالی اور بنگلہ میں مدھوسودن دت اس رجحان کے پہلے علم بردار تھے۔ زبان کو بے تکلف اور عام فہم بنانے کی تحریک نے بھی زور پکڑا۔ چنانچہ موجودہ ہندی کو جسے بھاکھا کے مقابلہ میں کھڑی بولی کہتے ہیں۔ اسی زمانہ میں فروغ ہوا۔ اردو میں بھی طلسم ہوش ربا کا پیرایہ ناپسندیدہ سمجھا جانے لگا۔ اردو زبان میں عقلیت اور رواداری کی جو تحریک سرسید اور حالی نے شروع کی تھی اس کا ردِ عمل شبلی نے شروع کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہنی جمود اور رجعت پروری کی بہت بڑی ذمہ داری مولوی شبلی پر عائد ہوتی ہے۔

مگر یہ لبرلزم زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے ملک میں اس ذہنی رجحان کی کوئی مادی بنیاد نہ تھی۔ یورپ میں یہ جذبہ مادی سیر چشمی سے پیدا ہوا تھا لیکن ہم نے اسے شکست کی کیفیت میں اپنایا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ادب نے ایک نیا روپ لیا۔ یہ قوم پرستی کا روپ تھا۔ اس کی ابتدا اس خوف سے ہوئی کہ اگر ہم زیادہ آگے بڑھے تو مغربیت کے منہ میں جا گریں گے اور اپنی روایتوں کو بھول جائیں گے۔ لہٰذا ہمیں اپنے ماضی کی طرف لوٹنا چاہیئے اور اپنے اجداد کی راہ اختیار کرنا چاہیئے۔

زندگی بہتے ہوئے پانی کی لہر کی طرح آگے بڑھتی جاتی ہے۔ وہ پیچھے کی موجوں سے قوت حاصل کرتی ہے لیکن بڑھتی آگے ہی ہے۔ ادب میں قوم پرستی کا رجحان ابوالہول کی طرح مختلف شکلوں میں ہویدا ہوتا ہے۔ وہ قدیم کی تائید میں ہر جدید چیز کو حقارت سے دیکھتا ہے اور وطنی نسلی و مذہبی تفرقوں کی گود میں پروان چڑھتا ہے اکبرالہ آبادی کی تنگ بندی اسی حقارت کا مرقع ہے۔

قوم پروروں کی سیاسی تحریک کی وجہ سے ادب کے اس اسکول کی ایک بڑی شاخ استعمار کی مخالف ہو جاتی ہے اس کے قائدوں میں ہم پریم چند مرحوم کو پیش کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ملک کی آزادی کا سوال ہے ہم اس اسکول کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن ان پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ سماج کی تنظیم کا انکے پاس کوئی دستور نہیں ہے۔ قوم پرستی خود پرستی کا پھیلاؤ ہے اور بس۔ انسانیت کے آگے جنگ افلاس بیکاری اور استحصال کے جو بنیادی مسائل ہیں۔ قوم پرستی کے پاس ان کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم پروروں کی سیاسی تحریک ناکام رہی۔ وہ نفی کیساتھ شروع ہوئی ہے اور وہ زندگی کی کثرت کو مٹائے بغیر اجتماعیت پر زور دیتی ہے۔ یہ اجتماعیت اس کے پیروں کی زنجیر ہے اور اسے خودکشی کی طرف لے جا رہی ہے۔

اب میں آپ کو اس نئے پیغام کی طرف متوجہ کرتا ہوں جو صورِ اسرافیل بن کر انسانیت کو سرمایہ داری کی قبر سے نکلنے کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ امن و آشتی کا پیام ہے، یہ

مساوات اور اخوت کا سندیسہ ہے۔

دونوں فریق تاریخ کے میدان میں جمع ہونے لگے ہیں۔ ایک طرف وہ طاقتیں ہیں جو اخلاق اور تہذیب کے تمام اقدار کی منکر ہیں اور جو نیست و بربریت کو انسان کے سر پر مسلط رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ عام بالا میں انسانوں کی بربریت کا اقرار کر لیں تو کر لیں اس دنیا میں وہ ظالم و مظلوم کی تمیز کو باقی رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ترقی اس وقت تک محال ہے جب تک انسانوں کی اکثریت مٹھی بھر کچھ مستوں کی غلامی نہ کرے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جو دنیا سے ہر قسم کی بے انصافی کو مٹانا چاہتی ہیں۔ جو نئے اخلاق کی بنا ڈال رہی ہیں جو زندگی کی دوئی کو مٹا کر وحدت کے پرچار کا مدعی ہے۔

اگر ہم ترقی پسند ہیں اور ہمارا ادب اپنے فرض کا پابند ہے تو ہمیں اس جنگ میں عملی حصہ لینا ہے۔ ہماری دعائیں یا بد دعائیں کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتیں۔ اس انجمن کا کام یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا کہ ہم کبھی کبھار مل بیٹھیں اور بحث مباحثہ کے بعد اپنے اپنے گھر کی راہ لیں اور کانوں میں تیل ڈال کر سو جائیں۔ اس طرح شخصیت کی اصلاح تو ممکن ہے لیکن اپنے ماحول کو ہم زیادہ موثر نہیں کر سکتے۔ سماجی جنگ میں ہمارے طبقہ کی حیثیت اس طائفہ کی ہے جو دور بیٹھا طبل جنگ بجایا کرتا ہے۔ لڑنے والے دوسرے ہیں ہم سب بینڈ بجانے والوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے آپ کو ان سپاہیوں کے لئے بھی کچھ کرنا ہے۔ کچھ ان کی سننا ہے کچھ اپنی سنانا ہے۔

اس صحبت میں میں کچھ عملی تجاویز آپ کے سامنے لایا ہوں یہ آپ کے غور و فکر کی مستحق ضرور ہیں۔

(۱) انجمن کے ارکان ٹولی بنا کر سال میں ایک دو مرتبہ کسانوں یا مزدوروں کے ساتھ جا کر رہیں۔ تاکہ عوام کی زندگی سے ان کا براہ راست تعلق پیدا ہو سکے۔

(۲) اس ادبی انجمن کا دائرہ زیادہ وسیع کیا جائے اور اس میں دوسرے معاشی مسائل پر بھی بحث ہو سکے۔

(۳) ہماری انجمن کے ان ارکان کی ایک سب کمیٹی بنائی جائے جو اخبار نویس ہیں تاکہ ترقی پسندوں کے خلاف رجعت پروروں کے پروپگنڈہ کا باقاعدہ تدارک کیا جا سکے۔

(۴) ہندوستانی زبانوں میں جو انتخابی ادب ( ) موجود ہے اس کے نمونے کتابی صورت میں شایع کرنے کا انتظام کیا جائے۔

(۵) ہندی اور اردو کے رجعت پرورانہ قضیہ کی روک تھام کے لئے ہم ایک سب کمیٹی بنائیں جو دقیق عربی یا سنسکرت الفاظ کے ہم معنی عام فہم الفاظ کی ایک لغت تیار کرے۔ اس لغت میں عامیانہ الفاظ کو خاص جگہ دی جائے تاکہ ہماری زبان صحیح معنی میں عوام کی زبان بن سکے۔

(۶) ترقی پسند ادب کی نشر و اشاعت کے لئے رومن رسم الخط میں ایک بلیٹن شائع کرنے کا انتظام کیا جائے۔

(۷) ترقی پسند مصنفین پریس کی آزادی کے لئے خاص طور پر جد و جہد کریں اور سول لبرٹیز یونین کی ہر ممکن امداد کریں۔

(۸) طلبار کی ادبی انجمنوں کو ہماری انجمن سے ملحق کرنے کی خاص طور پر کوشش کی جائے۔

حضرات یہ مقالہ بہت عجلت میں لکھا گیا ہے اور تشنہ ہے۔ اس میں جو بد عنوانیاں رہ گئی ہیں ان کے لئے میرے عزیز دوست شاہد صاحب ذمہ دار ہیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ آپ میرے مافی الضمیر کو قابل التفات سمجھیں گے۔

**اختر رائے پوری**

(ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی میں پڑھا گیا)

# چُپ گھر

(از جناب شاہد احمد صاحب بی۔ اے آنرز دہلوی ایڈیٹر ساقی دہلی)

اونچی تاریک دیوار کے احاطے میں سکوت ہے۔

آسمان کے ایک ٹکڑے کے نیچے جسے اونچی اونچی عمارتوں نے قطع کیا ہے، فطرت کا کوئی منظر نظر نہیں آتا۔ صرف قیدی نظر آتے ہیں یا ان قیدیوں کے محافظ اور ایک بلی جو قیدخانے کے چوہے کھاتی ہے۔

اس مکمل سکوت کے گھر میں مکمل انتظام ہے۔ گویا خدا کی اسپر خاص نگرانی رہی ہے۔ کوڑا کرکٹ نام کو نہیں۔ نہ گربڑ ہے نہ سُستی اور نہ قہقہے۔ بالکل ایسا ہے جیسے کسی انجن میں خوب تیل دیدیا گیا ہو "کیوں" کا تو خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس احاطے میں جو انسانی چیز متحرک نظر آتی ہے دنوں اور برسوں اسی طرح متحرک رہتی ہے جس طرح اسے ایک دفعہ متحرک کر دیا گیا ہے۔ سورج طلوع ہوتا ہے اور سورج غروب ہوتا ہے۔ یہ ایک روایت ہے چُپ گھر میں۔

زرد رنگ کے کپڑے پہنے جن پر نمبر کے نشان بنے ہیں یہاں کے باشندے کام میں لگے رہتے ہیں۔ داخلہ کے وقت ان میں سے ہر ایک ناپا گیا تھا۔ تولا گیا تھا اور اُسے خوب بجا کر دیکھا گیا تھا۔ اسکے نمبر کے سامنے یہ تمام باتیں درج کر دی گئی تھیں اور ان ہی کے مطابق اُسے اس کا خاموش کام بتا دیا گیا تھا اور اتنی غذا مقرر کر دی گئی تھی کہ اس کے سہارے اپنا کام ٹھیک ٹھیک کر سکے۔ روزانہ وہ اپنے خاموش کام میں لگ جاتا ہے اور اگر اسکا کام جم کر بیٹھے رہنے کا ہو تو وہ ایک گھنٹے تک صحن کی بجری پر ایک کوٹھری سے دوسری کوٹھری تک ٹہلتا رہتا ہے۔ روزانہ صبح کو اور اتوار کے دن دو دفعہ وہ خاموشی کے ساتھ قیدیوں کے گرجہ میں جاتا ہے اور اس آواز میں جو گھٹے گھٹے مسدود [illegible] ہے وہ قیدیوں کے خاموش خدا کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ یہ ہے اسکی آواز کا اصراف۔ پھر اس کے ترسے ہوئے کانوں میں پادری کی آواز پڑتی ہے۔ یہاں وہ صف در صف بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہے اور پادری کی آواز اس کے لئے فردوس گوش ہوتی ہے۔ مگر پادری کے الفاظ اس کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتے کیونکہ پادری کی نغز گفتاری نے اس کی حس سامعہ کو سُلا دیا ہے۔

چُپ گھر میں داخل کئے جانے سے پہلے اُسے اپنے تنہائی کے مہینے گزارنے پڑے تھے اور اب ایک چھوٹے سے سیاہ فرش کی کوٹھری میں جسکا میل کچیل خود اس نے صاف کیا تھا چوبیس۲۴ میں سے چودہ۱۴ گھنٹے تنہا گزارنے پڑتے تھے۔ سوائے اتواروں کے کہ اس دن اکیس۲۱ گھنٹے گزارنے پڑتے تھے کیونکہ یہ خدا کا متبرک دن ہے۔ یہ سب گھنٹے اسے ٹہل ٹہل کر کاٹنے پڑتے ہیں۔ یا آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتا ہے۔ یا کوئی آواز سُننے کیلئے دروازے میں جو دیکھنے کا سوراخ ہے اُس سے آنکھ لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے مگر یہ سوراخ ایسا ہے کہ اس میں سے باہر سے اندر تو دیکھ سکتے ہیں مگر اندر سے باہر نہیں دیکھ سکتے۔ نہ کوئی آواز ہے، نہ خوشبو نہ بدبو۔ کوئی جاندار پاس نہیں، مکڑی تک بھی نہیں۔ اس کے اور خدا کے درمیان صرف ستم ظریفی حائل ہے۔ اس کے ٹہلنے میں، آواز پر کان لگانے میں، فرش پر مُنہ اوندھا کر پڑ جانے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ یہانتک کہ تاریکی پھیلنی شروع ہوتی ہے تاکہ وہ اس کی طرف گھورتا رہے اور اس سے نیند کی بھیک مانگے جو قیدیوں کی تنہا مونس و غمگسار ہے اور انہیں اپنی آغوش میں لیتی ہے۔ اور اسی طرح دنوں سے مہینے اور مہینوں سے برس بیت جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ عرصہ

پورا ہو جائے جو اس کے نام کے سامنے درج کر دیا گیا ہے۔ نام بھی وہ جو کبھی اس کا تھا۔

چُپ گھر کے کارخانوں میں سوائے کام کرنے کی آوازکے اور کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ زرد وردیاں پہنے جن پر تیر کی شکل بنی ہوئی ہے یہاں کے لوگ خوفناک انہماک سے کام کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھیں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ انکے ہونٹ بھی ہلتے ہیں مگر ان میں سے آواز پیدا نہیں ہوتی۔ اور ان ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نظر نہیں آتی۔۔۔ ایسا مکمل نظام ہے یہاں کا۔

اور ان کے چہروں پر صرف ایک جذبہ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں" ہم کسی چیز کی پروا نہیں کرتے کسی چیز کی۔ ہم کسی چیز کی آرزو نہیں رکھتے کسی چیز کی۔ ہم بھیانک خاموشی کے خوف سے اس طرح کام کرتے ہیں"۔ ان کی خاموشی دیکھنے جو کوئی آتا ہے اُس پر ان کی تیز بے نور نظریں جم کر رہ جاتی ہیں۔ اور ان سب کی آنکھیں عجیب، متنفر، اور خائف ہوتے ہوئے بھی اپنی گہرائیوں میں کچھ گستاخی و بے باکی لئے ہوتی ہیں، گویا انہیں اپنے دیکھنے والے میں وہ دُنیا نظر آتی ہے جس میں سے انہیں نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ وہ کروڑوں انسان نظر آتے ہیں جو آزاد ہیں۔ کروڑوں جو سارے سارے دن تنہا نہیں رہتے جو ہر روز تنہا نہیں رہتے۔ وہ کروڑوں انسان جو بول سکتے ہیں۔ اپنے تماشائی میں انہیں وہ سوسائٹی نظر آتی ہے جس نے انہیں پالا پوسا، پروان چڑھایا اور ان کے جسم یا ذہن کو مجبور کر کے ان کے قدموں کو اس طرف اٹھوا دیا جہاں پہونچکر انہیں مجبوراً ارتکاب جرم کرنا پڑا اور اس کا صلہ انہیں اس برسوں کے سکوت کی صورت میں مل گیا۔ گویا اس تماشائی کے چلنے کی آواز اور چپکے چپکے سوالات کرنے میں انہیں عدلِ انسانی کا یہ فیصلہ سنائی دے رہا ہے:-

"تم خوفناک تھے! تمہاری روحیں سُکڑی ہوئی تھیں، انہیں زندگی نے توڑ مروڑ کر تم سے جُرم کرائے۔ اسلئے ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے تمہیں بند کر کے تالے جڑ دیئے۔ یہاں تم کام کرو گے۔۔۔ دیکھتے ہوئے، سنتے ہوئے، کچھ نہ محسوس کرتے ہوئے۔ بغیر کسی ذمہ داری کے، بغیر کسی ہدایت کے، اپنے ہمجنسوں سے الگ تھلگ۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے کہ تم صاف ستھرے رہو اور تمہیں اتنا کھانا ملتا رہے کہ تم زندہ رہ سکو۔ ہم تمہارا معائنہ کرتے رہیں گے اور تمہارے جسم کو تولتے رہیں گے۔ دن اور رات کے کپڑے تمہیں اتنے دینگے کہ تمہاری ستر پوشی ہوتی رہے۔ عبادت کیلئے تمہارا انتظام کر دیا جائیگا جو کام تمہیں دیا جائیگا وہ اتنا ہی ہوگا جتنی تم میں طاقت ہوگی تمہیں جسمانی سزا بہت کم دی جائیگی۔ اس خیال سے کہ تم ہمیں تکلیف نہ دو اور ایک دوسرے کے لئے عذاب نہ بن جاؤ تمہیں خاموش رہنا پڑیگا۔ اور جہاں تک ممکن ہو تنہا بھی۔ تم نے سوسائٹی کا گناہ کیا۔ تمہاری نیتیں خراب ہو گئی تھیں۔ بہتر ہوگا کہ ہمارے اس طرزِ عمل سے تمہاری نیتیں ہی مٹ جائیں۔ کسی وجہ سے، جو ہم نہیں بتا سکتے تمہارے پاس سماجی عقل حیوانی شروع ہی سے کم تھی اور وہ کم بھی جلد فنا ہو گئی۔ اسلئے تکلیف وہ تخیلات اور ابدی خاموشی سے، اپنی کوٹھریوں کی تنہائی کے خوف سے، اور اس یقین کی وجہ سے کہ تم ختم ہو لئے۔ تمہاری ذات سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، کسی انسان یا کسی چیز کو تم سے فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ تم جب یہاں سے نکلو گے تو سماجی عقل حیوانی سے بالکل پاک ہو کر نکلو گے۔ ہم نرم دل اور سائنٹفک لوگ ہیں۔ پُرانے طرز کے قانون کے جاہلانہ نظریوں سے ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہم اپنی حفاظت اور تمہاری بھلائی کے لئے یہ تدبیریں کرتے ہیں۔ ہم اصلاح کے قائل ہیں۔ ہم اذیت پہونچانا نہیں چاہتے۔ تنہائی اور خاموشی سے ہم تمہاری نیتوں کو غارت کر دیں گے اور تمہارے جسموں میں جن کا ہم اسقدر خیال رکھتے ہیں نئی نئی نیتیں پیدا کر دیں گے۔ خاموشی اور تنہائی میں کوئی حقیقی کرب و اذیت نہیں ہے۔ اسکا ہمیں یقین ہے کیونکہ ہم نے ایک دن بھی تنہائی اور خاموشی میں

نہیں گزارا۔ تنہا و خاموش ایک دن بھی ۔"!

یہ ہے وہ جوڑا دو رویوں والے قیدیوں کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سُن رہے ہیں۔ اور یہ ہے وہ جو اُن کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جواب میں کہہ رہے ہیں:۔۔

"حاکم صاحب! آپ مجھ سے فرماتے ہیں کہ میں نے جُرم کیا تھا کہ یہاں مجھے آنا پڑا ہے۔ میری تربیت کو آپ اسکا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ میں نے ایک اونچے گھرانے میں جنم لیا تھا۔ میرے والد پولیس کی نظروں میں کبھی نہیں رہے۔ ان کو مرگی کا مرض تھا اور اسی میں مرے۔ مجھے نہیں چاہیئے تھا کہ انہیں اپنا باپ بناتا۔ مجھے اپنے لئے ایسی ماں کا انتخاب بھی نہیں کرنا چاہیئے تھا جو تیز مزاج تھی۔ اسی کا تو یہ نتیجہ ہے سجنے! آپ کہتے ہیں کہ مجھے ایک ضدی اور نڈر بچہ بنا دیا۔ بس یہی تو ذرا سی وجہ تھی جس کی وجہ سے یہ ساری مصیبت نازل ہوئی۔ وہ بدمعاش جو میری محبوبہ کے پیچھے پڑ گیا تھا اُسے خوب معلوم تھا کہ میں کیا ہوں۔ چنانچہ جب میں اس کی مرمت کر چکا تو دو سال کو وہ بھی گیا میری اس حرکت نے آپ لوگوں کو میری اصلاح کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس اصلاح کو صحیح طور پر انجام دینے کیلئے مجھے سب سے پہلے چھ مہینے کی قید تنہائی کی سزا دی گئی۔ اس سارے چھ مہینے کے عرصے میں میں اپنے آپ سے برابر پوچھتا رہا کہ "جب چھ مہینے بعد میں یہاں سے باہر نکلونگا اور وہ بدمعاش پھر میری محبوبہ کے پیچھے پڑیگا تو میں کیا کروں گا؟" پھر خود ہی جواب بھی دیتا کہ "جیسے پہلے اُسے گھڑا تھا پھر گھڑوں گا۔" آپ کہتے ہیں کہ مجھے ایسے خیالات دل میں نہیں لانے چاہئیں۔ مگر حاکم صاحب میرے دل میں تو اور کوئی خیال ہے ہی نہیں جس پر غور کروں۔ صرف یہی ایک خیال تھا اور یہ کہ جب یہاں میں زندہ درگور رہوں تو باہر دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ اس تنہائی سے میرے لئے بہت سے مفید نتائج برآمد ہونے چاہئیں۔ جی ہاں یہ تو ہوا ہی ہے۔ میں وہ شخص ہی کہاں رہا جو پہلے تھا؟ ہاں تو جب میں باہر نکلا تو میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی۔ ایمانداری سے روزی کمانے میں میرا قیدی ہونا ہر جگہ حائل ہوتا تھا۔ مجھے کسی ایسے پیشے کی تلاش تھی جس میں لوگ مجھ پر اعتبار نہ کریں۔ کسی ایسی تجارت یا کاروبار کی تلاش تھی جس میں مجھے اپنے ہمجنسوں سے لین دین نہ کرنا پڑے۔ آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ مجھے صرف یہ کرنا چاہیئے تھا کہ اپنے ہمسایہ سے محبت کروں؟ مگر حاکم صاحب! جب میں قید کاٹ کر باہر نکلا تو اپنے ہمسائیوں سے محبت کرتے کرتے بالکل کھوکھلا ہو گیا۔ اور حاکم صاحب! جب کوئی کھوکھلا ہو جاتا ہے تو پھر وہ شراب کو منہ لگاتا ہے۔ پیٹ میں ایک عجیب طرح کی کپکپی محسوس ہوتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ معدہ گرمی چاہتا ہے۔ ذرا سی آگ مانگتا ہے۔۔۔ چنانچہ جب آپ کے پاس تھوڑے سے پیسے ہو جاتے ہیں تو آپ انہیں گرمی میں بدل دیتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ مگر خوش نصیب حاکم صاحب! شراب ایک ایسے شخص کے جسم میں دل ڈال دیتی ہے جس کی روزی کا دار و مدار اپنے ہمسایہ سے محبت کرنے پر ہو۔۔۔۔۔۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد میری قسمت میں نو مہینے کی اور سزا لکھی تھی۔ یہ بھی تنہائی کی سزا تھی کہ اس سے میری اصلاح ہو جائے۔ میرا دل تڑپتا تھا کچھ کام کرنے کے لئے۔ تعطل سے میری روح سڑ رہی تھی۔ سارے دن میری حالت ویسی ہوتی تھی جیسے کسی چوہے دان میں کوئی چوہا پھنس جائے۔ اس قید تنہائی کے بعد مجھے بالکل بدلا ہوا ہونا چاہیئے تھا۔ اور ہوا بھی یہی۔ میری بالکل قلب ماہیت ہو جانی چاہئے تھی کیونکہ مجھے سزا مل چکی تھی اور مجھے خدا کی محبت سکھائی گئی تھی۔ مگر حاکم صاحب! جب میں غور کرتا ہوں کہ آخر میں نے ایسا کیا کیا جو میری بجائے اگر کوئی اور شخص انہی حالات میں ہوتا تو نہ کرتا، تو میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ یہ قید کاٹ کر جب میں نکلا تو میں نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ میں کوئی غلطی نہ کروں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر آپ مجھ سے

پوچھیں کہ باہر جو لوگ رہتے ہیں ان کے متعلق میں کیا رائے رکھتا ہوں تو میں آپ کو جواب نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے بولنے کی اجازت نہیں ہے.....''

یہ ہے جواب جو ان کے بُشرے سے ظاہر ہوتا ہے! انکے ہونٹ ہلتے ہیں مگر آواز سُنائی نہیں دیتی۔

پہرہ داران ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتا ہے' اس کی آنکھیں جنگلی جانوروں کے نگہبان کی آنکھیں کہہ رہی ہیں'' چلئے جناب آگے چلئے۔ برائے مہربانی قیدیوں کو شہ نہ دیجئے۔ جو کچھہ آپ کو دیکھنا تھا آپ دیکھہ چکے!''

اور یہ سنکر تماشائی قیدخانے کے صحن میں چلا جاتا ہے۔

بدرنگ پُرانی عمارت پر دوسری منزل بنائی جارہی ہے اس کی دیواریں آسمان سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ اور اونچی اونچی پاڑوں پر قیدی کھڑے پتھروں کو چونے سے جارہے ہیں۔ زمین سے سو فیٹ اونچی پاڑ پر قیدی بڑی تن دہی سے کام میں مصروف ہیں۔ اور خوب مضبوط چُنائی کر رہے ہیں تاکہ اس میں خود قید رہیں موٹی موٹی دیواروں کے رخنے خوب بھر رہے ہیں تاکہ خود ہی باہر کی کوئی آواز نہ سُن سکیں اور ان کی اپنی آہ وزاری انہی میں گھُٹ کر رہ جائے۔ پتھر کی رہ سے رہ ملا رہے ہیں اور درز بندی بڑی ہوشیاری سے کر رہے ہیں تاکہ کوئی کیڑا بھی اندر آ کر ان کی تنہائی میں شریک نہ ہو سکے۔ کھڑکیاں اتنی اونچی بنا رہے ہیں کہ ان تک وہ خود نہ پہونچ سکیں اور ان میں سے وہ کچھہ بھی نہ دیکھہ سکیں۔ ان لوگوں سے اپنے آپ کو چھپانے کے لئے چنائی کر رہے ہیں جنہوں نے انسانی عدل وانصاف کی نظر میں کوئی گناہ نہیں کیا۔ کیونکہ خاموشی اور تنہائی میں انہیں بھول جانا ہی انسان کے لئے بہتر ہے۔ ان کو یاد رکھنا ناگوار ہے۔ ان کے سروں پر جو آسمان ہے اسکا رنگ سیاہ ہو چلا ہے اور آسمان کے پس منظر پر یہ لوگ سیاہ مُورتیاں معلوم ہوتے ہیں۔ سوائے اوزاروں کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔

تماشائی قید خانے کے دروازے کی طرف جاتا ہے اور اس کی مڈبھیڑ تین قیدیوں سے ہوتی ہے جو اندر آرہے ہیں۔ بیچ میں سب سے اونچے قد کا ایک بوڑھا مرد ہے۔ یہ بڑھا پھُرتی سے قدم اٹھاتا ہے۔ اس کے چہرے پر سفید بال ہیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے اور نظریں تماشائی پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنے زرد زرد دانت نکوس کر مسکراتا ہے۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور ان میں سے کچھہ الفاظ نکلتے ہیں۔ جب آسمان سارے دن بادلوں سے گھرا رہتا ہے تو کبھی سورج ان میں سے نکلکر چمک اٹھتا ہے اور دُنیا کی خوبصورتی کا ثبوت مل جاتا ہے۔ یہ الفاظ۔ پاکیزہ کرنے والی تنہائی کے قیمتی گواہ، صرف یہی مدہم الفاظ چُپ گھر کی ہوا پر آہستہ آہستہ تیرتے ہیں ''ہتم۔!''

(گالزوردی)

مترجمہ

**شاہد احمد**

بی۔اے (آنرز) دہلوی

(ترقی پسند مصنفین کی انجمن۔ دہلی میں پڑھا گیا)

# گھر کی باتیں

(پنڈت رام چندر شرما ایڈیٹر "مہارتی"۔ دہلی)

"اماں! یہاں تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ چھٹیاں ختم ہونے میں ہی نہیں آتیں"

"بی بی! تم تو بڑی چنچل ہو گئی ہو۔ گھر سہاتا ہی نہیں"

"اماں! یہاں کچھ من لگانے کو ہے بھی تو نہیں"

"بی بی! بھیا تمہارے ساتھ کے لئے ترستا رہتا ہے۔ اس کے پران تم میں ہی اٹکے رہتے ہیں ایسا محبت کرنے والا بھائی تو دیکھا نہیں۔ تمہیں اسکا تو خیال کرنا چاہیئے"

"بھلا میں بھیا کے ساتھ میں سدا کیسے باتیں کر سکتی ہوں۔ مجھے کبھی اپنے دوستوں سے بھی تو ملنا چاہیئے۔ میں تو بھیا سے نہیں کہتی کہ وہ مجھ سے اتنا پیار کرے۔

"بیٹی! ایسے سنگدل نہیں بنا کرتے"

"بھائی جی بھی تو ایسا کہا کرتے ہیں"

"وہ برا کرتا ہے۔ لیکن وہ تو لڑکا ہے۔ تم لڑکی ہو"

"اماں! میں نے تو لڑکی بننے کیلئے نہیں کہا تھا"

"بھولی لڑکی! یہ بڑی بات ہے"

"سب لڑکیاں کہتی ہیں"

"وہ سب برا کرتی ہیں"

شام کے وقت بی بی اپنے دوستوں سے ملنے چلی گئی۔ اماں اس کے کمرے کے آگے سے نکلیں تو وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "بی بی گئی۔ بی بی گئی"۔۔ کمرہ خالی پڑا تھا۔ دراز منہ کھولے پڑے تھے اور کپڑے ان میں سے باہر بری طرح لٹک رہے تھے۔ ایک دراز تو کمرے کے بیچوں بیچ پیٹ کھولے پڑا تھا۔ سب چیزیں فرش پر بکھری پڑی تھیں۔ آئینے پر پاؤڈر اٹا پڑا تھا۔۔۔۔ مانو کمرے میں کوئی آندھی آئی ہو۔

اماں چونکیں۔۔۔ پاؤڈر!!

اماں تو بڑی صفائی پسند ہیں۔ انہیں دھکا سا لگا۔ خادمہ کو نہ بلا کر خود ہی کمرہ ٹھیک کرنے لگیں۔ بی بی کا ٹرنک بھی کھلا پڑا تھا۔ ایسا جان پڑتا تھا کہ کسی کتے نے اپنے پنجوں سے اسے کرید کرید کر سب سامان باہر اچھال پھینکا ہو۔ کوئی بھی چیز سب کچھ باہر نکالے بغیر رکھی نہیں جا سکتی تھی۔ اماں سنگوانے پر جٹ گئیں۔۔ نیچے دراز کے پیندے میں کئی چھوکروں کے فوٹو ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ان پر لکھا تھا "پریم کی بھینٹ" "ترستے نینوں سے" "پہلی ملاقات کی یاد میں" "پھر دیدار کی تمنا میں" وغیرہ وغیرہ اور نیچے دیئے ہوئے تھے بے تکے ادھورے نام۔ ایک پرزہ لکھا پڑا تھا۔ وہ بی بی کا خط تھا۔ پہلی نظر خواہ مخواہ ان کے سامنے آ گئی۔۔۔ "پیارے دلبر!۔۔" اس کے آگے بھلے مانسوں کی زبان نہیں تھی کسی کا خط نہ پڑھنا چاہیئے۔۔۔۔۔ اماں نے اسے ویسے ہی کئی لفافوں کے ساتھ ایک کونے میں بنا دیکھے رکھدیا۔۔۔۔۔ ٹرنک بند کر دیا۔ کمرہ جھاڑ دیا۔ اور چپ چاپ واپس چلی آئیں۔

علی الصبح نہا دھو کر اماں بی بی کیطرف چلیں۔ دھیرے سے کواڑ کھولے تو بی بی کی آنکھیں کھلی پائیں۔۔۔۔ "بیٹی!"

بیٹی نے نیند کا بہانہ کیا۔ اماں رات بھر اسی کی وجہ سے جاگی تھیں۔ انہوں نے اسے دیر میں آنے کیلئے اور ان خطوں یا تصویروں کی نسبت کچھ بھی نہیں کہا تھا۔۔۔ بی بی ان کے غصہ

سے ڈر کر نیند کا بہانہ نہیں کر رہی تھی، وہ سویرے سویرے اماں سے بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اماں کی چھاتی پر گھونسہ سا لگا۔ اتنی سنگدل بچی۔ انہوں نے پھر پکارا۔

"بی بی!!

بی بی نے آنکھیں کھولیں" اماں" کہا اور بس۔

اماں اس کے پلنگ پر بیٹھ گئیں اور باتیں کرنے لگیں...

...! بی بی۔ کل شام کے وقت جب تم چلی گئیں تھیں تو کمرہ اتنا گندہ پڑا تھا۔ صفائی تو ضروری چیز ہے"

"اماں! میں صفائی نہیں کر سکتی۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کوشش کرنی فضول ہے"

"میری بچی غور کرو۔ کتنی بڑی بات ہے۔ میں تو اتنی صفائی پسند ہوں۔ ہر شخص یہی امید رکھیگا کہ تم بھی میری جیسی ہی ہو"

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ کیوں.... مجھے نیند آرہی ہے۔ یہ باتیں بچپن ہی سکھانے کی تھیں۔ تم صفائی پسند ہو لیکن تم نے مجھے کبھی بھی صاف رہنا نہیں سکھایا۔ پہلے دائی کے ہاتھ میں۔ پھر اور پھر استانی جی کے۔ انہوں نے تو کبھی بھی کچھ کرنے کو نہیں کہا"

"بیٹی۔ کل شام کے وقت مجھ سے بنا کہے تمہیں اپنے دوستوں سے ملنے نہیں جانا چاہئے تھا"

"تمہیں معلوم تو تھا۔ میں خادمہ سے جو کہہ گئی تھی"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمہیں میری اجازت حاصل کرنی چاہئے تھی"

"اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ انہوں نے دوپہر کو مجھے ٹیلیفون کیا۔ میں تم سے کیسے پوچھ سکتی تھی"

"اسی وقت جب کہ ٹیلیفون پر تم نے دعوت قبول کی تھی۔ اسیوقت مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا"

"آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا تم مجھے منع کر دیتیں سچ مچ یہاں کتنا سونا سونا سا ہے"

"بیٹی: میں تم سے کچھ باتیں کرنے آئی ہوں۔ کل جب میں تمہارا کمرہ ٹھیک کر رہی تھی....!"

منی چونک کر اٹھ بیٹھی.. "کیا تم نے میرا کمرہ ٹھیک کیا تھا؟"

"ہاں! میں کمرہ ایسی گندی حالت میں دیکھ نہ سکی۔ جب میں تمہارا اٹرنک صاف کرنے لگی.. منی پلنگ سے اتر پڑی۔ اور چپل پہنتی ہوئی بولی۔ تو پھر؟؟"

"منی! کیا تم چھوکروں کو خط لکھا کرتی ہو؟"

"منی چیخ کر بولی" ہر ایک لڑکی لکھا کرتی ہے۔ یہ تو معمولی سی بات ہے"

"کیا وہ تمہارے دوست ہیں... تمہارے اپنے؟؟"

"وہ میری ان سہیلیوں کے بھائی ہیں۔ جن کے ہاں میں آیا جایا کرتی ہوں....."

"سب؟؟"

"ہاں لگ بھگ سب۔ وہ دو تین سے زیادہ نہیں ہیں۔ بچارے اکیلے ہیں۔ اس میں برائی ہی کیا ہے۔ کیوں اماں؟؟"

"بی بی میں نے تو نہیں کہا۔ کہ کوئی برائی ہے"

"لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم یہی کہنا چاہتی ہو....."

"ہاں، مجھے یہ بات بھاتی نہیں۔ مجھے یہ باتیں پسند نہیں بھلا وہ تمہیں اپنے فوٹو کیوں بھیجتے ہیں"

"تو اس میں برائی ہی کیا ہے"

"میری بچی! یہ باتیں میں پوچھ رہی ہوں۔ میں۔ تیری ماں" اماں کی آواز بھرا گئی۔

"تو اگر تم پوچھ رہی ہو" منی دھیرے دھیرے کھڑکی کی طرف بڑھی، اور وہاں جا کر رک گئی تب ایکدم پلٹ کر بولی۔

"اگر تم پوچھتی ہو تو۔ میرے وچار میں یہ مناسب نہیں ہے اور اگر تم اسے مناسب ہی سمجھتی ہو اور میرے خط وغیرہ پڑھتی رہتی ہو تو.....!"

"بیٹی میں نے نہیں پڑھے۔ میں نے تو صرف انہیں ایک نظر دیکھا ہے ...... لیکن میں انہیں پڑھنا ضرور چاہوں گی، کیوں میں پڑھ لوں، بی بی؟"

"وہ پرائیویٹ خطوط ہیں۔ تم کیسے امید کر سکتی ہو کہ میں وہ بھی خطوط تمہیں دکھاؤں گی"

اماں اٹھیں اور بی بی کے پاس جاکر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "بی بی سنو۔ مجھے وہ خط پڑھنے دو، اور پھر ہم دونوں ان پر غور کرینگے کہ ایسے لوگوں کو خط لکھنے مناسب ہیں یا نہیں۔ اور اگر تم وہ خطوط رکھنا نہیں چاہتیں، تو انہیں جلا دو، تاکہ یہ سب بھلا دیا جائے"

بی بی جھٹک کر بولی "نہیں میں نہیں دکھاؤنگی"

"تو وہ جلا دینے ہوں گے۔ بیٹی!!"

بی بی نے منہ چڑھا کر بڑے غصہ میں کہا۔ یہاں آگ بھی تو نہیں ہے"

"کھانے کے بعد نیچے لے آنا۔ تمہارے ابا تب تک جا چکینگے اور یہاں بھی نہیں ہوگا" اماں بی بی کے پاس گئیں اور اس کا ماتھا چوما۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، اور وہ کانپ رہی تھی۔

اماں چلنے لگیں تو اس نے دور ہی سے پوچھا۔

"اماں فوٹو بھی لانے ہوں گے کیا؟؟"

کھانا ختم ہوئے بہت وقت گذر گیا۔ تب خطوط کی پوٹلی ہاتھ میں لئے بی بی بڑی سنجیدگی کے ساتھ آئی اور سیدھی آگ کیطرف بڑھی، پھر ایک دم سے مڑی اور اماں سے تیزی سے بولی "شاید تم انہیں گننا چاہو گی؟"

اماں نے بڑے دلار سے کہا "بیٹی!" اور اس نے یاد

وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بی بی نے خطوط اور فوٹوؤں کی گرانبہا دولت اگنی کے بھینٹ کر دی۔ دبلی پتلی، زرد رو لڑکی کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی مدھ ماتی آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اپنی مٹھیاں بھینچ کر تیز آواز میں بولی۔

"بڑی بے عزتی کی بات ہے"۔ بے انصافی ہے..... ظلم ہے۔!!"

اماں بولیں "بی بی۔ میں نے تو تمہیں کچھ برا بھلا نہیں کہا۔ ہاں اگر تم نے وہ خط مجھے دکھائے ہوتے تو"

یہ سنتے ہی بی بی بولی "میں سترہ برس کی ہونے آئی۔ یہ تو سخت ظلم ہے"

اماں بی بی کے پاس جاکر پیار سے بولیں "بیٹی یہ خطوط رکھنے کے لائق نہیں تھے۔ وہ ضائع کر دئے گئے اور بھلا دئے گئے۔ گلے لگانے کے خیال سے ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"میری بچی!!"

بی بی اچھل کر پرے جا کھڑی ہوئی اور بولی "تم میرے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کرتی ہو۔؟"

"بی بی، میں تمہاری ماں ہو۔ تمہارا فرض ہے کہ"

"نہیں مجھے کوئی فرض ورض نہیں چاہیئے۔ مجھپر کیوں کوئی فرض لادا جائے۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ مجھے پیدا کرو۔ میں نے کبھی نہیں چاہا۔ نہیں نہیں۔ میں یہ ظلم کبھی نہیں بھولوں گی" اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ جھپٹ کر کمرے سے باہر چلی گئی

---

شاہد احمد-بی-اے آنرز دہلوی
سکریٹری ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی

شاہجہان

The Calcutta Art Press, Delhi
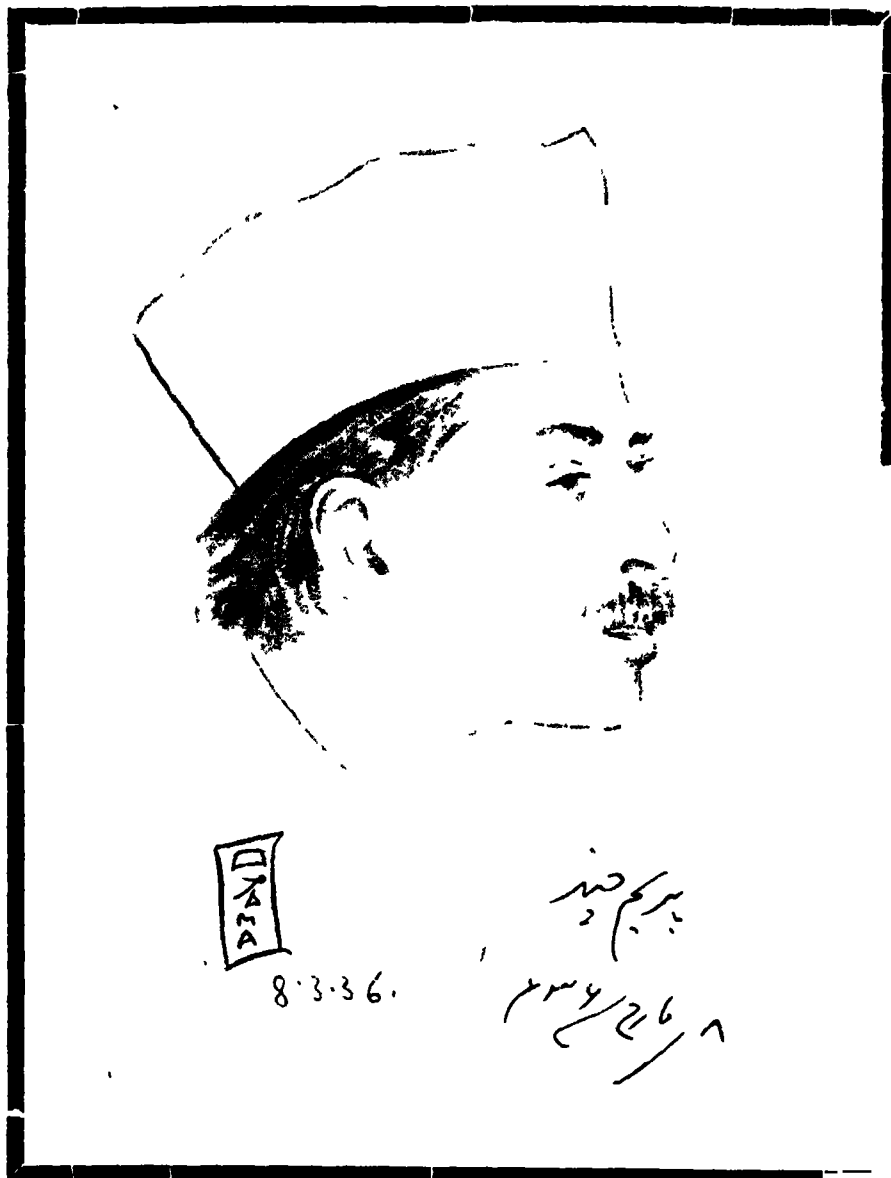
# اردو ادب اور منشی پریم چند

(از جناب صادق الخیری صاحب۔ بی۔ اے (آنرز))

بیسویں صدی کا چھتیسواں سال ادب اردو کی تاریخ میں ہمیشہ المناک طور پر یاد کیا جائیگا کہ اس نے ہم سے وہ متبرک ہستیں بچھڑوا دیں جن پر آنے والی نسلیں قیامت تک فخر کریں گی۔ ان بزرگوں میں منشی پریم چند بھی ہیں جو ادب اردو کی اس صنف کے جسے "افسانہ" کہتے ہیں، ایک جلیل القدر قائد تھے۔ منشی جی کی ادبی خدمات اتنی زیادہ اور ان کا افسانوی مرتبہ اسقدر رفیع ہے کہ ان کے متعلق بالتفصیل مضمون لکھنے کیلئے بے انتہا فرصت کی ضرورت ہے مگر مجھے اپنی مجبوری پر افسوس ہے کہ فی الحال منشی جی کے متعلق صرف یہ چند سطریں ہی قلمبند کر رہا ہوں۔

ہندوستان کے اس زبردست ادیب نے اپنی سوسائٹی کی زبوں حالی کے بے شمار مرقعے پیش کرکے اہل دل حضرات کو اکثر متاثر کیا۔ وہ اپنے وطن کے مخلص خیرخواہ اور ہندو سماج کے نقاد مصلح تھے۔ قدرت نے ان کی فطرت میں ادب اور ہمدردی فیاضی سے ودیعت کی تھی، اس لئے انہوں نے اس میدان میں اپنے لئے ایک الگ راہ پیدا کرلی۔ ہرچند کہ وہ نظام قدرت کے مطابق ہم میں نہیں رہے لیکن۔ انکا نام صحیح ذوق ادب کی بقا تک قائم رہیگا۔ ذیل میں ان کے ذاتی حالات اور لٹریچر پر اجمالی تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

منشی جی کا پیدائشی نام نواب رائے اور زمانۂ تعلیم کا دھنپت رائے تھا۔ وہ ۱۸۸۰ء میں بنارس کے ایک گاؤں میں غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پندرہویں سال شادی اور سولھویں سال ان کے والد منشی عجائب لال کا انتقال ہوگیا بچپن نسبتاً زیادہ اور جوانی نسبتاً مصیبتیں جھیلتے گذری مگر پھر بھی ہمت واستقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ باوجود مفلسی کے تعلیم سے لگاؤ تھا اور جس طرح بھی ہوسکا انٹرنس تک باقاعدہ اور اس کے بعد ایف اے، بی اے کے امتحانات پرائیویٹ پاس کئے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد منشی جی نے دوسری شادی ایک بیوہ کے ساتھ کرکے ہندو سماج میں اصلاح کی ایک عمدہ مثال قائم کی۔ دوسری بیوی زندہ ہیں اور ان سے منشی جی کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ منشی جی بیس بائیس سال تک اسکولوں میں معمولی تنخواہ پر پڑھاتے رہے کہ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کی تحریک سے متاثر ہوکر سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی اور رسالہ مادھوری کی ایڈیٹری سے اپنی صحافی زندگی کا آغاز کیا لیکن اس میں انہیں مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ بعدازاں الہ آباد سے جاگرن جاری کیا اور جب یہ بھی کامیاب نہ ہوسکا تو ۳۰ء میں بنارس میں ایک پریس قایم کیا اور یہاں سے ایک رسالہ "ہنس" جاری کیا۔

اس کے بعد سے ان کا وقت آسودگی سے گذرا اور موت سے پانچ چھ سال پہلے ان کی اصل قدر ہونی شروع ہوئی مگر اسوقت ان کی زیادہ تر توجہات ہندی کی طرف منعطف ہوچکی تھیں۔ انکی زندگی کا ایک اور کارنامہ "ترقی پسند مصنفین کی انجمن" (قائم شدہ اپریل ۳۶ء) میں پیش پیش رہنا ہے۔ اس انجمن کو فخر ہے کہ اس کے پہلے صدر منشی جی مرحوم تھے اور ان سے زیادہ موزوں اسوقت کوئی اور ادیب ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ منشی جی کے لٹریچر میں وہ سب باتیں موجود ہیں جن کا تعلق اس انجمن

کے مقاصد سے ہے۔ جیسا کہ آپ کو اس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ منشی جی ادب کے ذریعہ ملک و قوم کی ترقی چاہتے تھے اور یہ چیز ان کے زیادہ تر مضمونوں پر ایک ضروری عنصر کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ادب کو تفریح کا سامان پہنچانے کی غرض سے نہیں بلکہ سماج میں بہتری پیدا کرنے کی غرض سے پیش کرتے ہیں۔ ستمبر ۳۶ء میں وہ علیل ہوئے اور جوں جوں وقت گذرتا گیا ان کی بیماری بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۸ر اکتوبر کو چھپن سال کی عمر میں بمقام بنارس انہوں نے اس دکھ بھری دنیا کو الوداع کہا۔ مرض استسقا تھا جسے جلندھر بھی کہتے ہیں۔

آہ! "پریم چند" کے انتقال نے ایوانِ ادب متزلزل کر دیا!!

⁂

اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد نے اور افسانہ نگاری کا آغاز علامہ راشد الخیری نے کیا تھا۔ اس صنف میں علامہ مغفور کے معاصرین میں فن کے لحاظ سے سب سے زیادہ کامیابی جس شخص نے حاصل کی وہ پریم چند مرحوم تھے جنہوں نے اس میدان میں ہر طرح خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اردو میں "مختصر افسانے" پہلے پہل علامہ راشد الخیری نے ۱۹۰۳ء میں مخزن میں لکھے، اس سے پہلے فنی مختصر افسانے اردو میں مفقود تھے، آپ ان کو قصے، داستانیں، حکایتیں وغیرہ کہہ لیجئے۔ "مختصر افسانے" کہنا مناسب نہ ہوگا۔ پانچ سات سال بعد منشی پریم چند بھی افسانہ نگاری کی محفل میں شریک ہو گئے۔ منشی جی نے پہلا افسانہ کب اور کیا لکھا، اس کے متعلق مختلف رائیں تھیں چنانچہ ان کے پہلے افسانے کی صحیح تاریخ معلوم کرنے لئے میں نے انہیں ایک خط لکھا جس کے جواب میں انہوں نے بتایا:—

"میرا پہلا افسانہ ۱۹۰۹ء میں نکلا تھا اور اسکا نام تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن" جو سوز وطن میں شائع ہوا ہے"

ایک اور خط میں سے جو انہوں نے مجھے ۱۰ر جولائی ۳۶ء کو لکھا تھا، چند فقرے نقل کرتا ہوں جن سے منشی جی مرحوم کی ادبی خدمات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں:—

پہلا مضمون بنارس کے ایک ہفتہ وار اردو اخبار "آوازۂ خلق" میں لکھا، جو مسلسل تھا اور مہینوں چھپتا رہا، مگر کتابی صورت میں نہ آسکا۔

گالسورذی کی تین کتابیں (ڈرامے) ہندی میں ترجمہ کیں۔ ایک کتاب اناطول فرانس کی بھی (تھائی) ہندی میں۔ اردو میں صرف ایک کتاب (ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی معاشرت) کا ترجمہ کیا تھا۔

پہلے دس سال تک اردو میں لکھنے کے بعد ہندی شروع کی۔ افسانوں کی مجموعی تعداد ۲۵۰ سے زائد نہیں ہے"

منشی پریم چند کا اردو و ہندی میں کیا مرتبہ تھا اس کا اندازہ ان کے لڑیچر سے ہوتا ہے اور پھر اس حقیقت کو جان کر کہ اتنا بڑا ادیب ساری عمر مالی مشکلات کا شکار رہا۔ رونا سا آجاتا ہے۔ آخر عمر میں منشی جی کچھ عرصے کیلئے فلم لائن میں بھی آ گئے تھے لیکن یہاں بھی وہ مطمئن نہ رہ سکے کیونکہ ہندوستان کی فلم انڈسٹری میں کہانی لکھنے والا ڈائرکٹر کا پابند ہوتا ہے جسے ایک آزاد اور فن کار افسانہ نگار کی طبیعت گوارا نہیں کر سکتی۔ ان کے دو فلم "بازارِ حسن" اور "مل میں مزدور" تیار ہوئے لیکن ان کے سلسلے میں منشی جی مرحوم کو جو کوفت ہوئی اسکی بنا پر فلم لائن سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک خط سے چند فقرے منقول کرتا ہوں:—

"بھئی میں تو اب اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں یہاں ڈائرکٹروں کی ذہنیت ہی انوکھی ہے! "بازارِ حسن" کی مٹی پلید کر دی ..... اب "مل" کچھ اچھی رہی ہے .... لیکن سچ پوچھو تو مجھے تو وہ اپنا کنج عافیت ہی پسند ہے"

ان ڈراموں کے علاوہ منشی جی کا ایک ڈرامہ روحانی شادی کتابی صورت میں شائع ہوا ہے ان ڈراموں کے متعلق میری رائے ہے کہ "بیانی" زیادہ اور "عملی" کم ہیں۔

غرض باوجود مدرس افسانہ نگار اخبار نویس اور فلم ڈرامسٹ ہونے کے ان کو اطمینان اور فارغ البالی نصیب نہ ہو سکی۔ ہاں عظمت ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی اور کوئی اس کی تغلیط نہیں کر سکتا۔

...

منشی جی کی حیات ادبی کا آغاز، جس نے ان کو دھنپت رائے سے "پریم چند" بنایا، اردو زبان سے ہوا ہے اور جو چیز ان کو ادیبوں میں جگہ دلاتی ہے وہ ان کی افسانہ نگاری ہے۔ انہوں نے چوتھائی صدی تک ایسے ایسے عمدہ افسانے لکھے ہیں جو فن کے لحاظ سے نہ صرف نہایت کامیاب ہیں بلکہ ترقی پسند نومشق افسانہ نگاروں کیلئے مثالی ہیں۔ ابتدا میں منشی جی مرحوم نے بھی اپنے افسانے تفریح طبع کیلئے لکھے تھے مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا ان کے خیالات میں استواری، نظریئے میں تغیر اور مقاصد میں بلندی پیدا ہوتی گئی۔ ان کو وطن کی پستی، قوم کے تنزل اور سماج کی کمزوریوں کو دیکھکر تکلیف ہوتی تھی اسلیئے وقت کی رفتار کے ساتھ ان کے افسانوں میں فروعی اور وقتی دلچسپیاں کم ہونے لگیں اور ان کی جگہ ایسی دلکشیاں نمایاں ہوئیں جنہوں نے پڑھنے والوں کو تفکر پر آمادہ کیا۔ وہ جہالت کی اس تاریکی کو دور کردینا چاہتے تھے جسمیں مبتلا ہو کر وہم پرست لوگ اپنی غیرت اور احساس کو مردہ کردیتے ہیں۔ وہ اس تعلیم اور تہذیب کے مخالف تھے جو ہم میں ہندوستانی خصوصیات کو فنا کردیتی ہیں۔ ان کی نظریں ان سرمایہ داروں پر ہمیشہ قہر برساتی تھیں جو غریب مزدوروں کو جانوروں سے بدتر سمجھتے ہیں۔ ان کے پچھلے افسانے اٹھا کر دیکھ لیجئے، ان کے مقاصد میں انقلاب پیدا ہوگیا ہے، وہ اب زندگی اور عیش وعشرت کے نام نہاد ٹھیکہ داروں کے خلاف سرفروشانہ جنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ امیر لوگ جو مفلسوں کی مصیبتوں سے اپنی املاک میں اضافہ کرتے ہیں، منشی جی کیلئے انسانیت کے دشمن ہیں۔

جب وہ اپنے افسانوں میں سماج پر تنقید کرنے لگتے ہیں تو کسی خرابی اور خامی کو بیان کرنے میں نہیں جھجکتے۔ ان کے اظہار حقیقت میں کبھی طنز ہوتی ہے کبھی بے چارگی، کبھی غصہ ہوتا ہے کبھی ہمدردی۔ وہ کبھی سماج کی دھجیاں بکھیرنے لگتے ہیں اور کبھی یہ سمجھ کر خود ہی افسوس کرتے ہیں کہ آج اس غلام قوم اور غلام ملک کے سر پر نکبت وادبار کی ڈراؤنی بلائیں منڈلا رہی ہیں۔

منشی جی کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سوز وطن۔ جلوۂ ایثار۔ پریم پچیسی (دو جلد) پریم چالیسی (دو جلد) پریم بتیسی (دو جلد)۔ خواب وخیال۔ خاک پروانہ۔ فردوس خیال۔ نجات اور رادہا بہت مشہور ہیں۔ ان کے سب سے آخری افسانے "دو بہنیں" سے جو عصمت بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء میں چھپا ہے، اقتباس نقل کرتا ہوں۔ ایک شخص جب کسی طرح روزی حاصل نہیں کرسکا تو اس نے ناجائز صورت سے دولت حاصل کی، اس کے ذریعہ پریم چند جی سوسائٹی کی حالت بیان کرتے ہیں:-

"جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں انہیں دولت لات مارتی ہے۔ دولت تو انہیں پکڑتی ہے جو اس کے لئے اپنا دین اور ایمان سب کچھ نثار کرنے کو تیار رہیں۔ مجھے برا نہ کہیئے جتنے دولت مند ہیں سب لٹیرے ہیں۔ میں بھی انہیں میں ایک ہوں۔ کل میرے پاس روپے ہوجائیں اور میں ایک دھرم سالہ بنوا دوں پھر دیکھئے میری کتنی واہ واہ ہوتی ہے۔ کون پوچھتا ہے، مجھے یہ دولت کہاں سے ملی۔ ایک وکیل گھنٹہ بھر بحث کرکے ایک ہزار سیدھے کرلیتا ہے۔ ایک ڈاکٹر ذرا سا نشتر لگا کر پانچسو روپے مار لیتا ہے اگر ان کی آمدنی جائز ہے تو میری آمدنی بھی جائز ہے جی ہاں جائز ہے۔ ضرورت مندوں کو لوٹ کر مالدار ہوجانا ہماری سوسائٹی کا پرانا دستور ہے۔ میں بھی وہی کرتا ہوں۔ جو دوسرے کرتے ہیں۔ زندگی کا مقصد عیش کرنا۔ میں بھی لوٹوں گا عیش کروں گا اور خیرات کروں گا۔ اور ایک دن لیڈر بن جاؤں گا۔ کہئے گنوا دوں یہاں کتنے لوگ جو اپیل کر کر کروڑپتی ہوگئے ہیں؟"

الغرض اگر ہم منشی جی کے افسانوں کی چند کمزوریوں کو نظر انداز کرکے ان کی خصوصیات ایک فقرے میں بیان کرنی چاہیں تو کہینگے "ان افسانوں میں ہماری معاشرت کی تصویر، ہمارے احساسات کا عکس اور ہماری بھلائیوں اور برائیوں کا فوٹو ہے!"

⁂

منشی جی نے ناولوں کی طرف بھی توجہ کی مگر جس چیز نے حقیقتاً انکو مشہور و مقبول بنا دیا وہ ان کی افسانہ نگاری ہے، ناولوں اور ڈراموں میں افسانوں کی سی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ ان کے ناولوں میں بازار حسن، گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، نرملا، بیوہ، غبن اور میدان عمل کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ ناول نگاری میں منشی جی سے چند لغزشیں ہوگئی ہیں مگر بحیثیت مجموعی بعض اسقدر بلند پایہ کے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ ان کے ناولوں کے کردار خیالی اور ان کا مقصد تفریحی نہیں ہے بلکہ وہ ان کی مدد سے بھی اپنی قوم اور سماج کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔ ان کے ناول گویں ایک نیلگوں سمندر ہے جس کے اُس پار ارتقا اور تہذیب کی جھلیاں ہیں اور وہ اپنے ماحول اور دنیا کی خود غرضی و مطلب پرستی کو چھوڑکر ان پر سکون جھیلوں میں سما جانا چاہتے ہیں۔ وہ شہریوں کی زمانہ سازی اور تصنع سے اکتا کر دیہات کیطرف رخ کرتے ہیں اور یہیں روح کا سکون تلاش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں کسانو کے ڈانوا ڈول اور دھڑکتے ہوئے دل پیش کرکے سرمایہ داروں کی شوریدہ سری کا نقشہ کھینچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ جو دوسروں کو دکھ کے عوض سکھ پہنچاتے ہیں ان کو بھی ذرا چین سے جی لینے دو۔ ان کے دل میں دیہات کے سیدھے سادے لوگوں کیلئے درد ہے اور وہ چاہتے ہیں۔ یہاں کی بھولی بھالی بہو بیٹیاں شہریوں کی حریص نگاہوں سے محفوظ رہیں۔ وہ دیہات کے تحفظ کے لئے کسقدر بے قرار تھے اسے "گوشۂ عافیت" میں دیکھئے۔ پریم چند کا کمالِ افسانہ نگاری داستان حسن و عشق بیان کرنے میں نہیں بلکہ دیہات کے مختلف النوع لوگوں کی کردار نگاری میں ہے وہ محلوں کے رہنے والوں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے بلکہ دانہ دانہ کے محتاجوں کے حال تڑپ تڑپ کر بیان کرتے ہیں۔

"گوشۂ عافیت" کا ذکر آیا تو "چوگان ہستی" کو نظر انداز کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ یہ دونوں ناول منشی جی کے دور وسطیٰ اور آخری دور کے شاہکار ہیں اور ان میں ایک تدریجی رابطہ ہے۔ "گوشۂ عافیت" ان کے دوسرے دور کی آخری تصنیف ہے جبکہ وہ اپنے فن میں کامل مہارت حاصل کر چکے تھے۔ وہ اس میں ایسی بستی بساتے ہیں جہاں سکون اور اطمینان کا دریا لہریں لے رہا ہے، جہاں پوتر گنگا کے کنارے صاف ستھرے جھونپڑیوں میں حرص و ہوا سے ناآشنا دیہاتی اپنی زندگی بے فکری سے گذار رہے ہیں اور جہاں کے بسنے والے آپس میں ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں "چوگان ہستی" ان کے آخری دور کی تصنیف ہے اور اس کے پڑھنے سے جو خلش دل میں پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور ناول سے نہیں ہوتی۔ وہ بستی جس کی تعمیر کا خواب انہوں نے "گوشۂ عافیت" میں دیکھا۔ "چوگان ہستی" میں تباہ و تاراج ہوگئی۔ "چوگان ہستی" ایک ناول نہیں دیہات کے ہرے بھرے کھیتوں، قدرتی خوبصورتی، اور شریف النفس لوگوں کی بربادی کا مرثیہ ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ گاؤں میں مل اور کارخانے کھلنے سے ترقی کا جھنڈا لہرائیگا مگر یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ وہاں کے نیک سیرت لوگوں کی پاکیزگی بھی تو انسانیت سوز باتوں سے ملوث ہو جائیگی۔ "سورداس" کی زبان سے پریم چند کس بے چارگی اور کتنی لجاجت سے "ان ترقی چاہنے والوں" سے کہتے ہیں:۔

"سرکار بہت ٹھیک کہتے ہو، گاؤں کی رونق بڑھ جائیگی۔ کاروباری لوگوں کو فائدہ بھی خوب ہوگا۔ لیکن جہاں یہ رونق بڑھے گی وہاں تاڑی اور شراب کا رواج بھی تو ہو جائیگا کسبیاں بھی تو آکر بس جائینگی۔ پردیسی آدمی ہماری

بہو بیٹیوں کو گھوریں گے۔ کتنا ادہرم ہوگا! دیہات کے کسان اپنا کام چھوڑ کر مزدوری کے لالچ میں دوڑیں گے۔ یہاں بری بری باتیں سیکھیں گے اور اپنی بری عادتیں اپنے گاؤں میں پھیلائیں گے۔ دیہاتیوں کی لڑکیاں، بہوئیں، مزدوری کرنے آئینگی اور یہاں پیسے کے لوبھ میں اپنا دہرم بگاڑینگی جو رونق شہروں میں ہے وہی رونق یہاں ہو جائیگی۔"

اور اس طرح دیہاتیوں کا سب سے بڑا ہمدرد ادیب ہندوستانی دیہات کے برباد ہونے کا لرزہ خیز منظر "چوگان ہستی" میں پیش کر کے اپنے دل کا ارمان ظاہر کر دیتا ہے، کہ کاش دیہات کی بہار زمانے کے ہاتھوں لٹنے نہ پائے۔

ایک اور ناول کا ذکر کرنا چاہتا ہوں " یہ بازار حسن" ہے۔ ناول کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے یعنی منشی جی اپنے اس ناول کا مرکز اس جگہ کو بناتے ہیں جہاں دھن لٹا کر جوانی کے تاجر مصنوعی حسن سے وقتی محبت کا بیوپار کرتے ہیں۔ موضوع نیا نہیں، بہت سے ادیبوں نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے اور آجکل تو ہر نوجوان ادیب حسن عریاں کی تصویر کشی میں فن افسانہ نگاری کا منتہا سمجھتا ہے لیکن ذرا پریم چند کے ناول کو پڑھیئے، زمین آسمان کا فرق ہے اور یہیں آپ کو مہارت فن اور نومشقی کا بیّن فرق نظر آئیگا۔ منشی جی بازار حسن کا تذکرہ چھیڑ کر بھی سفلی جذبات کو نہیں اکساتے، انہوں نے حسن فروشی پر طویل ناول لکھ دیا مگر ایسا کہ جسے پڑھکر اس گھناونے ماحول سے نفرت اور اس اوپری حسن محبت سے کراہئیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ شیطنت اور بدی کے مکروہ رخ کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس طرح کہ بجائے نفسانی جذبات برانگیختہ ہونے کے دلوں میں بازار حسن سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے پریم چند ان بازاروں کا قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں اور انکی خواہش ہے کہ کسی طرح سماج کے ماتھے سے یہ کلنگ کا ٹیکہ دور ہو جائے۔

ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ پریم چند جی کے افسانہ (ناول مضمون وغیرہ بھی) لکھنے کا ڈھنگ اور مقصد کیا تھا؟ اسے خود ان ہی کی زبان سن لیجئے:—

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض واقعہ کے اظہار کے لئے نہیں لکھتا میں اس میں کسی فلسفیانہ جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔

***

منشی جی کے افسانوں اور ناولوں کے پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ ترقی پسند مصنفین کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ اس صورت میں کہ لوگ افسانہ نگاری کا فن "افسانے کی خاطر" ہی میں سمجھتے ہیں منشی پریم چند کے فنی افسانے جو ایک مقصد (سماج کی فلاح و بہبودی) کے بھی حامل ہیں مبتدی حضرات کیلئے نمونہ ہیں۔ منشی جی ترقی پسند مصنف تھے۔ اور ادب کے ذریعہ ملک و قوم کی ترقی چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں اگر ادیب چاہے تو مصلح بن سکتا ہے اور خاص کر افسانوں کے ذریعہ بعض اوقات ایسی ایسی اصلاحیں پیدا کی جا سکتی ہیں جو دوسری طرح آسانی سے ممکن نہیں۔ وہ ادیب پر بہت سے فرائض عائد کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اگر ہمارے ادیب ان فرائض کیطرف متوجہ ہو جائیں تو ہم میں بہت جلد بیداری پیدا ہو سکتی ہے۔ منشی جی کا آخری علمی مضمون ساقی کے افسانہ نمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے اس سے اقتباس نقل کرتا ہوں:—

"ادیب بھی مفکر ہے اور کوئی مفکر ایسا نہیں جسکی روح حالات حاضرہ سے بغاوت نہ کرتی ہو۔ وہ اس کی

تحقیق کرنا چاہتا ہے کہ نظام تمدن میں مذہبی پیشواؤں اور فلاسفروں اور ادیبوں کی صدیوں کی کاوش کے باوجود آج بھی کیوں وہ تنگ دلی اور کج نگاہی چلی آتی ہے۔ آج بھی کیوں انسان انسان کا دشمن ہے بھائی بھائی کا دشمن ہے، کیوں اس میں خلوص اور محبت نہیں ہے۔ وہ کیسا ادیب ہے جس کی روح ان حالات سے منغص نہیں ہوتی اور جس کے دل میں ان حالات کا خاتمہ کر دینے کا اشتعال پیدا نہیں ہوتا۔ انسان فطرتاً نیک ہے نہ بد۔ وہ نظام تمدن کا کھلونا ہے۔ جس نظام میں سارا اقتدار اور اختیار مٹھی بھر آدمیوں کے ہاتھ میں ہے جہاں دولت ہی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے، جہاں مذہبی رسوم کی پابندی ہی دل میں اپنی پارسائی کا غرور پیدا کرنے کے لئے کافی ہے، جہاں وہی انسانی کامیاب سمجھا جاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ دولت اور جائیداد چھوڑ کر مر جائے جہاں سیاروں کیلئے یہ موقع حاصل ہیں کہ وہ ضعیف الاعتقادوں کو الٹے استروں سے مونڈ سکیں، جہاں مذہب کا وجود محض فرقہ بندی اور دل آزاری کیلئے ہے، جہاں انسان کا خون کرنا ہی عین عبادت الٰہی ہے۔ ایسی دنیا میں رہ کر جس شخص کے دل میں اس زبوں حالی کی جستجو نہ ہو، وہ اس کی تہ میں بیٹھ کر اصل حقیقت دریافت نہ کرے وہ اور کچھ ہو اسپر ادیب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ فیشن ایبل سوسائٹی کی عاشقی معشوقی، روایات پارینہ میں ہے پڑا تے بادشاہوں کے عیش و عشرت کے افسانے لکھ کر یا راجپوتوں کی بہادری اور سرفروشی کے قصے لکھ کر آپ تحسین پا جائیں گے مگر آپ کا بے حسین دل کہاں ہے؟

اور آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس ساری خرابی کی بنیاد ہے ہماری انفرادیت یہی انسانی تہذیب کا کوڑہ ہے۔ اسی انفرادیت کی بدولت عدالتیں قائم ہیں، جرائم روز بروز بڑھ رہے ہیں، افلاس عالم گیر ہوتا جاتا ہے۔ جہاں انسان نے اس سے زیادہ کے لئے ہاتھ پھیلایا جتنی اسے ضرورت ہے، اور وہیں انسانیت نے اس کا ساتھ چھوڑا۔ مفکروں کے ساتھ آج کا ادیب بھی اسی فکر میں غوطے کھا رہا ہے کہ اس انفرادیت کی جڑ کھود کر کیسے پھینک دے۔ وہ تمام اسباب جن سے انفرادیت کو قوت ملتی ہے اور حرص پاؤں پھیلاتی ہے اور ہوس جائدادیں پیدا کرتی ہے ان کا ازالہ کرنا ادب کا فرض ہے۔"

منشی جی کی بے وقت موت سے ادب اردو کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، حقیقتاً ایسے لوگ برسوں میں پیدا ہوتے ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنے پیچھے کچھ قدردان چھوڑ جائیں۔ انتقال سے چند ماہ پیشتر جب دہلی میں ان سے نیاز حاصل ہوا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ صورت چند دن کی مہمان ہے!!

**صادق الخیری**

# پُرانا گیت

بازخاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کارخانہ کا ہیڈ مستری عمر ۴۵ سال

رحیمن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی بیوی عمر ۴۵ سال

نیازن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی نوجوان بیٹی

مجید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی کارخانہ کا ایک اور ہیڈ مستری جوان ہی کے گھر میں رہتا ہے عمر ۲۵ سال

زمانہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ماضی، حال اور مستقبل

رات کا وقت بازخان کے کوارٹر کا ایک کشادہ مگر تاریک کمرہ۔ دائیں بائیں ایک ایک دروازہ۔ دائیں طرف کا دروازہ باہر سڑک پر کھلتا ہے اور بائیں طرف کا اندر والے کمرہ میں۔ عقب میں ایک اور دروازہ جو دوسرے کمرہ میں کھلتا ہے۔ اسی کمرہ میں مجید مقیم ہے۔ کمرہ کے بائیں طرف کے کونے میں ایک جھلنگا پلنگ پڑا ہے جس پر رحیمن دراز ہے۔ برابر میں ایک ٹوٹے ہوئے، ہنگورے میں ایک چھوٹا بچہ اونگ رہا ہے۔ عقب میں دروازے کے قریب ایک چھوٹے سے تخت پر نیازن بیٹھی ٹمٹماتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں کچھ سی رہی ہے۔ دوسرے کونے میں متفرق سامان کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ رحیمن آہستہ آہستہ ہنگورے کو ہلا کر یہ لوری گا رہی ہے :-

سو میرے بالے تو سو میرے بھولے

جب تک بالی ہے نیند

پھر تو پڑیگا تو دنیا کے دھندے

کت پالنا کت نیند

اگر چندن کا پالنا ریشم لاگی ڈور

آرام کا ہے پالنا سکھ کی ہے نیند

(بچہ کُلبلاتا ہے اور آہستہ آہستہ روتا ہے رحیمن اُسے تھپکا کر سلانا چاہتی ہے مگر وہ زیادہ شور کرنے پر آمادہ ہے) سو جگ جلدی۔ نہیں بلاتی ہوں اب بی چا کو۔ اوددوں اوددوں اوددوں سو جا سو جا سو جا (بچہ زور سے چیخ مار کے دہاڑتا ہے) بھاڑ میں جائے کمبخت ذرا چین نہیں لینے دیتا۔ ایسا چیختا ہے جیسے کسی نے کاٹ کھایا۔ سو نہیں تو پٹختی ہوں اب اٹھا کر یہ ناشاد کہیں کا۔ زندگی حرام کر رکھی ہے نامراد نے، نہ جانے کس گھڑی کی پیدائش ہے۔ (چمکار کے) اوددوں اوددوں سو جا۔ ہاں ہاں ہوں ہوں اوں۔

آ جا ری نیندیا تو آکیوں نہ جا

میرے ننھے کی آنکھوں میں گھل مل جا

آتی ہوں بیوی میں آتی ہوں

دو چار بالے سلاتی ہوں

نیازن۔ اماں، ننھا بھوکا معلوم ہوتا ہے شاید

رحیمن۔ اور کیا بھوک کے مارے ظر ظر کر رہا ہے۔ بدنصیب کو دو چمچے دودھ کبھی نہیں جڑتا۔ وہ تمہارے باوا جان ہی کیا ہوئے جو ذرا بچوں کی پرواہ کریں۔ کہا تھا اگلی تنخواہ پر ڈبہ لا دوں گا۔ آج تک آرہا ہے۔ نہ کبھی اتنے پیسے نصیب ہوئے کہ بازار کا دودھ باندھا جاتا۔ اب دیکھو نا آدھی رات ہونے آئی اب تک پتا نہیں۔ کیا بجا ہو گا۔

نیازن۔ ابھی کارخانہ کے گھنٹے نے دس بجائے ہیں (کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے)

رحیمن۔ کون ہے؟

نیازن۔ ہاں کسی کے آنے کی آواز تو آرہی ہے۔

رحیمن ۔ اے کون ہے؟

مجید۔ (توانا بشاش بائیں طرف کے دروازہ سے داخل ہو کر) میں ہوں بھابی۔ تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔

رحیمن۔ ہاں بھیا، کیا کروں، تمہارے لاٹ صاحب بھائی کی راہ دیکھ رہی ہوں وہ اب آتے ہیں نہ جب۔ آخر آج دیر کہاں لگی۔ کچھ تمہیں خبر ہے ؟

مجید۔ دن بھر تو وہ میرے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ہاں ہاں شاید آج وہ دیر میں آنے کو کہتے تھے۔ آج دوست انہیں اپنے ساتھ پکڑ کر لے گئے ہیں۔

رحیمن ۔ یہ دیکھو نا۔ یہاں بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں اور میاں جی کو سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ گئے کہاں ہیں ؟

مجید۔ شاید ہوٹل میں۔

رحیمن ۔ ہوٹل میں!! یہ اور کیا! انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام نہ بچے چاہے بھاڑ میں جائیں۔ ایسا مرد بھی میں نے دنیا کے پردے پر نہیں دیکھا۔ میرے پھوٹے نصیبوں میں تو موت بھی نہیں لکھی جو اس عذاب سے اپنی جان چھڑاؤں۔ نہ ان ہی کو کہیں چلو بھر پانی نظر آتا ہے جو ڈوب مریں۔

مجید۔ نہیں بھابی ایسی باتیں کیوں منہ سے نکالتی ہو۔ آج ایسی ہی بات ہو گئی جو انہیں دیر ہو گئی۔

رحیمن ۔ آج صرف آج۔ ارے یہاں تو روز کا ہی رونا ہے۔

مجید۔ نہیں نہیں بھابی بات یہ ہوئی کہ . . . . . . . .

رحیمن ۔ کیا بات ہوئی ؟

مجید۔ بات یہ ہوئی کہ آج کارخانہ میں ان سے ایک پرزہ ٹوٹ گیا۔ منیجر نے ان پر دس روپیہ جرمانہ کر دیا۔ چالیس روپلی تنخواہ میں سے بیس تو پہلے ہی سے کٹتے تھے۔ یہ دس روپیہ اور کٹے۔

رحیمن۔ دس روپیہ جرمانہ ۔ افوہ ۔ خدا کی شان۔

مجید۔ بچارے بازخاں کو اتنا رنج ہوا، کہ وہ گھر میں بھی آنا نہیں چاہتا تھا۔

رحیمن۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔

مجید۔ کچھ دوست اس کا غم غلط کرنے کیلئے اُسے ہوٹل میں لے گئے۔

نیازن۔ (جیسے جرمانہ کے لفظ پر اپنا سینا پرونا الگ رکھ دیا تھا ) تو منیجر سے انہوں نے کہا کیوں نہیں، شاید معاف کر دیتا۔

مجید۔ معاف کر دیتا!! منیجر تو بہ کرو۔ نیازن، یہ لوگ لوہے کا کارخانہ چلاتے چلاتے خود بھی لوہے کے ہو گئے ہیں۔ آدمی کا خون چوس کر روپیہ کماتے ہیں۔ تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں۔

رحیمن۔ اداس اور غمگین پھر پلنگ پر دراز ہو جاتی ہے۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد مجید نیازن کے قریب تخت پر بیٹھ جاتا ہے) نیازن پھر سینا شروع کرتی ہے)

مجید۔ آہستگی سے تم ابھی سوئیں نہیں۔

نیازن۔ ( ہلکی آواز میں بغیر سر اٹھائے) نہیں یہ کرتا آج ہی پورا کرنا ہے۔ صبح ہی درزی کا آدمی آتا ہوگا۔

مجید۔ ایسا کیا ضروری ہے۔ کل پورا کر لینا۔ زیادہ رات تک جاگنا ٹھیک نہیں ہے۔

نیازن ۔ مجھے آج ہی پورا کرنا ہے۔ صبح ہی پیسے ملجائینگے تو کچھ کام چل جائیگا۔ یہاں کی حالت تو تم جانتے ہی ہو۔

مجید۔ خدا اپنا رحم کرے۔ اگر یہی حالت رہی تو نہ معلوم کیا انجام ہوگا۔

نیازن۔ مگر خدا کبھی نہ کبھی تو دن پھیرے ہی گا۔

مجید۔ ضرور ضرور۔ خدا کرے جلدی ہی۔

نیازن۔ اگر میرے پاس تھوڑے سے بھی روپے ہو جائیں تو پھر میں ایک مشین لے لوں۔ پھر مجھے درزی کی خوشامد نہیں

کرنی پڑیگی۔ خودکام کیا کروں گی اور خود ہی جتنی جی چاہے مزدوری لیا کرونگی۔
کمبخت درزی گاہک سے تو ایک کرتے کے آٹھ آنے لیتا ہے اور مجھے چار
ہی آنے دیتا ہے ... اور پھر شاید ابا جان کی تنخواہ بھی کچھ بڑھ جائے۔

مجید۔ ناممکن۔ منیجر، انجنیئر سب کے سب ان سے ناراض ہیں۔
اب تو دن بدن ان کو کم ہی تنخواہ ملیگی۔ بوائلر کا کام وہ جانتے نہیں جو
تنخواہ بڑھے۔ نہ نئے انجنوں کی مشینری ان کی سمجھ میں آسکتی ہے۔
پرانے انجنوں کی مانگ اب روز کم ہوتی جاتی ہے .....

نیازن۔ تمہیں تو نئے انجنوں کا کام آتا ہوگا؟

مجید۔ کیوں نہیں۔ جب ہی تو مجھے زیادہ تنخواہ دیتے ہیں۔
آیندہ مہینے میں اسی روپے ہوجائیں گے۔ زیادہ محنت کروں تو بجلی
کے موٹر کا کام بھی کرسکتا ہوں۔ اس طرح مجھے دوگنی آمدنی ہونے
لگی ہے۔ ارادہ ہے کہ شادی کے بعد یہ کام بھی کروں گا۔

نیازن۔ کیا شادی کر رہے ہو؟

مجید۔ نہیں۔ لیکن۔ ہاں۔ چاہتا تو ہوں۔ مگر۔

نیازن۔ مگر کیا؟

مجید۔ شاید ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے زبردستی شادی
کروائی جارہی ہے۔ فورمین روز ایک نہ ایک لڑکی دکھاتا ہے اور
اصرار کرتا ہے کہ اس سے شادی کرڈالوں۔ کل ایک اور لڑکی سے
ملایا۔

نیازن۔ تو کل تم اپنی دلہن کو دیکھنے گئے تھے کیوں؟؟

مجید۔ دلہن۔ لاحول ولا قوۃ۔ (آہستہ سے ہنستا ہے) بھدی
بھونڈی صورت کی لڑکی، جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ نہ اس کو
جانوں پہچانوں بھلا میں کیسے شادی کرسکتا ہوں۔ اور نہ وہ مجھے
اچھی طرح جانے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے نیازن۔ راہ چلتے ہر لڑکی
سے کہتا پھروں کہ مجھ سے شادی کرلو۔ فرض کرو کوئی تم ہی سے
اسطرح کہے تو.......

نیازن۔ (مسکراتے ہوئے) مجھے بہت غصہ آئے۔ مگر پھر بھی
اگر ابا اور اماں کی مرضی یہی ہو تو پھر میں کیسے انکار کرسکتی ہوں۔

مجید۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ساتھ
جسے تم ذرا بھی نہ جانتی ہو ساری زندگی گذارنے پر تیار ہوجاؤ۔ ناممکن!
یہ تو بڑا ظلم ہے۔ بہت بری بات ہے۔ (اٹھتے ہوئے) اچھا خدا حافظ
باقی باتیں صبح ہوں گی۔

نیازن۔ (اداس لہجے میں) خدا حافظ!

(مجید عقب والے دروازہ سے اپنے کمرہ میں چلاجاتا ہے)

نیازن سینا پرونا ہاتھ سے رکھکر کسی گہرے فکر میں پڑ جاتی ہے۔
کچھ دیر خاموشی کے بعد بائیں طرف والے کمرہ میں سے بچے کے رونے
کی آواز آتی ہے رحیمن ہڑبڑا کر اٹھتی ہے)

رحیمن۔ مراد رو رہا ہے شاید۔ چار دن ہوگئے غریب کا بخار
ہی نہیں اترتا۔ (نیازن جلدی سے اٹھتی ہے سرپر کے شور سے
پنگوڑے والا بچہ بھی جاگ اٹھتا ہے اور فوراً رونا شروع کرتا ہے۔
نیازن اندر والے کمرے میں جاتی ہے اور رحیمن ننھے کو سنبھالتی ہے
عقب والا دروازہ کھلتا ہے اور مجید جھانکتا ہے۔

مجید۔ کیوں بھابی۔ آج یہ ننھا کیوں اتنا رو رہا ہے۔ اور مراد
بھی چلا رہا ہے۔

رحیمن۔ آج صبح سے دو گھونٹ دودھ نصیب نہیں ہوا بھیا
اور کیوں رو رہا ہے۔ اور مراد تو چار دن سے بخار میں تپ رہا ہے۔

مجید۔ تم نے مجھ سے کیوں نہ کہا بھابی۔ اتنی غیریت برتتی ہو۔
میں ابھی آیا۔ (کچھ منٹ بعد ایک پتیلی میں دودھ لئے داخل ہوتا ہے)

مجید۔ لو یہ دودھ گرم ہے۔ بچے کو پلادو۔ اور مراد کو میں
صبح ہی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤنگا۔

رحیمن۔ نہیں بھیا۔ اب تو سو گیا۔ کیوں تکلیف کرتے ہو۔ اور
یہ دودھ اسوقت آیا کہاں سے؟

مجید۔ تکلیف کاہے کی۔ صبح کی چائے کیلئے بازار سے لایا تھا۔ تم
یہ پلادو۔ ننھی سی جان بھوک سے بیقرار ہے۔ میں صبح کی چائے دیتے

پی لوں گا۔ اس میں تکلیف کونسی ہے۔ لو جلدی کرو۔ میرے ہاتھ جل رہے ہیں۔

رحیمن۔ بہ تکلف مجید کے ہاتھ سے پتیلی لیکر پلنگ پر رکھتی ہے۔ نیازن مُرکو خاموش کرکے اندر والے کمرے میں سے آتی ہے۔ رحیمن پنگوڑے میں سے بچہ کو اٹھا کر اندر والے کمرے میں لیجاتی ہے۔ نیازن لیمپ کی بتی اونچی کرکے پھر سینے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ مجید نیازن کے قریب تخت پر بیٹھ جاتا ہے)

نیازن۔ تم بڑے نیک دل ہو۔

مجید۔ نیک دل! کیا اس لئے کہ صبح کی چائے اور بیرے سے پیونگا؟ (آہستگی سے ہنستا ہے) رحیمن اندر والے کمرہ میں سے آتی ہے پلنگ پر سے پتیلی اٹھا کر پھر اسی کمرہ میں چلی جاتی ہے)

نیازن۔ نہیں اسلئے کہ تم ہمارا اتنا خیال رکھتے ہو۔

مجید۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ میں تمہارا مہمان ہوں مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہو۔

نیازن۔ یہ تو الٹا تم ہمیں شرمندہ کررہے ہو۔ مہمان کاہے کے ہمارے کوارٹر میں رہتے ہو۔ اس کا کرایہ دیتے ہو اپنا کھاتے ہو اپنا پیتے ہو۔ ہمیں اللہ نے اس قابل ہی نہیں کیا کہ ہم تمہیں مہمان بناسکتے۔

مجید۔ میرے لئے یہی بڑی نعمت ہے کہ مجھے باز خان جیسا دوست ملا، جس کا پورا خاندان میرا اتنا ہمدرد ہے۔ سنو، نیازن۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ ماں باپ کی کبھی شکل نہ دیکھی۔ نہ بھائی نہ بہن بچپن کا زمانہ ایک ظالم چچا کے ہاں گذارا جس نے دس برس کی عمر میں کھانے کمانے کیلئے نکال باہر کیا۔ کسی کو میری کچھ پرواہ نہ ہوئی۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے تم جیسے محبت کرنے والے لوگ ملے۔ میرے لئے یہی سب کچھ ہے۔

نیازن۔ جب تمہاری شادی ہو جائیگی تو پھر تمہیں بہترین عہدہ مل جائے گا۔

مجید۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ کیا کہا تم نے۔ جب میری شادی ہو جائیگی۔ اوہ! نیازن، تم بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔

نیازن۔ تم کہہ رہے تھے نا کہ ایک دلہن کو دیکھنے گئے تھے۔

مجید۔ دلہن کیسی۔ وہ کمبخت فورمین ہر وقت اکساتا رہتا ہے کہ اپنا گھر بسالو۔ تاکہ کوئی خیال رکھنے والی ملجائے۔ کھانے پینے کا آرام ہو جائیگا اور نہ معلوم کیا کیا بکا کرتا ہے۔

نیازن۔ ہاں تو پھر اس میں ......

مجید۔ اچھا نیازن تم بتاؤ۔ تم بڑی عقلمندی کی باتیں کرتی ہو۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے۔؟ (ٹھنڈا سانس بھر کر) میرا کیا جی چاہتا ہے کہ ہر وقت یہاں تمہارے پاس بیٹھا رہوں اور تم سے مزے مزے کی کہانیاں سنتے جاؤں۔ تمہیں کیسی اچھی اچھی کہانیاں یاد ہیں کل تم نے ماہی گیر والی کہانی کیسی عمدہ سنائی تھی۔ اور وہ بادشاہ والی کہانی تو بہت ہی اچھی تھی۔ وہ تمہیں پھر سنانی پڑیگی۔ یاد نہیں رہا۔ کیا تھا؟ ہاں۔ ایک بادشاہ تھا جس کے چار بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ بہت مزے دار کہانی تھی۔ (بے چینی سے) نیازن۔ میں نے کہا۔ کیا کہنا چاہئے میرا مطلب ہے کہ۔ ہاں، کیا کہہ رہا تھا میں۔ نیازن۔ ایک بات کہوں، اگر تم خفا نہ ہو تو۔ سنو۔ (آہستگی سے) تم میرے ساتھ تم مجھ سے شادی کروگی (نیازن کے ہاتھ سے کپڑا چھٹ جاتا ہے اسکی آنکھیں زمین پر گڑ جاتی ہیں) چند منٹ کی خاموشی۔

مجید۔ (ہمت کرکے) بولو، نیازن۔ نیازن میں تمہیں دل وجان سے چاہتا ہوں۔ ہر وقت مجھے تمہارا ہی دھیان رہتا ہے۔ میری دلی مُراد برآئیگی اگر تم نے ..... بولو، نیازن کیا کہتی ہو۔

نیازن (بغیر سر اٹھائے) اگر اباجان منظور کریں تو....

مجید۔ (والہانہ انداز میں نیازن کا ہاتھ پکڑکر) اوہ! نیازن! میں تمہیں خوش رکھنے کیلئے چوبیس گھنٹے کام کروں گا۔ دن رات ایک کردوں گا۔ اپنی ساری کمائی تمہارے قدموں میں ڈالدوں گا۔ پھر تم کو اس طرح راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر سینا نہیں پڑیگا۔ چوبیس گھنٹے خوب کام کروں گا اور جو تھوڑا سا وقت فرصت کا ملیگا اس میں اسطرح

تمہارے پاس بیٹھکر مزے مزے کی کہانیاں سنونگا۔ ہم کسقدر خوش ہوں گے...... (مجید کی جوشیلی تقریر باہر سے آنیوالے بے سُرے نغموں کے طوفان میں دب کر رہ جاتی ہے۔ دائیں دروازہ سے باز خاں، ڈگمگاتے قدموں سے مستانہ وار جھومتے جھومتے تشریف لاتے ہیں اور سبکی طرف سے بے پرواگاتے ہوئے کپڑے اتارنے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔)

بازخاں۔ ساقی پلادے شراب۔ بہار آئی۔ بہار آئی۔ ہاں بہار آئی۔ ارے ہاں ہاں رے بہار آئی بہار ہی بہار اور پلادے شراب۔ پلادے شراب۔ شراب شراب ساقی پلادے۔ پلادے پلادے شراب۔ بہار آئی۔ بہار ہی بہار!!

مجید۔ (اس کے شانے کو تھپک کر) خانصاحب۔

بازخاں۔ (چونک کر) اوہو۔ مجید۔ اوہو یار۔ تو ابھی تک سویا نہیں کیا بجا ہوگا؟

مجید۔ ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ تم کہاں تھے ابھی تک؟

بازخاں۔ (بناوٹی لہجے میں) او بائی ام اوٹل میں تھا۔ یاروں کے ساتھ مزے کرتا تھا۔ اچھا اب ام سونا ہے۔

مجید۔ خاں صاحب مجھے تم سے بڑی ضروری بات کرنی ہے۔

بازخاں۔ خو بائی۔ کل بات ہوگی۔ ام کو زور کی نیند آئی ہے۔

مجید۔ نہیں نہیں بڑی ضروری بات ہے۔ تم کو سننی پڑیگی۔ کل فرصت نہیں ہوسکتی۔

بازخاں۔ ارے فرصت ہی فرصت ہوگی۔ کل کارخانہ میں بات ہوگی۔

مجید۔ نہیں بھائی کارخانہ کے شور میں یہ بات نہیں کیجاسکتی تم سُنو تو۔

بازخاں۔ کارخانہ کا شور۔ (ہاہاہا)۔ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دلکا۔ اچھا اچھا بولو (کیا بات ہے؟

مجید۔ بات یہ ہے کہ (ہکلاتے ہوئے) ب ب بات ہے کہ کہ باز خاں۔ ت ت تم بھی۔ اچھی اچھی طرح جانتے ہو۔ اسلئے میں میں میں یہ کہنا ......

بازخاں۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) تجھے ہو کیا رہا ہے دوست تیری زبان کو کیا ہوا۔ وہ تیز دہار والی قینچی کدھر گئی جو ہر وقت ترر ترر چلتی رہتی تھی۔

مجید۔ (ہمت کرکے) سنو باز خاں۔ بات یہ ہے کہ مجھے نیازن سے محبت ہے خفا نہونا۔ میرا اس میں کچھ قصور نہیں۔ تم جانتے ہو میں بیہودہ آدمی نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم رضامند ہوجاؤ۔ میں شادی کرنا.......

بازخاں۔ (سنجیدگی سے) تم وعدہ کرتے ہو کہ اُسے ہمیشہ اچھی طرح رکھو گے؟

مجید۔ کچھ دیر غور کرکے۔ اپنی جان سے زیادہ عزیز۔

بازخاں۔ اُسے کبھی کوئی تکلیف نہ دوگے۔

مجید۔ خدا کی قسم ہرگز نہیں۔

بازخاں تمہیں اس سے محبت ہے اور اُسے بھی۔

مجید۔ ہاں، ہے......

بازخاں۔ (زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے) قے قے قے، اچھا، بہت اچھا۔ خو بائی ہم منظور کرتا ہے۔

(مجید جوش میں باز خاں سے قریب قریب چمٹ جاتا ہے خاں صاحب بھی کوئی مدافعت نہیں کرتے)

بازخاں۔ نیازن، کی ماں کو معلوم ہے؟

مجید ابھی نہیں۔

بازخاں۔ بلاؤ اُسے (رحیمن بپھری ہوئی شیرنی کیطرح آتی ہے اور باز خاں پر برس پڑتی ہے)۔ (مجید اور نیازن تخت پر آبیٹھتے ہیں)

رحیمن۔ آگئے لاٹ صاحب۔ اب بھی کیوں آئے۔ جاؤ نہ اپنے انہیں چاہیتوں کے پاس۔ آئے تھے تو بچوں کے لئے تھوڑا سا زہر بھی لیتے آتے۔ روتے روتے اپنی جان ہلکان کر رکھی ہے۔ مگر تمہاری

جوتی کو غرض پڑی ہے ان کی پرواہ کرے۔ خدا تم سے سمجھے۔ جیسا تم نے مجھے دکھ دیا ہے خدا کرے تمہارے۔ بس اب میں کیا کہوں۔ اپنے جلوے مانڈے سے مطلب رکھتے ہو۔ بال بچے چار چار وقت کے کڑاکے کھینچیں تمہاری جوتی کی نوک سے۔ خدا مجھے تو بس اب اٹھا لے جو تمہاری منحوس شکل کہیں دکھائی نہ دے۔ یا پھر تمہارا ہی پردہ ڈھک لے۔ اس سے زیادہ اور کیا دکھ ہوگا کہ گھر میں اناج کی مٹھی نہیں۔ ننھی سی جان بلک بلک کر ہلاک ہو گئی وہ تو خدا بھلا کرے بیچارے مجید کا جو اُسے رحم آیا اور اس نے دودھ دیا ورنہ آج میرے مُنہ میں خاک اس کا تو وقت آ ہی گیا تھا۔ دوسرا الگ بخار میں پڑا تپ رہا ہے مگر تم جیسے شرابی کو......

بازخاں۔ شرابی! (زور سے قہقہہ لگا کر) کیا کہا شرابی! غلط بالکل غلط۔ (اسی بناوٹی لہجے میں) تو ہم پٹھان ہے کبھی نشہ میں نہیں ہوسکتا۔ سچ بات ہے کہ ام کو بشیر نے وسکی پلائی پر اُسکا کیا قصور اور ہمارا کیا قصور۔ دس روپے جرمانہ ہم پر کس واسطے حرامزادہ منیجر نے کیا۔ بشیر نے ہمارے ساتھ بھلائی کی، اور پھر صدیق نے ہم کو ٹھنڈا برف بھی پلایا اور یہ مٹھائی بھی دیا۔ ہمارے ساتھ بڑا نیکی کیا (جیب سے مٹھائی کی پڑیاں نکال کر) لو، یہ مٹھائی...... شرابی خرابی کا خیال چھوڑ دو مت بائی کی طرف دھیان کرو، بھائی....! بہار آئی۔ ہاں بہار آئی رے.....؟

رحیمن۔ اچھا اب چپ بھی رہو گے یا جب سب بچے جاگ اٹھیں گے جب چین آئیگا۔ تمہیں کیا معلوم کس مصیبت سے ایک ایک کو سلایا ہے۔

بازخاں۔ خیر۔ خیر۔ مگر سنو ہمارے مجید نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ نہ وسکی نہ -

رحیمن (جسے مجید کی موجودگی کا علم نہیں ہے) ارے یہ کیا غضب کرتے ہو۔ مجید ابھی سویا نہیں، اپنے کمرے میں ہے۔ سُن لیگا۔ شرم نہیں آتی۔ ایسی باتیں کرتے ہو۔ شرابی کہیں کے۔

بازخاں۔ شرابی تو تم خود ہو۔ وہ کون بیٹھا ہے۔ وہ (ہنستا ہے) وہ دیکھو وہ۔

رحیمن (اب بھی مجید کو نہ دیکھکر) خدا تمہاری حالت پر رحم کرے۔

بازخاں۔ (مجید کو رحیمن کی طرف دھکا دیکر) اٹھ بھائی۔ اُسے یقین نہیں آئیگا۔ اب کہہ دے سب کچھ تو خود ہی اس اپنی ساس سے کہہ۔ کہ۔ تم نیازن سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ بس چلو۔ کہہ چکو شرم کا ہے کی۔

رحیمن۔ اوہو۔ مجید۔ سچ مچ کیا یہی بات ہے۔

بازخاں۔ ہاں بھائی۔ یہ سچ ہے۔ خانصاحب نے بھی منظور کرلیا اب تم بھی راضی ہوجاؤ۔

رحیمن۔ یہ بات ہے، تو پھر مجھے بھی راضی سمجھو۔ خدا مبارک کرے۔ مگر کب تک ارادہ ہے۔

مجید۔ اس اتوار کو۔ (بازخاں مٹھائی کی پڑیاں تخت پر کھول کر رکھتا ہے)

رحیمن۔ اتنی جلدی۔ مگر بھیا میرے پاس تو جہیز کے نام تار کا ایک چھلا بھی نہیں۔

بازخاں۔ اچھا آؤ سب، ہم اسی خوشی میں تم کو مٹھائی کھلاتا ہے۔

مجید۔ بھابی۔ تم نے بھلا فکر کیا۔ جہیز وہیز کی مجھے ضرورت نہیں۔

بازخاں۔ (مجید اور رحیمن کا ہاتھ پکڑکر تخت پر بٹھلاتے ہوئے) خوا بھائی چھوڑو ان باتوں کو مت بائی کیطرف دھیان کرو۔

(سب تخت پر بیٹھ جاتے ہیں اور مٹھائی کھاتے ہیں۔ چند سکنڈ بعد، بازخاں مٹھائی کا ایک ٹکڑا لیکر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پلنگ پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ رحیمن بھی آجاتی ہے۔ تخت پر مجید اور نیازن رہجاتے ہیں۔ لیمپ کی روشنی تیل کی کمی کے سبب کم ہونی شروع ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد بازخاں آہستگی سے رحیمن سے کہتا ہے۔)

بازخاں۔ (دلچسپی سے) تمہیں یاد ہے۔ اسی طرح آج سے بیس برس پہلے میں نے بھی تمہیں مٹھائی کھلائی تھی۔

رحیمن۔ ہاں ہاں بالکل کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

بازخاں۔ اس رات کیسی سخت سردی پڑ رہی تھی۔

رحیمن۔ ہاں برف پڑ رہی تھی۔

بازخاں۔ تمہارے ہاتھ بھی برف کی طرح سرد ٹھنڈے ہو رہے تھے میں نے انہیں اس طرح (اپنے ہاتھ میں رحیمن کا ہاتھ پکڑ) اپنے ہاتھوں میں گرم کیا۔ اور پھر اس طرح اپنے گرم گرم ہونٹوں سے چوم چوم کر تمہارے ہاتھ سینکے (پے بہ پے رحیمن کے ہاتھ چومتا ہے۔)

رحیمن (خواب کی سی حالت میں) ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔

(لیمپ کی مدہم روشنی میں مجید اور نیازن بھی ایک دوسرے کے ہاتھ چومتے نظر آتے ہیں)

بازخاں۔ پھر شادی کے بعد۔ حالانکہ میری تنخواہ بہت کم تھی پھر بھی ہم بہت خوش تھے بہت زیادہ خوش۔ ٹھیر و مجھے سوچنے دو کتنا زمانہ ہم نے خوشی میں گذارا۔

رحیمن ۔ ایک برس۔ کیونکہ ایک برس کے بعد ہی ہمارا پہلا بچہ پیدا ہوا اور میں سخت بیمار ہو گئی۔

بازخاں۔ (غمگین لہجے میں) ہاں ہاں اُفوہ کیا زمانہ تھا۔ تمہاری زندگی کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ ہمارے گھر کا ایک ایک تار تمہاری بیماری پر صرف ہو گیا۔ پھر تمہیں اللہ نے اچھا کر دیا اور پھر۔ دوسرے سال ایک اور بچہ ہوا اور اُس کے ساتھ غریبی بھی بڑھ گئی۔ پھر۔

رحیمن۔ پھر تیسرے سال ایک اور بچہ۔

بازخاں۔ (اداس لہجے میں) ہاں اور اسی طرح ہر سال ایک بچہ ہوتا رہا۔ اور اس کے ساتھ غریبی بھی آتی گئی۔ ہر سال ایک بچہ اور غریبی میں اضافہ۔ غریبی میں اضافہ اور پھر ایک بچہ۔ آہ۔ افوہ! خدایا۔

رحیمن۔ ہاں، قسمت کا لکھا۔

بازخاں۔ (چند منٹ غور کے بعد) اور آپ بھی یہی گیت گائیں گے۔

رحیمن۔ کونسا گیت؟

بازخاں۔ یہی پرانا گیت۔

رحیمن ۔کون گائیں گے؟

بازخاں۔ مجید اور نیازن۔

رحیمن۔ نہیں۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔ غریبی اور مصیبت آنے سے پہلے وہ تمہارے گیت سے بھی پرانا گیت سیکھ جائیں گے۔

بازخاں۔ وہ کون سا گیت ہے۔

رحیمن۔ وہ محبت کا گیت ہے جو سب سے پرانا ہے۔ مصیبت کے گیت سے بھی پرانا گیت جسے ہم اکثر بھول جاتے ہیں۔

بازخاں۔ (گرم جوشی سے رحیمن کا ہاتھ چومتا ہے) تم سچ کہتی ہو۔

(عقب میں لیمپ کی مدہم روشنی میں نیازن سیتی جاتی ہے اور مجید کو کہانی سنا رہی ہے۔ "وزیر زادے نے کہا جہاں پناہ، جان کی اماں پاؤں تو کہوں کہ ہرنی کا کوئی قصور نہیں۔"

رشید بہوت بنا اس کے قدموں کے پاس بیٹھا دل کے کانوں سے اس کی پیاری باتیں سن رہا ہے اور دل کی آنکھوں سے اُسکے منور چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔ یکایک پنگورے والا بچہ چلاتا ہے اور رحیمن پنگورا ہلاتے ہوئے اُسے لوری دیتی ہے۔

سو میرے بالے تو سو میرے بھولے
جب تک بالی ہے نیند
پھر تو پڑے گا دنیا کے دھندے
کت پالنا کت نیند . . . . . . . .

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

(ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں پڑھا گیا)

سید انصار ناصری

# غزل

چڑھتے ہوئے دریا کی موجوں کا تماشہ کر | جو انکی محرک ہے اس شے کی تمنا کر
ہر لہر کے دامن سے ساحل سے گذر جاؤں | اے موج یم ہستی تو بھی یہ تہیہ کر
زنجیر توہم میں جکڑے ہوئے دیوانے! | اک جھٹکے میں توڑ اسکو قصد دلِ شیدا کر
دنیا میں پنپنے کا گر تجھ کو بتاتا ہوں | تدبیر کے پردہ میں تقدیر کا سودا کر
مجبوب اگر دل سے ہی تجھکو خودی تیری | ایمان کو پیدا کر ایقان کو پختہ کر
میخانۂ ہستی میں بکتی نہیں دیتے ہیں | رندوں کی طرح ڈٹکر ساقی سے تقاضا کر

مینا کو امین خالی میخوار نہیں رکھتے
تخریب تمنا پر تجدید تمنا کر

امین حزین

# ماں کی محبت

(از جناب آر گاموصاحب پرفیسر زبان اردو۔ ٹوکیو یونیورسٹی جاپان)

(پروفیسر آر۔گاموا ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔موصوف حال ہی میں بغرض سیاحت ہندوستان تشریف لائے ہیں اور آجکل دہلی میں مقیم ہیں۔موصوف بڑی فضیلت کے بزرگ ہیں انتہائی خوش نصیبی کہ موصوف نے باوجود ناسازی مزاج ذیل کا بیش قیمت مضمون سالنامہ شاہجہاں کے لئے عنایت فرمایا۔آپ کو اردو ادب پر قابل عبور اور اس زبان کی اشاعت و ترقی سے جسقدر رغبت و تعلق ہے وہ ذیل کے پاکیزہ افسانہ سے ظاہر ہے یقین ہے کہ ممدوح کی نوازشات ہمارے لئے اور ہماری زبان کے لئے برابر جاری رہینگی)

جاڑے کی صبح تھی۔باہر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ہوا کے ان دن میں تھرتھری پیدا کرنے والے جھونکوں کے ساتھ کبھی چھوٹے چھوٹے اولوں کی چھال کمرے کے اندر بھی آجاتی تھی۔یہ کرہ زمہریر کا چھوٹا سا نمونہ تھا آتش دان سرد۔آگ کا پتہ نہیں۔چاروں طرف اندھیرا اور سردی دو چار آدمی اس کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے اور سانسوں کی گرمی سے فضا میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے تھے۔ان میں سے ایک شخص بالکل خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا۔معلوم ہوتا تھا کہ سردی نے اس کو ٹھٹرا دیا ہے۔

ایک آدمی بولا "آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ شاید نہیں! آخر کیونکر پہچان سکتے ہیں کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔جب آپ گھر سے چلے آئے تھے تو میری شادی ہوئی تھی آپ کی بہن سے میرا نام زینسرو ہے آپ کی والدہ نے مجھکو یہاں بھیجا ہے۔بیچاری آپکے رخصت ہونے کے بعد آجتک اسی امید میں عمر کے دن گزار رہی ہے کہ کب اس کا بیٹا آئے تیس گرمیاں اور تیس سردیاں آپ کے انتظار میں اس پر بیت گئیں۔صبح سے شام تک وہ اسی خیال میں بیٹھی رہتی ہے اور شام سے صبح تک صرف یہی خواب دیکھتی رہتی ہے کہ اس کا بیٹا آگیا ہے۔آج نہیں آیا تو شاید کل آجائیگا اور برسوں تک واپس آجانے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔لیکن افسوس وہ غریب ہمیشہ مایوس ہوتی رہی۔مدتیں ہوگئیں اور آپ نہیں آئے نہ آپ کا کہیں پتہ لگا۔ناچار پچھلے مارچ میں آپ کا کھوج لگانے کے لئے پولس کا ہاتھ پکڑا اور اب دسمبر کے شروع میں اطلاع ملی کہ آپ یہاں ہیں۔محبت کی ماری آپ سے ملنے کو تڑپ رہی ہے اس کی خواہش ہے کہ آپ ضرور واپس آجائیں"

بوڑھا قیدی شرمندگی سے کچھ نہ بول سکا۔اس کی آنکھوں سے گرم گرم چمکدار آنسو اس کے سرد چہرے پر بہنے لگے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنا گزرا ہوا بچپن یاد آگیا جبکہ وہ اپنی پیاری ماں کے پاس اپنی بہن کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔مکان کے پیچھے جو پہاڑی تھی اس کے دامن میں دوستوں سے چہلیں ہوا کرتی تھیں اور اسکی چوٹی تک ایک سانس میں پہنچے

کی شرطیں بدی جاتی تھیں۔ وہاں کے کھیتوں کا وہ ہریالا پن وہ ان کے بیچ میں بہتی ہوئی نہریں۔ وہ مچھلیوں کا شکار۔ وہ وطن کی سہانی گرمی۔ وہ آزادی کی ہوا۔ اس کا حافظہ گزرے ہوئے واقعات دوہرا رہا تھا۔ تصویر کے بعد تصویر اس کے سامنے چلی آتی تھی۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ نہر کے کنارے کنارے چلا جا رہا ہے۔ جگنو پکڑے جا رہے ہیں۔ آہ وہ زمانہ وہ وقت!! باپ تین برس کا چھوڑ کر مر گیا تھا۔ ایک ماں کی ذات تھی جس سے زندگی کا سہارا تھا۔ تیس برس! آہ تیس برس سے اس کی صورت بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اس نے سلسلۂ تقریر شروع کیا۔

"اس نے یہ ساری مدت صرف تمہارا راستہ دیکھنے میں بسر نہیں کی بلکہ وہ سخت محنت کرتی رہی ہے۔ مامتا نے بڑھیا کو طاقت ور بنا دیا ہے۔ چار پانچ ہزار روپیہ اپنے ہاتھ پاؤں کی مشقت سے اس نے پیدا کر کے رکھ چھوڑا ہے اس خیال سے کہ تم جس وقت آؤ تو تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ پھر بھی تم واپس چلنے میں تامل کر رہے ہو۔ ماں کی ایسی محبت اور اتنا روپیہ بھی تم کو گھر چلنے کی ترغیب نہیں دیتا!"

محبت بھری ماں کا مجبور بیٹا دیر تک چپکے چپکے روتا رہا۔ دل گھٹ رہا تھا۔ دماغ آس اور یاس کے ہجوم میں پریشان تھا۔ وہ اپنے بہنوئی کو کوئی جواب نہ دے سکا اس نے صرف اس کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں کہا میں اپنی ماں کے پاس کس طرح جاؤں۔ میں اس کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ نہیں! یقینی نہیں......

وہ بیس برس کی عمر میں اپنی ماں اور بہن سے رخصت ہو کر ٹوکیوں چلا آیا تھا۔ اور ایک کارخانہ میں مزدوری کرنے لگا تھا۔ کئی سال تک برابر کماتا رہا اور معمولی اخراجات سے جو بچتا وہ اپنی ماں کو بھیج دیا کرتا۔ لیکن انہی دنوں میں بدقسمتی سے کارخانہ کے کچھ بدچلن لوگوں سے اس کا یارانہ ہو گیا۔ شراب پینی شروع کی یہ بری صحبتیں زیادہ رنگ لائیں تو آوارہ لڑکیوں کے گھروں کے چکر بھی لگنے لگے۔ چالیس پچاس روپے ماہوار کی آمدنی اور اس پر شراب نوشی اور تماش بینی۔ ہر وقت روپے کی ضرورت رہنے لگی۔ اس مفلسی میں عیاشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دفتر میں چوری کی۔ پکڑے گئے اور جیل پہنچے۔ اس بیس سال کی قید کا یہ آغاز تھا اس کے بعد سات مرتبہ اور سزا ہوئی اور اکیس برس تک قید خانے میں اسیری کی تکلیف اٹھایا گیا اب اس آخری قید کی مدت ختم ہونے والی تھی اور ایک مرتبہ وہ پھر قید خانہ چھوڑنے والا تھا۔ عارضی طور پر یا ہمیشہ کیلئے اس کی کسی کو کیا خبر۔ مدتیں گزر گئیں تھیں اس نے دو حرف بھی اپنی منتظر ماں کو نہیں لکھے تھے۔ وہ شرمندہ تھا اور اس پیام نے تو اسے ندامت کے دریا میں غرق ہی کر دیا۔ وہ کیونکر واپس جاتا۔ کس طرح اپنی ماں کو اپنی صورت دکھاتا۔ وہ اپنے بہنوئی کی باتیں سن رہا تھا لیکن جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ لیکن داروغہ جیل نے جو پاس ہی کھڑا ہوا یہ گفتگو سن رہا تھا متاثر ہو کر کہا "اللہ اللہ! اماں کی محبت کی بھی کوئی حد ہے؟ تیس برس تک اوہ! تیس برس تک اس پیرانہ سالی میں تکلیفیں اٹھاتی رہی اور کماتی رہی۔ صرف اس لئے اور محض اس غرض سے کہ جب اس کا بیٹا واپس آئے تو اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایسی ماں کا شکریہ ادا کرنا اولاد سے ممکن نہیں۔ کیا تم اپنی ماں کی اس محبت اور اس محنت کا شکریہ ادا کر سکو گے۔ یقین نہیں۔ بہر حال تم خوش نصیب ہو اور بہت ہی خوش نصیب ہو!" قیدی برابر روئے جا رہا تھا۔ اس کی زبان خاموش تھی۔ داروغہ نے قیدی کے منہ سے جب کوئی جواب نہ سنا تو اس نے اس کے بہنوئی سے پوچھا "رہائی کے دن آپ یہاں آئیں گے یا اس کی ماں؟"

"اس کی ماں کے ہمراہ غالباً میں بھی آؤں گا" قیدی کے بہنوئی نے جواب دیا۔ یہ سنکر داروغہ نے قیدی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا" پھر بھی تم اپنی ماں سے چھپتے رہوگے۔ اس کے پاس نہیں جاؤ گے؟

"میں واپس چلا جاؤں گا...... اس نے رونجھی آواز میں جواب دیا اور پھر اس کی آنکھوں سے جاری ہوگئے لیکن اب اس کی ہونٹوں کی جنبش میں خوشی کا رنگ تھا اور چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

آر۔ گاموہ

---

## "ترقی نمبر" کے متعلق معزز معاصر "زمانہ" کی گرامی قدر رائے

ناظرین کو معلوم ہے کہ کچھ عرصہ سے ترقی پسند مصنفین کی ایک آل انڈیا انجمن قایم ہوئی ہے جسکا مقصد ملکی ادب کو گذشتہ زمانے کے پامال وفرسودہ روش سے ہٹاکر نئے رخ پر لانا اسکو ملک کی روزمرہ زندگی کیلئے مفید و کارآمد بنانے کی کوشش کرنا ہے چنانچہ اردو کے متعلق الہ آباد۔ لکھنو دہلی وغیرہ میں اسکی شاخیں قایم ہوچکی ہیں۔ پچھلے ماہ اس انجمن کی تحریک پر اکثر مقامات میں روس کے نامور ادیب میکسم گورکی کے تعزیت میں یادگاری جلسے ہوئے۔

دہلی میں اس انجمن کی جو شاخ قایم ہوئی ہے اسکے پرجوش سکرٹری مسٹر شاہد احمد ایڈیٹر ساقی ہیں۔ چنانچہ انکے جوش عمل سے یہ شاخ خاص طور پر سرگرم کار رہے حال میں اس کے کئی جلسے بھی ہوئے جنمیں اس کے عام مقاصد کے مطابق قابل قدر مضامین پڑھے گئے اس شاخ نے ایک رسالہ بھی شاہجہاں کے نام سے جاری کیاہے جسکا ایک خاص نمبر پچھلے ماہ "ترقی نمبر" کے نام سے شائع ہوا ہے خادمان اردو کو اس پرچہ میں کئی قابل توجہ مضامین اور بہت سی کام کی باتیں ملیں گی۔

## شاہجہاں "ترقی نمبر" کے متعلق معزز معاصر "ہمایوں" کی گرامی قدر رائے

شاہجہان (دہلی) اس رسالے کا اگست ۱۹۳۶ء کا پرچہ ہمیں ریویو کیلئے موصول ہوا ہے۔ یہ اب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا رسالہ قرار دیا گیا ہے۔ زیر نظر نمبر میں شاہد صاحب کے دلچسپ "پیش لفظ" کے علاوہ ادب کی غرض و غایت پر منشی پریم چند کا وہ عالمانہ خطبہ درج کیا گیا ہے۔ جو انہوں نے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقدہ ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء میں بمقام لکھنو صدارتی خطبے کی حیثیت سے پڑھا تھا۔ اس کے علاوہ اردو ادب اور زندگی پر ممتاز حسین صاحب کا مضمون توجہ کے قابل ہے۔ ہم ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے کارکنوں کو خاص طور پر اس مضمون کے ان حصے کیطرف توجہ دلاتے ہیں جس میں واقعیت پسندی سے بحث کی گئی ہے۔ صاحب مضمون کہتے ہیں کہ "REALISM" کا مفہوم اگر زندگی کے متنوع پہلوؤں کی تصویر کشی ہے تو ظاہر ہے کہ کسی سنجیدہ آدمی کو اس کے خلاف ایک لفظ کہنے کی بھی گنجایش نہیں بلکہ ہم نے تمہید میں اس نظریہ کی تائید کی ہے۔ اور اس مضمون میں اسی حقیقت پر زور دیا ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ مگر اردو ادب کی بدقسمتی سے ہمارے یہاں یورپ زدہ نوجوان ہندستانیوں کا ایک ادبی گروہ ایسا بھی پیدا ہوگیا ہے جو چمنستان ادب کو اپنی ناآسودہ جنسی آرزوؤں کے "انگاروں" سے خاکستر کرنا چاہتا ہے اور انگریزی لفظ "REALISM" کا اس پر پردہ ڈال کر ادب میں اجتہاد کا دعویٰ دار ہے"

ہم ترقی ضرور چاہتے ہیں ہمیں اپنے قدامت پسندوں سے برسرپیکار بھی ہونا ہے لیکن اس کا یہ طریقہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اپنی سوسائٹی کی بنیادوں کو یکسر اکھیڑ کر سمجھ لیں کہ بس ہم نے ایک بڑا کام کر دیا اور ترقی کرلی۔

---

ملاحظہ: اکثر ادبی حلقوں میں ترقی پسند مصنفین کیطرف سے یہ بدگمانی پھیل گئی ہے کہ اس انجمن کا واحد مقصد ہندوستانی سوسائٹی کی قدیم روایتوں کی بیخ کنی ہے ہم اپنے مقاصد کا کئی بار اعادہ کرچکے ہیں [illegible] سالنامہ شاہجہاں کے بعض مضامین وضاحت سے سارے مقاصد کی تشریح کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ اب اس غلط فہمی کی گنجایش نہیں رہےگی۔

# اپنا بچہ

از جناب سید ممتاز حسین بی، اے۔ بی ٹی دہلوی

## افرادِ تمثیل

ناظم .. .. .. .. .. .. .. ایک کلرک
محسنہ .. .. .. .. .. .. .. ناظم کی بیوی
رحمت .. .. پچاس سال کی ایک بڑھیا جسکی دس سالہ نواسی ناظم کے گھر میں اوپر کا کام کرتی ہے
مکرجی بابو .. .. .. .. .. ناظم کے دفتر کا ہیڈ کلرک
لالہ کنہیا لال .. .. .. .. .. .. ] ناظم کے دفتر کے دو کلرک
پنڈت شام لال .. .. .. .. .. .. ]

---

## پہلا سین

دہلی کے ایک تنگ محلہ میں چھوٹا سا ایک مکان ہے سامنے ایک کمرہ ہے۔ کمرہ کے بائیں جانب صحن سے ملا ہوا ایک مختصر سا دالان ہے، کمرہ کے مقابل گلی کے رخ ایک بہت چھوٹا سا دالان باورچی خانہ کا کام دیتا ہے۔ اس دالان سے ملی ہوئی ایک تنقیہ دیوار کے سہارے ایک گھڑونچی پر دو مٹکے رکھے ہوئے ہیں انگنائی میں ایک چارپائی پر تین سال کا بچہ پڑا سو رہا ہے۔ محسنہ چولہے کے نزدیک بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے پانچ بجے شام کا وقت ہے۔ ناظم بائیسکل لئے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ کمرے کے برابر والے دالان میں بائیسکل رکھکر محسنہ کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

ناظم۔ ابھی تک کھانا بھی تیار نہیں ہوا؟

محسنہ۔ ہنڈیا بھن رہی ہے۔ آپ منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ ابھی آدھ گھنٹہ میں ہوا جاتا ہے۔

ناظم۔ آدھ گھنٹہ کی کسے فرصت ہے۔ اکاؤنٹ کمبخت ابھی تک نہیں ملا۔ کل رات آٹھ بجے تک بیٹھا۔ آج سویرے ہی سے چلا گیا تھا۔ اکاؤنٹ ہے کہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آتا۔ اس خبیث ہیڈ کلرک سے تو توبہ ہی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بمشکل کھانا کھانے کیلئے آدھ گھنٹہ کی اجازت لیکر آیا ہوں۔ ان بنگالیوں کا خمیر تو شاید خدا نے دفتر کے بوسیدہ کاغذوں ہی سے بنایا ہوگا جو صبح سے آکر بیٹھتے ہیں چاہے رات ہو جائے اللہ کے بندے گھر جانیکا نام نہیں لیتے۔ دن بھر اینڈتے پھریں گے۔ شام کو کاغذ لیکر آبیٹھیں گے افسروں کو دکھانے کے لئے کہ بڑا کام ہے ان کے پاس ڈینا ہے اور مکر یہ غضب تو یہ ہے کہ دوسروں

سے بھی چاہتے ہیں کہ دیر تک بیٹھیں - ہاں وہ بجو چڑیل آج بھی
نہیں آئی ؟

محسنہ - کہاں آئی - ہمسائی کے بچہ کو بلانے کے لئے بھیجا تھا بڑھیا
نے کہلا بھیجا کہ آج شام کو لیکر آؤنگی - ابھی تک تو نہ وہ لڑکی آئی
نہ بڑی بی - بچہ دوپہر سے بخار میں ہلکان ہو رہا ہے - اس کیلئے
دوا تک لانیکو کوئی نہیں -

ناظم - ایسا کیا اُس کے ہاتھ میں بھالا لگ گیا تھا کہ زخم آج چھ
دن سے بھرتے ہی کو نہیں کہتا - کیا اوپر کے کام کاج کیلئے
اس کے ہاتھ ٹوٹ رہے تھے - نمک حراموں کو روٹیاں لگ
گئی ہیں - بھوکے مریں گے تو ساری نزاکت جاتی رہے گی آج
اگر وہ بڑھیا آئے تو اُس سے کہدینا کہ ہمیں اِس کی ضرورت
نہیں - تو اِسے رانی بنا کے گھر میں بٹھا - ہم کسی اور لڑکی کا
انتظام کرلیں گے -

ناظم کپڑے اتار کر منہ ہاتھ دھونے کے لئے
بیٹھ جاتا ہے - محسنہ پٹاری کھول کر پان بنانے
لگتی ہے - اتنے میں بڑھیا رحمت اپنی بجو کو
لئے گھر میں داخل ہوتی ہے -

محسنہ - اے ہے - بڑی بی - تم نے تو لڑکی کو چھوئی موئی کا
درخت بنا رکھا ہے - انگلی میں ذرا سی تکلیف کیا ہوئی کہ اُس
نے چھ دن سے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا - ہم ذرا ذرا سے
سودے سُلف کو تنگ ہیں - اور تم لوگوں کو ذرا خیال
نہیں -

ناظم - (منہ دھوتے ہوئے) جاؤ بی - لے جاؤ، اسے یہاں
سے - ہم جس کی ناک پر نکار رکھیں گے - وہ ہزار دفعہ کام
کرے گا - تین روپیہ اور کھانا آجکل یوں آسانی سے نہیں مل
جاتا - صبح سے شام تک خون پسینہ ایک کرتے ہیں جب جاکر
پچاس روپئے ملتے ہیں - یوں ذرا سی تکلیف میں اگر گھر بیٹھ
رہیں تو دوسرے دن جواب مل جائے -

بڑھیا - بیٹا خدا کی قسم - اس کے ہاتھ میں ایسی ٹیسیں ہو رہی
ہیں کہ اس نے پانچ دن سے سر تک نہیں اٹھایا - اس کی وجہ
سے اُسے بخار بھی ہو گیا تھا - نہیں تو اسے کیا میں نہ بھیجتی -
بچپن سے تمہارے ہاں کام کرتی ہے - کبھی اُس نے کام کاج
سے دل چُرایا ہے - ہرج مرج تو خدا ہی دیتا ہے تم دیکھو اب
بھی اس کی انگلی سُوج رہی ہے -

ناظم - انگلی سُوج رہی ہے تو علاج کراؤ اس کا - ہم کب تک
راہ دیکھا کریں کہ بیگم صاحبہ کو آرام ہوگا تو کام کاج کو آئیں گی

بڑھیا - چاند - یہ دُکھیاری اگر بیگم ہوتی تو آج جلکارے ہی
کیوں کھاتی - اور گھر گھر کے دھکے کیوں کھاتی پھرتی - پر صدقہ
اس کا کوئی قصور بھی تو نہیں - بیماری تو اپنے بس کی بات نہیں

ناظم - بڑی بی تمھیں اس سفید چونڈے پر جھوٹ بولتے شرم
نہیں آتی - چھ دن سے ایسی تکلیف ہے کہ اوپر کا کام کاج بھی
نہیں کر سکتی تھی - یوں کہو نہ صاحزادی کو منہ چڑھا رکھا ہے
اور ہم کچھ کہتے سُنتے نہیں - جاؤ لیجاؤ اسے - میں ہرگز نہیں
رکھوں گا -

محسنہ - (روٹی ڈالتے ہوئے) اب جانے بھی دیجئے - آئندہ
خیال رکھیں گی -

ناظم - تمھیں نے تو ان کمینوں کو سر پر چڑھایا ہے - میں ہرگز...

بڑھیا - بیٹا غریب ہو کر کوئی کمین نہیں ہو جاتا - خدا کی قدرت
ہے آج ہمارے سر پہ کوئی نہیں رہا - اور ہم محنت مزدوری
کرنیکی وجہ سے کمین کہلائے - تم جیسے شریفوں کے کہنے کی یہ
باتیں نہیں - (لڑکی سے) آ بیٹی - خدا کے ہزار ہاتھ ہیں - وہ
ہزار طریقوں سے دیتا ہے (چلتے چلتے خود سے) یوں ذرا سی
بات پہ اگر وہ رزق بند کرلیا کرے تو دنیا میں سب بھوکے
مرجائیں -

(گھر سے باہر نکل جاتی ہے۔ ناظم کھانا کھانے کیلئے بیٹھ جاتا ہے)

ناظم۔ (محسنہ سے) دیکھا تم نے اس بڑھیا کا تیہا کیسی گئی ہے بگڑ کے۔ گویا ان تلوں تیل ہی نہیں۔ بڑی بجرگی ہے شریف کہیں کی۔

محسنہ۔ اے ہے۔ خدا جانے آج آپ کو کیا ہو گیا۔ ذرا سی بات پر برس پڑے۔ تھوڑا بہت کہہ سن کے چپ ہو رہتے گالیوں پر اتر آئے۔

ناظم۔ گالیاں کس نے دی ہیں اُسے۔ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا کہیں۔

محسنہ۔ اے لو۔ اب مجھ پر تنز کرگرا۔ کسی کو کمین کہنا گالی نہیں تو اور کیا ہے۔

ناظم۔ وہ تو بڑی سیدانی ہے۔

محسنہ۔ اب دنیا میں صرف سید ہی تو شریف نہیں ہوتے۔

ناظم۔ اچھا تم میرا دماغ تو کھاؤ نہیں۔ میں خود ہی پریشان ہو رہا ہوں۔

(محسنہ خاموش ہو جاتی ہے۔ ناظم کھانا کھا کر کپڑے پہننے میں مشغول ہو جاتا ہے اور محسنہ روٹی چھوڑ کر پان بناتی ہے۔ ناظم بائیسکل اٹھا کر چلنے لگتا ہے۔)

محسنہ۔ پان تو کھاتے جائیے۔

(ناظم بغیر جواب دیئے گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔)

## دوسرا سین

(دفتر کا ایک کمرہ۔ چاروں طرف لوہے کی الماریوں میں موٹے موٹے گرد آلود فائل لگے ہوئے ہیں۔ ایک طرف رجسٹروں کا انبار ہے۔ ہیڈ کلرک کی میز کے سامنے گھنٹہ لگ رہا ہے۔ ہیڈ کلرک کے سامنے ڈیسکوں کے پیچھے دو کلرک بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ بجلی کی روشنی ہو رہی ہے۔ ناظم داخل ہوتا ہے۔)

ہیڈ کلرک۔ (گھنٹہ کی طرف دیکھتے ہوئے) مسٹر ناظم آپ نے تو بڑا دیر کیا۔ اگر کل بھی اکاؤنٹ جانا نہیں سکے گا تو چاکری تو جاتا رہیگا۔ ڈی۔ اے۔ جی تو بڑا ہارڈ ہے۔ آپ تو کہتا تھا کہ "ہاف این آور" میں آئیں گا۔

ناظم۔ اجی صاحب۔ آخر جانے آنے میں وقت بھی لگتا ہے یا نہیں؟

ہیڈ کلرک۔ ارے ددا! بہا مشکل ہے۔ آپ سنا ہوگا کل ڈی۔ اے۔ جی نے روتی بابو کا ایکسپلینیشن کال فار کیا ہے۔ وہ تو جان نہیں چھوڑے گا۔ ہمارا تمہارا چاکری جاتا رہیگا۔

ناظم۔ صاحب تو میں اس چاکری کو کیسے پکڑوں۔ جاتا رہیگا تو میرے بس کی کیا بات ہے۔ آپ کے سامنے کئی دن سے متواتر پل رہا ہوں۔ مل جائے تو ابھی مل جاتے۔ ورنہ نہ جانے کے دن لگ جائیں۔

ہیڈ کلرک۔ مسٹر ناظم۔ آج آپ اسے کر کے جائیں۔ مسٹر کنھیا اور مسٹر لال آپ کا ہیلپ کریں گے۔ کتنا ٹیک ہے

ناظم۔ چھ پائی ڈیبٹ میں کم ہیں۔

ہیڈ کلرک۔ مسٹر لال دیکھئے کہیں ٹوٹلنگ میں مسٹیک ہوگا۔

(شام لال اور کنھیا ناظم کی میز کے قریب کرسیاں کھینچ کر بیٹھ جاتے ہیں)

شام لال۔ (ناظم سے سرگوشی کی آواز میں) یار کر کرا کر

الگ کرنا۔

ناظم۔ کس طرح کروں۔ یہ نا ہنجار چھ پائیاں مل کر ہی نہیں دیتیں۔ اب یہ وو چروں کا انبار بے تمیزی پڑا ہے انھیں پھر چیک کرنا شروع کردو۔ یہی ہو سکتا ہے۔

کنھیا۔ چیک کرنا شروع کردو۔ کیا آسان کام ہے (شام لال سے) صبح سے اِس سے کہہ رہا ہوں کہیں ان چھ پائیوں کو لکھ لکھا کر الگ کر۔ مگر یہ تو کچھ ایسی موٹی سمجھ کا آدمی ہے کہ اسکی کھوپری ہی میں نہیں بیٹھتا۔ بڑا ایماندار بنا پھرتا ہے۔ ارے یار دفتروں کے کام اسی طرح چلتے ہیں ان مسلمانوں کو دفتروں کے کام کرنیکا کبھی بھی سلیقہ نہیں آنیکا۔ یہ خواہ کہیں تلوار چلا ڈجاکے۔ یہ دو وادر دو چار کرنا تمھارے بس کا کام نہیں۔

ناظم۔ ارے ہم تو بہتیری تلوار چلائیں۔ مگر تم چلانے بھی دو اگر ہمارا جوش، ولولہ اور زرخیز دماغ اور تمھاری معاملہ فہمی، زمانہ شناسی اور تدبر مل جائے تو ہمیں یہ دن ہی دیکھنے کیوں نصیب ہوتے۔

شام لال۔ بھئی یہ تلوار بازی کا موقع نہیں ہے۔ اکاؤنٹ ملاؤ۔ رات ہو رہی ہے۔

کنھیا۔ مسٹر ناظم۔ لاؤ ان ابس ٹریکٹ (Abstract) مجھے اٹھا دو۔ میں ابھی اکاؤنٹ ملائے دیتا ہوں۔

(کنھیا رجسٹر لے کر ایک خانہ میں چھ پائی بڑھا دیتا ہے)

کنھیا۔ (ہیڈ کلرک سے) مسٹر مکرجی! لیجئے چھ پائیاں مل گئیں۔ یہ ناظم صاحب صبح سے جھول رہے تھے اس کے اوپر

ہیڈ کلرک۔ ویل ڈن۔ مل گیا۔ اب اسے کمپلیٹ کر دیجئے

ناظم۔ صاحب اب نہیں ہوتا۔ اب صبح کریں گے۔

شام لال۔ ہاں صاحب اب تو دماغ تھک بہت گیا۔

ہیڈ کلرک۔ مسٹر ناظم۔ آٹھ بجے آئیں گا آپ؟

ناظم۔ بہت اچھا صاحب آجاؤں گا۔

(تینوں اٹھ کر چل دیتے ہیں۔ ہیڈ کلرک فائلوں کا پشتارہ سائیکل کے پیچھے باندھ کر خود بھی چل کھڑا ہوتا ہے۔)

## تیسرا سین

(ناظم کا گھر محسنہ بچے کو بازوؤں پر اٹھائے کمرے کے وسط میں نہایت بے چینی سے ٹہل رہی ہے۔ بار بار بچہ کا منہ تکتی ہے۔ اور پھر منتظرانہ نگاہوں سے دروازہ کیطرف دیکھتی ہے۔ بچہ بخار میں بلبلا رہا ہے۔ اور کبھی کبھی نہایت ویران آنکھوں سے دیوار اور چھت کی طرف دیکھتا ہے......

دروازہ پر کھٹکھٹاہٹ ہوتی ہے محسنہ بچہ کو گود میں لئے دروازہ کھولنے جاتی ہے۔

ناظم سائیکل لئے داخل ہوتا ہے۔)

ناظم۔ کیوں یہ آج ابھی تک سویا نہیں۔ اب اس کا بخار کیسا ہے۔؟

محسنہ۔ ذرا دیکھو تو اس کے دشمنوں کی طبیعت تو بہت ہی خراب ہو رہی ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں کبھی چونکتا ہے کبھی گھبرا کر آپ کو آواز دیتا ہے۔ کئی دفعہ دادا کو پکار چکا ہے ابھی ہنس ہنس کر چھت کی طرف دیکھکر اشارے کر رہا تھا۔

(ناظم گھبرا کر بچہ پر جھک جاتا ہے کبھی ہاتھ ماتھے پر رکھ کر بخار کی کیفیت دیکھتا ہے۔ کبھی بچے کے تلوے چھوتا ہے۔)

ناظم۔ اسے کچھ دوا بھی دی؟

محسنہ۔ اسے تین دن سے قبض ہے۔ ارنڈی کا تیل پلایا تھا۔ . . . . مغرب کے وقت سے اس کی طبیعت بہت خراب ہونے لگی۔ گھبرا گھبرا کر مجھے لپٹا جاتا تھا۔ اوپر والی ہمسائی کو میں نے آواز دی۔ ذرا کسی سے تیل منگا دو معلوم نہیں بڑی بی کہاں سے آگئیں۔ شاید اوپر ہی بیٹھی ہوں گی۔ خدا بھلا کرے اُن کا۔ بھاگی بھاگی گئیں۔ اور ذرا کی ذرا میں لوٹ آئیں۔

ناظم۔ تو پھر اسے اجابت ہوئی۔ دیکھنا یہ اس کی آنکھیں کیوں ایسی کو یران ہو رہی ہیں۔ ارے یہ تو ہنس رہا ہے۔ اچو بیٹے اچن دیکھنا ادھر۔

(بچہ ماں سے لپٹ جاتا ہے)

محسنہ۔ اِس کا دل تو دیکھو کیا تیزی سے دھڑک رہا ہے۔

ناظم۔ اسے اجابت بھی ہوئی؟

محسنہ۔ نہیں تو جب سے تیل پیا ہے اسکی طبیعت اُس وقت سے اور بھی زیادہ بگڑ گئی۔ ذرا سی دیر کو سکون نہیں ہوا بڑی بی سے دودھ بھی منگا کر پلا لیا۔ مگر افاقہ ہی نہیں ہوتا۔ خدا معلوم کیا ہو گیا ہے۔

(بچہ کی آنکھیں اوپر کو چڑھ جاتی ہیں بے چینی کے عالم میں ہاتھ پیر مارتا ہے۔ محسنہ اس کو گود میں لئے پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر شوہر کی طرف دیکھتی ہے۔ ناظم سراسیمہ ایک نہایت گہری سوچ میں کھڑا ہے۔ نگاہیں دیواروں سے دور کسی چیز کو دیکھ رہی ہیں۔ آنکھوں میں نمی آچلی ہے۔ گھٹنوں میں خم آیا۔ اور وہ جھک گیا۔ دور بہت دور کسی غیر متعین شے کو دیکھتے ہوئے)

ناظم۔ نہیں نہیں۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈال۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ یہ ہماری زندگی کی تنہا دلچسپی ہے۔ سنسان ہو جائے گی۔ بار الٰہا ہماری دنیا ویران ہو جائے گی۔

(خاموش ہو جاتا ہے۔ کسی سوچ میں ہے۔ یکایک چہرے پر ایک ایسی چمک جیسے اندھیرے میں اُجالا ہو جائے۔ اور آنکھوں میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔)

اے رحیم میرے لئے یہی کافی ہے۔ میں نے درگذر نہیں کیا تو درگذر کر دے۔ مجھے ایک موقعہ اور ......

(بچہ کو اُلٹی ہوتی ہے۔ ناظم گھبرا کر اٹھتا ہے۔ محسنہ بچہ کو انگنائی میں الٹی کراتی ہے۔ پھر منہ ہاتھ دُھلا کر اندر لاتی ہے۔ بچہ آنکھیں کھول دیتا ہے)

ناظم۔ اچو بیٹے۔ چچی کھائیگا۔

بچہ۔ (مسکرا کر) ابا!

ناظم۔ (محسنہ سے) دیکھنا صبح بڑی بی کو بلا لینا۔

**پردہ**

**ممتاز حسین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی**

ترقی پسند مصنفین انجمن دہلی میں پڑھا گیا۔

# جھونپڑی

اس پہلی پہلی اساڑھ میں ہی تو کیوں رو پڑی جھونپڑی؟
پُوربی افق پر بادل کا ایک ٹکڑا نظر پڑا۔ کسان کے حلق سے بارہ ماسا پھوٹا۔ گوریا دم زدن میں کلیل کرنے لگی بچوں کی چہل پہل سے آنگن نہال ہو اٹھا۔ "آجا ہیگھا پانی دے —— رم جھم۔ رم جھم —— رم جھم۔ رم جھم!!

تپی ہوئی زمین سے سوندھی مہک اٹھی! دھلی دوب پر بکری کے بچے اچھلے، گوریئے چونچ سے چونچ ملاتے چہک پڑے اچھے اپنی "کاگد" کی ناؤ پر ساتت سمندر پار کرنے کی تیاری کرنے لگے!
چاروں طرف ہریالی —— چاروں طرف ٹھنڈک مسرت اور کیف
لیکن اس پہلی پہلی اساڑھ میں ہی تو کیوں رو پڑی جھونپڑی —— ؟

دیکھ تیری ہی بغل میں وہ تیری سوت اٹھلا رہی ہے بارش سے نہا دھو کر اُس کے کنگورے خوشیاں منا رہے ہیں۔ دیکھ اُس کے اندر سے مبارکباد کا نغمہ پھوٹ کر ساری دنیا کو پاگل بنانے چلا۔
آج وہاں برشگال کا تیوہار منایا جائے گا ——
مہمانوں کے عطر میں بسے زرق برق لباسوں سے، نغموں کی موسیقی سے ہنسی مذاق، دل لگی کے میٹھے قہقہوں سے، چوڑیوں کی کھن کھن اور ساڑوں کی جھنکار سے زمین اور آسمان اترا جائیں گے ——
تو رو رہی ہے —— اور اُس وقت بھی شاید روتی ہی رہیگی جب یہاں کی رنگ رلیاں پوری بہار پر ہوں گی!

چھوٹی سی پھونس کی جھونپڑی! اس پہلی اساڑھ کی خوشی کی گھڑی میں ہی رو پڑی؟ کیا کرتی بے چاری؟
آج تین برس سے اس کے چھپر پر ایک تنکا نہیں پڑا۔ اسکا مالک دن رات ایک کر کے ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کر کے۔ دھوپ برسات، جاڑا ایک کر کے بھی اسکے لئے ایک مٹھی تنکے کا سامان نہ کر سکا!
اساڑھ کی اس پہلی بارش کو بے چاری برداشت نہ کر سکی —— نہ کر سکے گی۔
اس کی چھاتی چھد گئی۔ چھند کیا گئی، چھلنی ہو گئی —— وہ رو پڑی بیچاری —— !

رو پڑی بے چاری جھونپڑی —— رو پڑی جھونپڑی کی رانی!
چار مہینے کی برسات سامنے —— چار جانوں کو یہ بھیانک مہینے کاٹنے ہیں۔ اپنے دکھ کی کیا فکر؟ پر وہ بڑھیا کیسے بچے گی۔ جسکی گدڑی آج ہی بھیگ گئی —— اور وہ بچیا —— پھول سی بچیا —— کیسے رہیگی، جو گود میں چھپکر بھی بھیگنے سے نہیں بچ سکتی۔
جھونپڑی کی رانی رو رہی ہے —— اسکے آنسوؤں کی

لڑیاں چھیر کے ان گنت چھیدوں سے، عریانی کے وسیع آنچل سے گر گر گر گر کر گر رہی ہیں۔

---

اور ان آنسوؤں کی دردناکی میں اور اضافہ کر رہی ہے، اس مینارے کی ہنسی!

ایک ساتھ مرنا بھی جشن ہے، لیکن ایک طرف جشن اور دوسری طرف آنسو ـــــ یہ تو زندگی کو بھی موت بنا دیتی ہے۔

پھر اگر جشن ہی کسی کے آنسو کا باعث ہو، تب؟
یا کسی کے اشکوں کی قیمت پر ہی کوئی جشن مناتے، تب؟؟

---

اس عالی شان محل کی نیو میں کس کی پوری زندگی دفن کی گئی؟

اس عالی شان محل کی اینٹیں اور گارا کس کی ہڈیوں اور خون سے بنے؟
یہ جو سنہرا کنگورا چمک رہا ہے، اس پر کس کی ہنسی چھین کر جلا کی گئی؟
مہمانوں کی خوشی میں کس کی آس مہک رہی ہے۔؟
اس مبارک باد میں کس کی کسک، اس نغمہ میں کس کی چیخ، تڑپ رہی ہے؟
چوڑیوں کی کھن کھن، اور ساز کی جھنجھناہٹ ذرا سچ بتا کس کے دل چیر کر تم میں یہ نشیلے نغمے بھرے گئے؟؟

---

بے چاری جھونپڑی کی رانی رو رہی ہے! رونا ہی تو اسکا کام ہے!
عالی شان محل ہنستا ہے۔ اسکے لئے یہ ضروری ہے کہ جھونپڑی روتی رہے۔

رام برکشا بینی پوری

---

# واجپیئوں کا باغ

از جناب میرزا فہیم بیگ صاحب ۔ فہیم چغتائی

(۱)

قصبۂ آنتری (ریاست گوالیار) کے مشرقی رُخ، اس گڑھ واٹ پر جو دراصل وہ شاہی راستہ ہے جس سے اگلے وقتوں میں آگرہ دہلی کے قافلے دکن کو جایا کرتے تھے، ایک ویران باغ میں منقش مندر، کچھ گری پڑی عمارتیں اور کنواں وغیرہ ہیں۔

گو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے میں نے آنتری کے چھ پھیرے کئے، اور ساتویں بار بھی یہی اتفاق ہوا، لیکن کیونکہ وہ سمت موجودہ شارع عام سے بچی ہوئی ہے، اس طرف میری توجہ نہ گئی۔

۵ اردسمبر ۱۹۳۴ء کو جب میں عزیز سید امتیاز علی صاحب فخر وکیل ہائیکورٹ لشکر کے گھر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا، ماسٹر رمضان خانصاحب تشریف لے آئے، سلام دعا خیر و عافیت کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، وہ بولے۔ کیوں صاحب آپ نے واجپیئوں کا باغ بھی دیکھا۔

"واجپیئوں کا باغ"، کہاں ہے؟ میں نے پوچھا۔

**ماسٹر صاحب**۔ (اشارہ کرکے) یہیں، اس گڑھی کے پیچھے!

**میں**۔ کیا وہاں کوئی قابل دید چیز ہے؟

**ماسٹر صاحب**۔ کیوں نہیں، ویسے وہ باغ تو اب اُجڑ اجڑا گیا، اس کی عمارتیں بھی بہت کچھ منہدم ہو چکیں، باقی ماندہ شام سویرے کر رہی ہیں، تاہم وہاں کا ایک مندر ضرور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

**میں**۔ ایسی اس میں کیا بات ہے؟ اچھا ذرا ایک آدھ خوبی تو بیان کیجئے!

**ماسٹر صاحب**۔ ایک آدھ کیا بیسیوں خوبیاں، بس کمال ہے، اوّل تو اس کی بیرونی ساخت کا ہی کیا کہنا، گویا سانچے میں ڈھال دیا، اس پر اندرونی دیواروں کو اتہیاسک (تاریخ) اور پورانک (مذہبی) کتھاؤں (روایتوں) کی تصاویر نے وہ چار چاند لگائے ہیں، کہ واہ واہ! ایک دفعہ کو یہ مزا آتا ہے، گویا اب سے قرنہا قرن پہلے کی دنیا میں پہنچ گئے، جو کچھ بزرگوں سے سُنا، یا پرانی کتابوں میں پڑھا تھا، آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

---

مدرسے کا وقت آگیا تھا، اس روز تو وہ چند منٹ سے زیادہ توقف نہ کر سکے، بات ادھوری چھوڑ، "کل" آنے کا وعدہ کرکے رخصت ہو گئے، "کل" یعنی دوسرے دن تھا۔ "اتوار"، گویا صرف ماسٹر صاحب ہی نہیں، تمام سرکاری درباریو کی چھٹی تھی، کوئی نو ساڑھے نو بجے کے قریب، حسب وعدہ ماسٹر صاحب تشریف لائے پھر چند احباب مل کر اس باغ کی سیر کو روانہ ہوئے۔

صوبات بلڈنگ کے بائیں پہلو اور دھرم سالہ کی درمیانی پگڈنڈی سے گزر کر ایک آتار طے کرنے پر وہی گڑھ واٹ آئی، جس کا ذکر کر چکا ہوں، یہاں سے وہ باغ کچھ زیادہ دور نہ تھا، گڑھی کی خشک کھائی کے بعد دس پندرہ قدم پر ایک اونچا سا قطعہ نظر آیا، اور ٹوٹی پھوٹی منڈیر دکھائی دی، جو

گرد واٹ کے داہنے بازو کی سو فدم پتلی تھی، بات چیت کرتے بہت جلد ہم سب اس مندر کے سامنے جا کھڑے ہوئے جس کے اشتیاق میں چلے تھے۔

(۳)

دور سے تو اس مندر پر کوئی خاص خوبی معلوم نہ ہوتی تھی، نزدیک پہنچ کر جو نگاہ ڈالی تو ویسا ہی پایا، جیسا ماسٹر صاحب سے سنا تھا۔

یہ ایک مربع چہار دیواری پر ہشت پہلو مخروطی گنبد والی عمارت ہے جن کے ہر ضلع پر عجائب و غرائب نقوش اور جس کی چہار دیواری کے ہر ہر رخ پہ تین تین خوشنما محرابیں کاریگر کے سلجھے ہوئے مذاق کا اظہار کر رہی ہیں۔

مشرقی سمت دائیں بائیں محرابوں کے نیچے رچھینی سے ایسے نقوش نمایاں کئے ہیں، گویا سبک سبک جوڑیاں پڑی ہیں، درمیانی محراب کے زیر سایہ مندر میں جانیکا دروازہ ہے، جس میں کواڑ وغیرہ کچھ نہیں باقی تین پہلو بھی ایسی ہی محرابوں سے مزین کئے گئے ہیں، البتہ ان کی درمیانی محرابوں کے نیچے دروازے نہیں، بڑے بڑے مستطیل روشن دان ہیں، ان پہلوؤں میں سے دو تو صحیح و سالم رہ گئے، شمالی دیوار روشن دان کے پاس سے مندر کی کرسی تک ڈھہ پڑی۔

مربع چہار دیواری کے خاتمہ اور گنبد کے درمیان چاروں طرف چھجّا ہے، اس چھجّے کے نچلے سرے پر منقش نقو جڑے ورگلکاری کے تودوں میں بیٹھے ہوئے شیر بنے ہیں۔

---

چھجے کے بعد کرسی نما تھوڑا سا کسکا[1] دیکر چاروں کونوں پر مخروطی گنبد کی چھوٹی چھوٹی مٹھوں میں چونے کے سادھوؤں کی مورتیں بٹھائی ہیں، ان میں سے سید ہے ہاتھ والی مٹھ میں جس کا کلس ٹوٹ گیا، ایک جٹا دھاری سادھو سنکھ پھونکتا دکھایا[2] گیا ہے، الٹے ہاتھ کی مٹھی کھمبوں کے پایوں تک مسمار ہو گئی، علی ہذا القیاس پچھلے رخ کی مٹھیں بھی اصل حالت میں قائم نہ رہیں، لیکن ان میں بیٹھے ہوئے دو شاخہ ڈاڑھیوں والے بانے بند سادھوؤں نے اپنے اپنے آسن نہ چھوڑے۔

ہر کونے والی مٹھ کے دائیں بائیں بھی چونے کا ایک ایک سادھو نرالے انداز میں موجود ہے، مزید بر آں مشرقی سمت بیچوں بیچ چھجے کے اوپر سیندھیا شاہی پگڑی والا مہاوت ہاتھی کی کلائے[3] پر بیٹھا آنکس[4] لگا تا دکھا کر عمارت کی کشش دو چند کر دی۔

یہی نہیں ظالم صناع نے کوئی پہلو نہ چھوڑا، سید ہے رخ ایک بندہ بڑی آن بان سے گھوڑے پر سوار کرایا، پچھلی جانب لشکری پگڑی والا فیبان ہاتھی کی گردن پر چڑھایا، شمالی سمت بھی ایک گھوڑے پر آدمی بٹھایا تھا، سو افسوس دستبرد زمانہ سے مرکب کی اگلی ٹانگیں ٹوٹ گئیں، سوار کا سیدھا ہاتھ منقطع، اور سر ندارد ہے۔

---

کونے والی مٹھوں کے نیچے، سامنے والے چھجے پر چونے کے بڑے بڑے کھڑے ہوئے، اور پچھلی طرف بیٹھے شیر بنائے ہیں، مندر کا گنبد سادہ نہیں، یہاں بھی استادی سے نہ چوکا، یعنی عمارت کے چوطرفہ پانچ پانچ برجیوں والے چھوٹے چھوٹے مندروں کے نقوش نمایاں کر دئے، پھر اصل گنبد میں چونے کے ابھارسے آٹھوں پہلوؤں پر علی الترتیب کچھ اس طرح مندر چننا چلا گیا ہے، جیسے سچ مچ کی ہی عمارتیں ہوں نیز ہر پہلو پر ان پانچ پانچ برجیوں والے مندروں اور بڑے گنبد کی اونچائی میں آٹھ سادھوؤں کا حلقہ بٹھا کر ان کے سروں سے اندازۃً ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ اونچائی پر لنگور چڑھا دئے

---

[1] قشقہ [2] ہاتھی کی گردن [3] ہاتھی کو ہانکنے کا آلہ جو فوجدار کے پاس ہوتا ہے۔

ہیں، بھلا ایسا نظر فریب منظر کہاں تک اثر نہ کرے، اور کیوں نہ انسان دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ جائے۔

(۳)

بیرونی ساخت کے عجائبات پر نظریں جمائے میں نے اس مندر کے کتنے ہی چکر کاٹے، جب اچھی طرح دیکھ بھال چکا، تو باہر کے چبوترے پر (احتراماً) جوتہ اُتار برہنہ پا عمارت میں داخل ہوا، اس کے درمیان ایک چھوٹا سا کُنڈ (حوض) ہے جس کے وسط میں مہادیو جی کی پنڈی نصب، کنڈ کے باہر جانب جنوب نادیہ، کنڈ کے اندر داہنے رُخ ہنومان بجرنگ کی پہاڑ اٹھائے ہوئے مورتی، اس کے بالمقابل مہادیو جی کے ہاتھ جوڑتی ہوئی پاربتی جی، اور ان کے سیدھے بازو پر گنیش جی پدمارے ہوئے ہیں۔

---

جس گنبد کی بیرونی ساخت مخروطی تھی، اس کی اندرونی بناوٹ ہمواری پائی گئی، گنبد کے مرکز سے چوبیس پنکھڑی کے ایک دیدہ زیب رنگین پھول میں، قد آدم سے کسی قدر بلند زنجیر لٹکی ہوئی ہے، اس میں آرتی کے وقت بجانیوالی گھنٹی آویزاں ہوگی، اب وہ تو نہ جانے کیا ہوئی نری زنجیر ہی رہ گئی، مرکزی پھول کے بعد بارہ پنکھڑی کا ایک ایسا پھول ہے، جس کی جاذب نظر پنکھڑیوں میں عنابی زمین دیگر خوشنما گلدستے بنائے ہیں، پھر گنبد کے آدھے سے زائد حصّے تک نیلی اور عنابی زمین دے دے کر اتار چڑھاؤ کے رنگین گل بوٹے کاٹتے کاٹتے ایک سنگھاڑے دار اُبھری ہوئی کنگنی کے نیچے سے اتھیاسک اور پرانک مرقع جات کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔

---

روازے کے سامنے یعنی مغربی سمت جگدیش، سبھدرا اور بَل داؤ جی بیٹھے ہوئے ہیں، بائیں طرف کرشن جی کنس کی چوٹی پکڑے گجا (گرز) مارتے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد لکشمن جی کا کندھے پر کمان رکھے مورچھل کرنا درمیان میں سیتا جی جلوہ افروز، اُدھر رام چندر جی براجمان، سرے پر ہنومان جی کا سیتا کے پیر چھونا، اور رگھبر کا انکے سر پہ دست شفقت رکھنا۔

چوتھا مرقع۔ بادن بھگوان کا کھڑے ہوئے بھیک مانگنا راجہ بلی کا گنگا شاگرسے انہیں پانی پلانا، ایک خادم راجہ کے سر پہ مورچھل کررہا ہے۔

پانچواں نظارہ۔ سہسترارجن[2] نے ایک ہاتھ میں ڈھال باقی نوسو ننانوے[۹۹۹] میں تلواریں لیکر پرس رام (اوتار) پر حملہ کردیا، ادھر پرس رام بھی پھرسا[3] تانے ڈھال سنبھالے مقابلے پہ آگئے۔

اس جنگ کا منظر بدلنے کے لئے درمیان میں ایک درخت لاکر، جس پہ طوطا اُڑتا جارہا ہے، ہرناکس اور پرہلاد کی روایت کا اظہار، کھم پھٹ کر نرسنگھ اوتار کا پرگھٹ (ظاہر) ہونا، اور اپنی رانوں پہ رکھ کر شیر کے سے تیز ناخونوں سے ہرناکس کا پیٹ پھاڑنا، ان کے اُلٹے بازو پر پلاد کھڑا ہاتھ جوڑ رہا ہے، اس کے پیچھے کیادو بحالت اضطراب استادہ۔

یہ دوبارہا اوتار، مچھ اوتار، کچھ اوتار اور رگھ اندر موکش کی نمائش کرتی ہوئی کلنکی اوتار پہ اختتام کو پہنچی ہے۔

---

ان مرقعوں کے پس و پیش، اور اوپر نیچے کے خالی حصّے درخت، طاؤس، ہنس، شیر، اور طوطوں وغیرہ کی تصاویر سے آراستہ کئے گئے ہیں

[1] تانبے کا ٹونٹی دار ہندوانہ لوٹا جس پر قلعی نہیں ہوتی اور جو اکثر پانی پلانے کے کام میں لایا جاتا ہے [2] سہسرارجن کے ہزار ہاتھ مانے گئے ہیں [3] تبر۔ چھوی۔

مذکورہ بالا مناظر کے بیچ ابھرے ہوئے پھولوں یا بیل بوٹوں کی منڈل کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ تو پیاں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اس انداز سے دکھائے ہیں گویا ناچتے ناچتے سم پر ٹھہر گئے، اور ابھی ابھی حرکت میں آجائیں گے۔

یہ سبھی سادہ یا ایک رنگ کے نہیں، ان میں بھی چشم و ابرو، رخسار و گیسو، اور لباسوں پوشاکوں کی برقلمونیاں اپنی مثال آپ ہیں۔ کنہیا جی کے ومنت ہوئے ٹ، گوپیوں کی چولیوں دوپٹوں، ساڑیوں اور زیورات میں مناسب رنگوں سے چابک دست مصور نے وہ شان پیدا کی ہے، کہ نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔

(۴)

یہاں سے عمارت کا ڈیزائن کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ اس منڈل کے نیچے دیواروں کے کونوں پر ایک خاص وضع کی محرابیں دیکر گنبد کی ساخت بیضاوی شکل سے ہشت پہلو طرز میں ڈھال دی گئی ہے، اور اس کے ہر قطعے پر حسب ذیل انواع واقسام مناظر کھینچے ہیں۔

مغربی سمت۔ جنگ مہابھارت،، اپنے ہاتھ پر کرشن جی ارجن کے سوار تھی (رتھ بان) بنے ہوئے، قلب میں بھیم سین ایک درخت اور گرز گراں اٹھائے غنیم سے برسرپیکار اسی فوج یعنی کورو دل میں درونا چاریہ رتھ پر سوار مصروف حرب ضرب ہے، اور بھیشم پتامہ کی تیر باری سے قضا کو دم لینے کی مہلت نہیں۔

گوشۂ شمال و مغرب:۔ دوارکا جی کا محل "گرگا چاریہ گلے میں مالا پہنے۔ آگے کمنڈل رکھے، گموکھی (ایک قسم کی تھیلی) میں ہاتھ ڈالے، بھجن کر رہے ہیں، بائیں جانب تلسی چورا میں، تلسا کا پودا لگا ہوا ہے، رشی جی (گرگا چاریہ) کے پیچھے رکمنی، رکمنی کی پشت پر کرشن جی، سامنے کے باغ میں بل رام تیر چلاتے ہوئے۔ بائیں جانب اونچے اونچے درختوں کے نیچے مائینڈلک[۱] ہاتھ میں گیلی لئے اور دوسرے سے سر پر پہاڑ اٹھائے آمادۂ جنگ

سمت شمال:۔ جنک پوری" سیتا سوئمبر کی تقریب میں راجہ، مہاراجہ، اہالی، موالی، رشی، منی کا اجتماع عظیم، رام چندر جی دھنش توڑ رہے ہیں۔

گوشۂ شمال و مشرق:۔ سیتا ہرن" ہیونہ پاروں کی ٹوپی لگائے، گودڑی نما کفنی پہنے، کاندھے پہ جھولی ڈالے، فقیروں کا بھیس بنائے، راون بھیک مانگ رہا ہے، سیتا جی دان دینے کٹیا کے دروازے پر آئی ہیں، رام لکشمن کی تیر اندازی ہولناک بیابان میں خونخوار درندوں کی بھاگڑ۔

مشرقی سمت:۔ لنکا سنگرام،، مہلک حربے لئے بڑے کروفر سے راون جنگاہ میں کھڑا ہے، اس کے بالمقابل ہنومان جی ایک ہاتھ میں دو پھریروں والا زرد جھنڈا بلند کئے، گرز تان رہے ہیں، ریچھ، بندر، اسُر، اور دیتوں کی معرکہ آرائی یہ لشکر کشتم کشتا ہوتا ہوا، گوشۂ جنوب و مشرق تک نکلا چلا گیا ہے۔

گوشۂ جنوب و مشرق:۔ راون کا بھگوڑا لشکر دل روکنے کی غرض سے ایک پہاڑ سدراہ کر کے جس سے یقیناً کیلاش پربت مراد ہے، ویاگ امبر[۲] پہ مہادیو جی پہرا دے رہے ہیں، انکے سامنے پاربتی جی جلوہ فرما، اور پاربتی جی کی پشت پر ذرا ہٹکر ایک درخت کے سایہ میں نادیہ بٹھا دیا ہے۔

جنوبی سمت:۔ مہا کالی اور مہکاسُر کی جنگ،، مہا کالی (درگا شکتی) اپنے مقبول مرکب شیر پر سوار، مہکاسر بھینسے کی پیٹھ پر جما ہوا۔ دونوں میں شدید نبرد آزمائی ہو رہی ہے، گرد و پیش فریقین کے جانثار باہم چھری کٹاری ہیں۔

گوشہ جنوب و مغرب۔ اس مرقع میں شاید مصور نے دروپدی کا چیر ہرن دکھایا ہے، جو روایات سے مطابقت

[۱] مائینڈلک کا اصل ہتھیار موسل بتایا جاتا ہے [۲] شیر کی کھال۔

کرنے پر اچھی طرح میری سمجھ میں نہ آسکا۔

(۵)

ابھی اس رشک وہ نگارخانۂ چین منقش مندر کے نظارے سے سیری نہ ہوئی تھی، کہ محب مکرم جناب سید علی حسین صاحب ایس۔ ڈی۔ او، پورے باغ کا باقاعدہ اسکیچ تیار کر لائے۔ ان کے اسکیچ سے معلوم ہوا، کہ اس باغ کے احاطہ کی لمبائی تین سو سولہ فیٹ، چوڑائی دو سو تئیس فیٹ ہے، اور یہ منقش مندر پندرہ پندرہ فیٹ مربع، اس کے پہلو میں ذرا ہٹ کر سوا چھ چھ فیٹ مربع ایک چھتری بنی ہوئی ہے، جس میں سیندورے لگے ہوئے پتھر پہ، چار خانوں میں مرد، عورت، ہلال اور آفتاب کندہ ہیں۔

منقش مندر کی دوسری جانب ساڑھے آٹھ فیٹ بسیط اور ساڑھے سات فیٹ عریض تلسی چورا ہے، اور اسی لائن میں پانچ پانچ فیٹ عریض من پر نو فیٹ قطر کا ایک کنواں۔

اس کنوئیں کی مغربی سمت ساڑھے باون فیٹ لمبا اور سوا اٹھائیس فیٹ چوڑا دوسرا مندر ہے، جس کے پچھواڑے کی دیوار بڑی طرح ڈھیر ہو گئی، رہی سہی عمارت بھی وقت کی منتظر ہے، نہ جانے کب فرش زمیں ہو جائیگی۔

واجپئیوں کے باغ کی ویرانی و شکستہ حالی سے ظاہر ہوتا تھا، کہ ہوگا کوئی ڈھائی تین سو سال کا پرانا، لیکن میں نے دیکھا، کہ اس کی عمارتوں میں کھنڈے[1] تو مقامی پہاڑوں کے ہیں، لیکن پاٹ پٹیون اور گڑھائی کھدائی کی جگہ با موری پتھر لگایا گیا ہے، تو ایک شش و پنج میں پڑ گیا، کیونکہ عہد مغلیہ کی آخری تعمیرات تک یہ کان دریافت نہیں ہوئی تھی جب ہی تو اس دور کے آثار قدیمہ میں یہ پتھر نہیں پایا جاتا

مرہٹی راج سے اس کا رواج ہوا ہے۔

گویا واجپئیوں کا باغ لگے اور ان عمارتوں کی بنیاد پڑے سو سال کے لگ بھگ زمانہ ہونا چاہیئے۔

ایسی باتیں معلوم کرنے کا مجھے ہمیشہ سے خبط ہے، لہذا کچھ عجیب الجھن میں گرفتار ہو گیا، لیکن پوچھوں کس سے، اور سب ساتھی تو دُور دُور کے رہنے والے تھے، صرف ماسٹر رمضان خاں صاحب خاص آنتری کے ہیں، سو افسوس وہ بھی کچھ نہ بتا سکے۔

نتیجہ یہ کہ جس باغ کو اس شوق سے دیکھنے خوش خوش گیا تھا، اس کی سیر سے ہشاش بشاش آنے کے بجائے ایک خلش لئے ہوئے اداس پلٹا۔

---

وہ دن یوں ہی تمام ہوا، اور بھی دو چار روز اسی فکر میں گذر گئے، اس اثنا میں کتنے ہی اشخاص سے واجپئیوں کے باغ کا حال معلوم کرنا چاہا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔

آخر قاضی محمد حبیب صاحب نے مجھے ایک بوڑھے برہمن پنڈت بھوانی شنکر سے ملایا، اُتنے تو نہیں جتنے میں چاہتا تھا، ہاں ان کی زبانی کچھ حالات معلوم ہوئے، وہ قلمبند کئے دیتا ہوں، مبادا اس نقش بر آب منقش مندر، شکستہ عمارتوں اور رہے سہے باغ کی موجودہ علامات مٹ جانے کے بعد آئندہ نسلیں اس باغ کے متعلق کچھ بھی اندازہ لگانے سے محروم رہ جائیں۔

(۶)

پنڈت جی نے کہا:—

پہلے یہ جگہ "کاشی رام کی چھتری" کہلاتی (مشہور) تھی منقش مندر تو بعد میں بھولو رام اور بھورن واجپئی نے بنوایا ہے، ان میں سے بھون لاولد مر گئے، بھولو رام واجپئی کے

[1] کھنڈے: چٹانی کے پتھر۔

دولڑکے تھے، پتی رام اور چھپن رام، پھر پتی رام کے دو بیٹے ہوئے، ایک رگھو نندن دوسرے جگدیش۔

اب جگدیش اور رگھو نندن بھی مر کھپ چکے ہیں، ہاں ان کی نسل اولاد موجود ہے، جسے پیٹ بھر روٹی اور تن ڈھکنے کپڑا میسر نہیں۔

**میں**۔ افوہ! یہ انقلاب ہوا؟ افسوس!

اچھا! پنڈت جی!! وہ بھورن اور بھولو رام واجپئی جنہوں نے منقش مندر تعمیر کرایا، کیا کوئی جاگیردار یا رئیس تھے؟

**پنڈت جی**۔ جاگیردار یا رئیس کچھ نہیں، یوں ہی تھے ودوان پنڈت۔

**میں**۔ تو پھر اتنی دولت ان کے پاس کہاں سے آئی، جو ایسا مندر تعمیر کرا سکے؟

**پنڈت جی**۔ دولت، اجی اس کی بھلی چلائی، مالک کی دیا مہربانی چاہئے، چٹکی بجاتے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

**میں**۔ بجا! بیشک اسے بناتے بگاڑتے دیر نہیں لگتی، لیکن مہاراج! میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ بھورن اور بھولو رام معمولی حیثیت سے کس طرح اتنے بڑھے کہ ایسی چیز تعمیر کرا سکے۔

**پنڈت جی**۔ ہاں! تو بات یہ ہوئی، کہ ان میں سے ایک کو جاگیر موہن گڑھ کی کامداری مل گئی اس نے دوسرے کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا، دونوں نے مل کر خوب کمائی کی۔ جب وہاں سے چلے آئے تو کافی پیسہ ہو جانے کی وجہ سے لگے ساہوکارہ کرنے، پھر آج کچھ کل کچھ، دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی، مرگ باشی عالیجاہ بہادر جیواجی راؤ سیندھیا کے وقت تک ان کا بڑا عروج رہا وہ ساکھ بندھی دور دور لین دین پھیل گیا، یہاں سے وہاں تک ان ہی کی جائداد نظر آنے لگی، یہ کواپریٹو بینک کے دفتر والا مکان، خاص واجپئیوں کے رہنے کا ہے، اس کی ڈیوڑھی میں کاٹھ پٹلار ہتا تھا، تاہم قرض دار آتے تھے انہوں کو وہ خود حوالات کر دیتے تھے، برسوں ریاست کے صوبہ سردار رئیس اور جاگیردار لین دین کے سلسلے میں اور دوستانہ مراسم کی وجہ سے یہاں آتے جاتے رہے ہیں۔

میرے سوالات کے جواب میں پنڈت جی نے، ان کے عروج و زوال کی ایک طویل داستان سنائی، جس کی لپیٹ میں کتنے ہی رقت انگیز و تعجب خیز واقعات آ گئے، لیکن کیونکہ میرا موضوع "واجپئیوں کا باغ" ہے بھورن اور بھولو رام کی خاندانی تاریخ نہیں، لہذا یہ قصہ یہیں چھوڑتا ہوں۔

(۷)

میں نے پنڈت جی کا بیان گوش دل سے سنا، اور متاثر ہوا، پھر بھی اصل خیال اپنی جگہ قائم رہا، جوں ہی ان کی رام کہانی ختم ہوئی، گذارش کی:۔

مہاراج!! اسوقت باغ کی کیا حالت تھی؟

**پنڈت جی**۔ کچھ نہ پوچھو، اجی صاحب اب وہ موج کہاں دیکھنے میں آتی ہے، مدتوں اس مندر کا پوجاری رہا ہوں، زیادہ تر واجپئیوں کے باغ میں ہی پڑا رہتا تھا۔

**میں**۔ بجا!! بجا..... تو اس زمانہ میں وہاں کیا کیا چیز تھیں؟ اور کب سے اجڑ گیا!

**پنڈت جی**۔ کب سے..... ہاں.. ..کل کی سی بات ہے ... افسوس!

**میں**۔ آخر کچھ فرمائیے......

**پنڈت جی**۔ میرے ہی سامنے سب کچھ ہوا۔

**میں**۔ سب کچھ کیا کیا..... ہاں پنڈت جی! تو کیا ہوا؟

**پنڈت جی**۔ یہی کہ بیلداروں نے زمین چورس کر کے، سُوت ڈوری سے روشیں چھوڑیں، آبپاشی کے لئے نالیاں

کائیں، کیاریاں بنائیں، الشکر گوالیار سے کاریگر آئے، بنیاد کھدی، عمارت کھڑی ہوئی، پھر چیتر کاروں (مصوروں) نے دیواروں پر تصویریں کھینچیں، مندر آنکھوں میں کھبنے لگا۔

ادھر باغ کے تختوں میں قرینہ قرینہ سے انار، نارنگی، لیموں، امرود و کیلہ وغیرہ کے پودے رکھے گئے، طرح طرح کی سبزی ترکاری ہونے لگی، پانچ چھ سال میں پھل پھلاری ترکاری بھاجی کا آرام ہو گیا، راہ چلتے مسافر شکم پُر ہونے لگے، چمپا، چنبیلی، جوہی، موگرا، بیلا، گلاب سے آنتری کا وہ رُخ مہکا کرتا تھا۔

ہائے دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا ... زمانہ کی گتی نیاری ہے۔

(۸)

بھلا پنڈت جی غلط کیوں کہنے لگے، یہ باغ ایسا ہی سرسبز و شاداب ہوگا، جیسا کہ انہوں نے بیان کیا، لیکن جب وہ مالی ہی نہ رہے، جنہوں نے ارمانوں سے اس کی آبیاری کی تھی، تو پھر اور کوئی کیوں تردد کرتا۔

اس بے غوری کے باعث ہرے بھرے تختے اور میوہ دار اشجار، جو کڑی دھوپ کی تاب نہیں لا سکتے، نوبت بہ نوبت نذر خزاں ہو گئے، جس کا موقع لگا ایندھن کے لئے لکڑیاں کاٹ لے گیا، حیف!

سفاک دنیا نے ایسا اچھا باغ اس بے دردی سے تلپٹ کر کے رکھ دیا۔

اب وہاں جائیے تو، اکتالیس نیم، دو کیتھ، تین املیاں، ایک آملہ، ایک املتاس، دو لسوڑے، ایک سترہ فیٹ دور والے عجیب درخت کے سوائے، جس کا نام "اجان" بتایا جاتا ہے، ہر طرف بگولے خاک اڑاتے پائیگا۔

گو منقش مندر کے بازو والے پرانے کنوئیں میں اسوقت بھی پانی موجود ہے، لیکن احاطے کے زیریں اڑتالیس فیٹ لمبی چار فیٹ چوڑی چبری، اور پچیس فیٹ طویل پانچ فیٹ عریض حوض، جو ٹوٹے ہوئے درماندہ مویشیوں کی پیاس بجھانے کے لئے لبریز رہتے تھے، خشک ہی نہیں اس قابل بھی نہ رہے کہ بغیر مرمت کام دے سکیں۔

چودہ مرتبہ عزیز القدر ملک ناصر الدین محمود[لہ] خاں۔ بی ای ریذیڈنٹ انجنیر مسنور اکنال، اور ایک دفعہ عزیزی سید امتیاز علی صاحب فخر کے مخلصانہ تعلقات کی وجہ سے آنتری آنا جانا ہوا، وہاں کے تمام موسم میری نظروں سے گذرے، ان دنوں کی تو نہ کہونگا، جب بعض سہولتوں کے سبب چند کاشتکار خریف کا کھلیان کرنے آجاتے ہیں، آدمی تو آدمی چارہ گھاس اور پانی دانی کا لالچ نہونے کی وجہ سے میں نے اس وحشت کدہ میں کوئی آوارہ مویشی تک پھٹکتے نہ دیکھا۔

(میرزا فہیم چغتائی)

لہ ڈی-ای کے عہدے پر ترقی پاکر مالوہ ڈویژن اوجین تبدیل ہوگئے۔

# برنارڈ شا

## اپنی ادبیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی شخصیت کی وجہ سے زندہ رہے گا؟

(از جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی)

برنارڈ شا کو لوگ "اپنی قسم کا آپ نقاد" خیال کرتے ہیں اور یہہ رائے کچھہ زیادہ غلط بھی نہیں کیونکہ اس نے اپنے متعلق جتنا کہا ہے کسی دوسرے کے متعلق نہیں کہا۔ اس کا خیال ہے کہ وہی صرف ایسا ڈرامانگار ہے جس کے ڈرامے دنیا کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک کھیلے جاتے ہیں لندن سے جاپان تک اسکا غلغلہ بلند ہے اور امریکہ میں تو خیر اس کی شہرت غیر معمولی ہے۔ شہرت کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے اس لئے کہ یہہ حرف بحرف صحیح ہے لیکن دیکھنا یہہ ہے کہ شا اپنی ہر دلعزیزی کو ادبیت کا سبب سمجھتا ہے اور ہم اس کی شخصیت کو اس کی شہرت کا سبب سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کی زندگی کے واقعات پر ایک سرسری سی بھی نظر ڈالیں تو ہمارا خیال حقیقت سے ملتا نظر آئیگا۔

"فرینک ہیرس" شا کا بے انتہا دوست تھا اور اسی حق دوستی کے ادا کرنے کے سلسلہ میں اس نے اس کے سوانح حیات لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ شا کو سب سے زیادہ بُری وہ تنقید معلوم ہوتی تھی جسمیں یہہ بیان کیا گیا ہو کہ وہ شیکسپیر سے گھٹیا درجہ کا ڈرامہ نگار ہے۔ ہیرس بھی بدقسمتی سے اسی مکتب خیال کا تھا اس لئے شا نے دعوتوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ اس لئے باندھا کہ وہ ہیرس پر اپنی عظمت کا سکہ جمائے۔ سارا وقت مقابلوں اور بحثوں کی نذر ہوجاتا تھا۔ یہاں یہہ بات قابل لحاظ ہے کہ شا جس طرح لکھنے پر قدرت رکھتا ہے اسی طرح بولنے پر قابو رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جو چیز اس کے بولنے میں اضافہ کرتی ہے وہ اس کی نمایاں شخصیت ہے۔ گوکہ وہ لکھنے میں بھی اپنی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے لیکن وہ بات کہاں پیدا ہوسکتی ہے جو اس کے سامنے بیٹھکر گفتگو کرنے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنی چرب زبانی اور مقناطیسی شخصیت کے اثرات سے مقابل پر قابو پا بھی لے تو یہہ اس کی ادبیت کا سبب نہیں ہوسکتا بلکہ اس کی شخصی وجاہت کا۔

شخصی وجاہت سے کہیں یہہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ وہ اپنا خوشرو۔ قوی ہیکل اور تنومند جسم کا مالک ہے بلکہ شخصیت سے مراد اس کی وہ خوبیاں ہیں جو اس کو بھرے مجمع میں جاذب نظر کردیتی ہیں۔ اس کا طریقہ نشست وبرخاست۔ رکھ رکھاؤ کا انداز۔ ملنے جلنے کا طریقہ۔ لب ولہجہ اور طرز ادا کچھ ایسی خوبیوں سے مالامال ہے کہ جس کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ آسکر وائلڈ کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ بولتا تھا تو کسی اور کی زبان نہیں چل سکتی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا اور سب گوش برآواز ہوگئے۔ برنارڈ شا جب بولتا ہے تو اپنی پوری قوت کے ساتھ بولتا ہے۔ زور بیان اور طرز ادا کے ساتھ اتنا جوش وخروش ہوتا ہے کہ سننے والے پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ بہت کم لوگ یہہ توقع کرسکتے ہیں کہ

شاؔ کے جیسا بوڑہا کھوسٹ پہلو بدل بدل کر میز پہ مکے رسید کر کر کے گرجدار آواز میں گفتگو کے سلسلہ کو غیر معمولی طوالت دے۔ بہت سے افراد کو اس سے ملکر اسی سلسلہ میں مایوسی ہوئی۔ جب وہ بولتا ہے تو اس کا مخالف سحر زدہ نظر آتا ہے اور دوست تو دوست ہی ٹہرا اسکا کیا ذکر؟

اس پر طرّہ یہہ کہ اس نے اپنی جولانگاہ آپ ہی ڈہونڈہ نکالی اور یہہ وہ مقام ہے جس پر ابھی تک کسی نے پاؤں نہیں رکھے ستھے۔ وہ دنیا سے نرالی رائے رکہتا ہے اسکا خیال بھی کسی سے نہیں ملتا اور اگر حسن اتفاق سے مطابقت ہوجائے تو وہ اگر دوسروں کا خیال نہ بدل سکے تو اپنی انفرادیت باقی رکہنے کے لئے خود اپنا خیال بدل دیتا ہے۔ ربع صدی سے زیادہ اس نے یہی کوشش کی کہ جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہوں وہاں وہ کھڑا شہنائی بجاتا ہوا نظر آئے۔ جہاں دنیا والوں کی نظریں ختم ہوجاتی ہیں وہاں سرحد اوراک سے پرے اس کا مقام ہو۔ اور جسے لوگ حاصل کرنے کی دہن ہیں دیوانے ہوئے جاتے ہوں وہ اسے علانیہ ٹھکرادے۔ غرض شاؔ نے یہہ تصفیہ کرلیا ہے کہ وہ ساری دنیا اور دنیا والوں کی مخالفت کریگا چاہے حقیقت ان کے ساتھ ہو یا اس کے ساتھ۔ اس سے بحث نہیں کون سچا ہے اور کون جہوٹا۔ مطلب صرف یہہ ہے کہ اپنے آپ کو دنیا والوں میں شامل نہ کرے بلکہ وہ اپنی شخصیت کو ایک انفرادی حیثیت دینی چاہتا ہے ایسی کہ ساری دنیا کے مقابلہ میں بھی وہ نمایاں نظر آئے۔ اسی فکر میں اس سے جو کچھہ بن پڑا کیا۔ لوگوں نے اسے دیوانہ خیال کیا خودستائی کا الزام دیا مغرور کہا اور جانے کیا کیا۔ اسے ان الزاموں کی پرواہ نہیں بلکہ بڑی حد تک وہ خوش ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ تو کرتے ہیں۔ اچہے نام سے ہو یا بُرے نام سے بہرحال یاد تو کرتے ہیں۔

ایک دفعہ اس نے کہا " آئندہ تین سو سال تک میرا ذکر ادبیات عالم میں کچھہ اس طرح نمایاں رہیگا کہ دوسرے صرف پس منظر ہوکر رہیں گے " جب اس کی مخالفت کی جانے لگی تو اس نے کہا " میرا مطلب یہہ تہا کہ میرا ذکر ہی آئندہ تین سو سال کی " تاریخ ادب " ہوگا۔ جتنی مخالفت کیجئے وہ اتنا ہی اپنی حقیقت کو بڑہانے کی کوشش کریگا لیکن اس کے برخلاف ہیرس اور اس کے دوسرے ملنے والوں کا خیال ہے کہ اگر اس کی مخالفت نہ کیجائے بلکہ اس کو سراہا جائے تو وہ بھی اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنتا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا مقصد اتنا سطحی نہیں ہے کہ اپنا آپ پروپیگنڈا کرے اور بس۔ بلکہ اسکا مقصد اپنے اور دنیا والوں کے درمیان ایسا خلیج حائل کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ " جینس " فوق الفطرت انسان ہوتا ہے اور اس کے اور عوام کے درمیان ہر فعل اور ہر خیال کا مطابق ہونا ضروری نہیں۔ وہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑہاتا ہے اور ہر اُس چیز کا مخالف ہوتا ہے جس کی دنیا موافقت کرتی ہے۔

دنیا کہتی ہے کہ یورپ میدان جنگ ہو رہا ہے اور کوئی دن دور نہیں کہ جنگ چہڑ جائے شاؔ کیلئے اپنی انفرادیت قائم رکہنے کے لئے یہہ ضروری ہے کہ وہ اس خیال کی تردید کرے اسلئے اس نے حال ہی میں ایک مضمون لکہا " جنگ نہیں ہوگی " اسلحہ کی جھنکار کو لوگ جنگ کا پیغام سمجہتے ہیں لیکن شاؔ کہتا ہے " زہریلی گیس وسیلہ امن ہے "۔ دنیا کہتی ہے کہ مسولینی نے حبشہ پر قبضہ کرکے اپنی بہیمیت کا ثبوت دیا۔ شاؔ کہتا ہے کہ " وہ اس کا حق تہا اچہا کیا جو چھین لیا " ہٹلر " رائن لینڈ " میں فوجوں کو دہسا دیتا ہے تو شاؔ " ہٹلر زندہ باد " کے نعرے لگاتا ہے۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں امریکہ میں ادیبوں کی ایک انجمن نے اپنے ایک رکن کو محض اس لئے خارج کردیا کہ وہ انجمن کی عام پالیسی سے جنگ کے بارے میں اختلاف کرتا تہا۔ دنیا کے کسی ادیب نے یا

کسی ادارے نے اس کی طرف توجہ نہ کی اور محض دو مہینوں کے انجان ہونے شا کے لئے میدان عمل ڈھونڈھ نکالا۔ اس نے فوراً ہی ایک خط اس امریکی انجمن کے نام لکھا کہ اس رکن کو فوراً ہی دوبارہ ممبر بنا لیا جائے اس وجہ سے کہ ادیب کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے اور کسی جماعت کا ساتھ دینا اس کا فرض قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بھلا امریکہ والوں کو اس کی کیا پڑی تھی کہ سات سمندر پار والے کی سن لیتے۔ انجمن کے معتمد نے جواب دیا "امریکی معاملات میں آئرلینڈ کے کسی نیم شائستہ ادیب کا دخل نہ صرف نازیبا ہے بلکہ قابل بازپرس"۔ اس نازیبانہ نے شا کو بہت بھڑکا دیا۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ چھیڑنے کے بعد شا شیر کی طرح بپھرتا ہے اور اسی طیش میں اس نے جواب دیا "آپ کی اس طرز تحریر سے مجھے امید ہو چلی ہے کہ بجھے وہ ٹیکس جو میں سال بہ سال امریکی بینک کے ذریعہ ادا کرتا ہوں واپس ملجائیگا کیونکہ آپ ہی کے اصول کے مطابق "بغیر حق رائے دہی کے ٹیکس عاید نہیں کیا جا سکتا"" اس کے جواب میں انجمن نے ادیب کو دوبارہ ممبر کرلیا۔

۱۹۲۵ء میں شا کو "نوبل پرائیز" دیا گیا۔ آج تک جن لوگوں کو یہہ انعام مل چکا ہے ان تمام اشخاص نے جس انداز میں اس اطلاع کا جواب دیا وہ سوائے اظہار تشکر و امتنان کے نہیں، مگر شا کو تو دنیا سے الگ چلنا تھا اسلئے اس نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ۱۹۲۵ء کا سال مجھے یہ انعام دینے کے لئے کیوں تجویز کیا گیا۔۔۔۔۔ شاید اس لئے کہ اس سال میں نے کوئی عمدہ کتاب نہیں لکھی۔ ۔ ۔ ۔ یہہ خیال نہ کیا جائے کہ مجھے اس انعام سے کوئی فائدہ ہوا۔ میری مالی حالت بحمد للہ اتنی اچھی ہے کہ میں یہہ رقم خیرات کر سکتا ہوں۔ اب رہی میری ادبی حیثیت سو اس پر بھی اس انعام سے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کیونکہ میں اتنا زیادہ مشہور ہوں کہ مزید شہرت ناممکن ہے" جب اس انعام کی رقم وصول ہوئی تو اس نے ساری کی ساری رقم سویڈن کے غریب آدمیوں میں تقسیم کرادی یہہ کہہ کر کہ "اول خویش بعدہ درویش"۔ (نوبل انعام سویڈن ہی سے دیا جاتا ہے)۔

پہلی دفعہ جب وہ "ہالی وڈ" گیا تو فلمی ستارے اس چاند کے اطراف جمع ہو گئے اور ہر شخص کی یہہ خواہش تھی کہ وہ اسکا کمرہ اور اس کا نگارخانہ دیکھے لیکن یہہ حرکت تو آپ اور ہم کرتے ہیں بھلا شا کو اس سے واسطہ؟ اس نے ان سے کہا "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ تمہیں دیکھوں بلکہ محض اس لئے آیا ہوں کہ تم مجھے دیکھو"۔

وہ دنیا کی سیاحت کے لئے روانہ ہوتا ہے جاپان میں ٹوکیو پر جہاز لنگر انداز ہوتا ہے۔ مسافر جوق در جوق مشرق کے سب سے بڑے مارکٹ کو دیکھنے دیوانہ وار دوڑتے ہیں اور شا نہایت اطمینان سے جہاز میں رہتا ہے لوگ پوچھتے ہیں تو جواب دیتا ہے "مجھے کوئی دلچسپی نہیں" لوگوں کا اصرار حد سے بڑھا تو جاپانی ڈرامہ دیکھنے پر راضی ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مقام پر ایک شخص نے بہت مجبور کر کے اسے کھانے پر بلوایا اور جب میزبان اپنے آنے والے مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے کمرہ سے باہر ہوا تو یہہ دریچہ کی راہ سے کود کر فرار ہو گیا۔

"فرینک ہیرس" کی زندگی میں امریکہ کی کسی فلم کمپنی نے آسکر وائلڈ سے متعلق ایک فلم بنانے کے لئے ہیرس کو دعوت دی۔ وہ پہنچا اور جب سارے انتظامات اور معاہدات مکمل کر رہا تھا تو اسے خیال ہوا کہ شا بھی آسکر کا دوست رہ چکا ہے اسلئے اس کام میں اسے بھی شریک کر لینا اچھا ہوگا۔ یہہ فلم کمپنی شا کی بددماغی سے پریشان تھی لیکن ہیرس کے کہنے سننے پر راضی ہو گئی اور ایک معقول معاوضہ طے پا گیا۔ ہیرس نے فوراً ہی شا کے نام تار روانہ کیا کہ وہ برائے نام اس کو قبول کر لے۔ اس کے جواب میں شا کا

ایک خط آیا (کیونکہ وہ تار کا جواب ہمیشہ خط کے ذریعہ سے دیتا ہے)
جس میں لکھا تھا "ہیرس! تم کتنے بیوقوف ہو۔ جس فلم کی تیاری میں
میرا نام ہوگا وہاں تمہیں کس طرح شہرت نصیب ہوسکتی ہے۔ اسکی
ساری خوبیاں لوگ مجھ سے منسوب کرینگے اور برائیاں تمہارے
سر تھوپیں گے۔ علاوہ اس کے تم نے جو معاوضہ کی شرح بھیجی ہے
وہ میری مارکٹ کی قیمت سے بہت کم ہے۔ اگر میں فلمی دنیا
میں قدم رکھنا چاہتا تو پچاس پچاس ہزار پونڈ کا سودا ردی
کی ٹوکری میں نہ ڈالتا"

ایک عرصہ پہلے شا کی کامیابیوں کے اظہار کیلئے ایک
بہت بڑا جلسہ "مالورن فیسٹیول"
کے نام سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہہ بھی خواہش کی گئی
کہ وہ اس موقع پر اپنا کوئی تازہ ترین ڈراما اسٹیج کرائے "دی
ایپل کارٹ" شا نے چھ ہفتوں میں لکھا
اور اتنا طولانی لکھا کہ توبہ بھلی - مگر لوگوں کی مجال نہ تھی کہ دم
مارتے۔ ایسے منتخب مجمع کے آگے کہ جن میں دنیا بھر کے ادبار
وفضلار جمع ہوں شا نے ایسا لمبا چوڑا ڈراما اتنی لمبی لمبی تقریروں
سے بھرا ہوا پیش کیا کہ ساری دنیا محو حیرت ہوگئی۔ منتظمین نے
اس بیوقوفی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا "میں اس موقع پر
یہہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لوگ میرے بڑے سے بڑے ڈرامے میں بھی
شروع سے آخر تک دلچسپی لیتے ہیں یا نہیں۔ میں نے عمداً اسکا ایک
ایکٹ اتنا لمبا لکھا کہ وہ ایک گھنٹہ اور بیس منٹ تک چلا اور اسمیں کی
ایک تقریر یہی پندرہ منٹ تک نقادوں کے کانوں میں گونجتی رہی میں اپنے
اس دعویٰ کا ثبوت مہیا کر رہا تھا کہ لوگ شیکسپیئر کے بہترین ڈراموں
میں بھی اتنی طوالت برداشت نہیں کرسکتے کیونکہ یہہ شرف صرف
برنارڈ شا ہی کو حاصل ہے"

غرض یہہ اور اس قسم کے ہزاروں واقعات اس بات کی
دلیل ہیں کہ وہ اپنی تصانیف پر اپنی شخصیت کا اثر ڈالنا چاہتا ہے
اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہے
ہر ادبی دور میں ایک نہ ایک ادیب محض اپنی شخصیت کیوجہ سے نمایاں
ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں "جانسن" کی شخصیت کو لیجئے
اس کی شخصیت کی شہرت اس کی تصانیف سے یقیناً زیادہ ہے
اس کے سوانح حیات اس کی تصنیفات کو پس پشت ڈال
دیتے ہیں۔ لوگوں کی زبانوں پر اس کے شخصی واقعات جتنے
زیادہ ہیں اتنے ادبی فقرے نہیں۔ اردو شاعری میں میر صاحب
کی بد دماغی ان کی شاعری سے زیادہ مشہور ہے۔ جس شخصیت
کے تحت انہوں نے سودا کو ایک - درد کو آدھا اور سوز کو پاؤ
شاعر کہا وہ کسی بڑے سے بڑے نقاد کی رائے سے زیادہ مقبول ہے

اس کا یہہ مطلب نہیں کہ برنارڈ شا کی تصانیف کا کوئی
درجہ ہی نہیں۔ بلاشبہ شا نے جس انداز کا طنز پیش کیا ہے
اس کا جواب سارے انگریزی ادب میں نہیں ملتا۔ اس کی
ظرافت اپنی آپ نظیر ہے۔ اس کا طرز بیان اور اسلوب اسکا
اپنا ہے کوئی دوسرا نہ اس کا تتبع کرسکتا ہے اور نہ نقل۔ اس نے
اسٹیج کی کایا پلٹ دی اور ڈراموں میں انقلاب برپا کردیا
لیکن یہہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ شا اتنا بڑا ادیب نہیں کہ دنیا میں
کوئی اور اس کا مقابلہ ہی نہ کرسکے۔ وہ جو کچھ اپنے متعلق کہتا
ہے وہ صحیح تو ہے مگر بہت زیادہ مبالغہ آمیز۔ وہ سب سے
بڑا ادیب نہیں ہے لیکن وہ سب سے بڑا شخص ہے (ادیبوں
کے زمرے میں)۔

وہ "ابسن" کا چیلا ہے اور یہہ حقیقت ہے
کہ اس نے "ابسن" کو آج تک دنیا میں باقی رکھا لیکن یہہ
ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ اس کا کوئی "چیلا" نہیں۔ اس نے
کسی شخص کو تیار نہیں کیا جو اس کے نقوش قدم پر چلکر اسکی
شہرت کو تازہ رکھے۔ شا کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ
اس نے اپنے طریقے کو اتنا دشوار گذار کردیا کہ کوئی دوسرا

بھولے سے بھی اس مسلک پر چلنے کی کوشش نہیں کرسکتا۔ انفرادی فوقیت قائم کرنے کے سلسلے میں وہ اتنا بھٹک گیا کہ اسے خود اپنی بقا کا بھی خیال نہیں رہا۔ وہ موجودہ کامیابی پر پھولا نہیں سماتا لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی ادھر دنیا نے اس کے ڈراموں کو طاق نسیاں پر رکھدیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے دنیا نے ہر اس قسم کے ادب کے ساتھ یہی سلوک کیا۔

اس کے ڈرامے ناقابل اسٹیج ہوجائینگے اس کا بنایا ہوا اسٹیج ناکارہ سمجھا جائیگا اور اس کی تنقیدیں ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھیں گی لیکن جو چیز رہتی دنیا تک باقی رہے گی وہ تاریخ ادب میں شا کی شخصیت ہے انوکھی۔ نرالی اور دلچسپ!

سید بادشاہ حسین حیدرآبادی

## تموّل

انسان کو رفتہ رفتہ حیواں کردے
ہر نور کو صد نار بداماں کردے
دولت کہ فرشتوں سے بڑھا دیتی ہے
جم جائے اگر کہیں تو شیطاں کردے

## افلاس

ہر صاحبِ جوہر کو سُبک سر کردے
فطرت کو زبوں کرکے زبوں تر کردے
افلاس کہ کھینچتا ہے ایماں کیطرف
کمبخت مسلسل ہو تو کافر کردے!

جوش ملیح آبادی

# اندھا فقیر

ایک اندھا بارِ ہستی سے نڈھال !
اپنا پھیلائے ہوئے دستِ سوال !

بے نیازِ مرحبا و الاماں !
نا شناسِ فکرِ ہر اوج وزوال !

آشنائے گردشِ فردا و دوش !
محرمِ ضرباتِ نبضِ ماہ و سال !

انقلابِ دہر پیشانی پہ ثبت !
یادگارِ عیشِ ماضی خستہ حال !

دوشِ ہستی پر گراں بار الم !
بار، فرقِ عمر پر گردِ ملال !

ہر قدم پر تنگ میدانِ حیات !
فرطِ غم سے سلب پروازِ خیال !

کفنِ نعشِ زندگی، موئے سپید !
ماتمِ عہدِ جوانی، خندۂ جال !

ہر نفس میں موت کی سی ہچکیاں !
سر سے پا تک ایک مردہ کی مثال !

کھا رہا ہے دربدر کی ٹھوکریں !
بے خبر ہیں صاحبانِ جاہ و مال !

حیف تجھ پر عالمِ تہذیبِ نو !!
کیا یہی ہے تیرا آغازِ مآل !!؟

تابش دہلوی

(ترقی پسند مصنفین کی انجمن دہلی میں پڑھی گئی)

# ٹھوکر

(از حضرت فیضی رامپوری)

"فوراً چلے آؤ" اکرام صاحب کے ان الفاظ میں خدا جانے کیا جادو تھا کہ ان کا خط پڑھتے ہی میں نے رخت سفر باندھ لیا اور کلکتہ روانہ ہو گیا۔

اکرام میرے دیرینہ کرم فرما ہیں اور مجھ سے بیحد محبت رکھتے ہیں۔ ماشاءاللہ نصف درجن بچوں کے باپ ہیں اس کے ساتھ ہی کنبہ پرور بھی ہیں۔ آمدنی بھی معقول ہے۔ دنیا کو اگر "سجن المومنین" مان لیا جائے تو اکرام صاحب بھی ایک ایسے مومن تھے جن کو اس "سجن" کا آزاد قیدی کہہ سکتے ہیں۔ آزاد کے ساتھ لفظ قیدی سے شاید آپ کبیدہ خاطر ہونگے اس لئے میں آپ کی تسکین کے لئے ان کو آزاد مطلق کہتا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ وہ پھر مومن نہیں رہ سکتے!

ان کی ایک نوعمر و حسین (حسین کا اضافہ میری جانب سے سمجھ لیجئے۔ میں نے ابھی اس کو دیکھا بھی نہ تھا) بہن بھی تھی جس کی شادی کی ان کو رات دن فکر رہتی تھی کیونکہ اس کی کفالت کی ذمہ داری بھی اکرام صاحب ہی پر تھی۔ ان کی عین تمنا تھی کہ وہ مجھ سے منسوب کر دی جائے اور میری بھی دلی آرزو تھی کہ رفیقہ میری رفیقہ حیات بنجائے۔ اس آرزو و تمنا کی روحانی کشش کو معلوم کر کے آپ اب سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کے "فوراً چلے آؤ" لکھنے میں میرا اثر سحر محسوس کرنا بیجا نہ تھا۔

خیر تو ہم کلکتہ پہنچے اور ان کے مکان پر جا دھمکے۔

"کیوں بلایا تھا تم نے مجھے" میں نے اکرام صاحب سے دریافت کیا۔

"تم سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اچھا یہ شامی کباب کھاؤ رفیقہ نے تیار کئے ہیں نہایت لذیذ ہیں" انہوں نے کباب کی پلیٹ میرے آگے بڑھا کر کہا۔

میری آرزوؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ رفیقہ نے کیا یہ کباب میرے لئے تیار کئے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا بڑے عمدہ ہونگے۔ میں نے اٹھا کر ایک کباب کھایا، خوب چبایا۔ اور کام و دہن کے جس جس حصہ پر قوت ذائقہ کے پائے جانیکا یقین تھا۔ چبا کر اس کو ان تمام مقامات پر گھمایا مگر کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔ نہیں بلکہ ان کا ذائقہ خراب ہی معلوم ہوا بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا گویا اس نے یہ کباب نہایت بیدلی کے ساتھ تیار کئے تھے، اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ میری آمد سے خوش نہیں ہوئی تھی۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتی تھی، اس کو مجھ سے نفرت تھی۔ اللہ!

میرے قیام کا کمرہ زنانخانہ سے متصل تھا۔ اسلئے میں اپنی نشست و برخاست اور دیگر باتوں میں ذرا احتیاط برتتا تھا۔ لیکن اسقدر محتاط رہنے کے باوجود مجھ سے ایسی ایسی بے احتیاطیاں ہوئیں کہ مجھے ان کے تصور سے لذت آمیز شرم آنے لگتی ہے۔ یہ شرم میں لذت محسوس ہونا ایک نیا جذبہ ہے۔

ہم ذرا سیدھے سادھے انسان ہیں اور کسقدر۔ بس سیدھے سادھے ہی سمجھئے اور کچھ نہیں۔ کبھی کبھار نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے لیکن یہاں آکر ایسا تدبر طاری ہوا کہ سب کچھ چھوٹ گیا۔ آرام دہ صوفے، عمدہ کتابیں، فرصت، اور نفیس سگریٹ ان سے وقت ملتا تو سب کچھ سوچتا۔

صبح کا ناشتہ کر کے میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ پاس والے کمرے میں

سے کلام مجید پڑھنے کی آواز آئی۔ قرآن سینکڑوں بار سنا ہے لیکن یہ قرأت، یہ آواز، یہ مخرج اور یہ تاثر کسی میں آجتک نہ پایا تھا آیاتِ قرآنی سنکر ہماری حسِ نماز بھی بیدار ہوئی۔ سوچا کہ لاؤ وضو کریں اور دکھائیں جذبہ۔ لیکن اب اشراق کا وقت نکل چکا تھا چاشت کی نوافل ہمیں معلوم نہیں کتنی ہوتی ہیں۔ اور فجر کی قضا پڑھنے میں تنوع ہی کیا تھی۔ اس لئے تینوں باتوں کو ترک کیا اور فی الحال صرف قرآن سُنکر ہی داخلِ حسنات ہونا مناسب سمجھا۔ اس کے بعد قرآن خوان کی زیارت کا اشتیاق پیدا ہوا۔ میرے کمرہ کا ایک دروازہ قرآن خوان کے کمرہ میں کھلتا تھا جس کو اس طرف سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے کواڑ میں چٹخنی کے نیچے ایک سوراخ تھا۔ اگر آپ "ہول لوجی" سے واقف ہیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک مہین سوراخ سے آنکھ لگا کر دیکھنے سے اس کے اس پار کی تمام چیزیں نگاہ کے پھیلاؤ میں آجاتی ہیں۔ بس تو ہم سوفے کی پشت پر چڑھ گئے اور سوراخ میں سے اُس پار جھانکنا چاہا لیکن کمبخت سوفہ وزن سے لوٹ گیا اور ہم اڑاڑادھم کرکے نصف سوفے پر نصف زمین پر۔

"بُری رہی!" میں نے جھاڑ پونچھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ اِدھر جو دھماکا ہوا تو چند لمحوں کے لئے قرآن خوان بھی چپ ہو گیا۔ لیکن ایک منٹ کے بعد شیریں آواز بلند ہوئی اور کلامِ الٰہی کی شیرینی کے لئے شیر قند مکرر ثابت ہونے لگی۔

اس بار ہم نے کرسی پر قدم جمائے اور جھانکا۔ ایک حسین جانماز پر ایک حسین دوشیزہ محوِ تلاوت تھی۔ سنہری رحل سامنے رکھی ہوئی تھی اور یہ دوشیزہ ادب و احترام کی زندہ تصویر بنی ہوئی اس پر قرآن پاک رکھے تلاوت میں مصروف تھی۔ حورانِ بہشت اگر جنت میں اسی قسم کے تقدس حسین کی تصویر پیش کر سکتی ہیں تو میں اس ظلمتکدۂ دہر کا ناپاک انسان خوش نصیب تھا کہ اپنی حیات میں بغیر مرتا فی بنے ہوئے ایک حور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے دو لانبے لانبے سیاہ بال جن کو تکلف سے ایک موٹی چٹیا میں گوندھ لیا گیا تھا اسوقت احترامًا مہین دوپٹے میں چھپائے گئے تھے۔ لیکن چھپانے والے کو بالوں کے اس ہوشربا منظر کا اندازہ نہ تھا کہ وہ مہین دوپٹے میں سے نظر آکر کس قدر دلفریب نظارہ پیش کر دیا کرتے ہیں۔

میں بہ نگاہِ اولین قرآن خوان حسینہ پر فریفتہ ہو گیا۔ اسے کہیں یہی تو رفیقہ نہیں ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ وہ رفیقہ ہی تھی۔ اللہ رے تیرا تقدس! اس کی آواز نہایت ہی دلکش تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جو اس وقت قرآن کے پاک صفحات پر جھکی ہوئی تھیں نہایت ہی دلفریب تھیں اور اس کی ادائے نشست، اس کی سنجیدہ حرکات اسدرجہ جمیل تھیں کہ مقرب انسانی فرشتے اپنی روزانہ کی ڈائری کو چھوڑ کر حور وش حسینہ کو بنگاہِ احترام دیکھ رہے تھے۔

میں کئی منٹ تک اس عالم کا لطف اٹھاتا رہا۔ حتیٰ کہ تلاوت ختم ہو گئی۔ کلامِ الٰہی جزدان میں رکھ دیا گیا اور فاتحہ کے لئے پیارے پیارے ہاتھوں کو اٹھایا گیا۔ آپ کے لئے کس چیز کی کمی تھی کہ اس تضرع سے دعا مانگی جا رہی تھی۔ خدا جانے۔ میں نے بھی کسی کی حسین دعاؤں میں شرکت کرنے اور آمین کہنے کے لئے ہاتھ بلند کر دئے۔ بیخودی میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ہاتھوں ہی کے تو سہارے میں اپنے کو سنبھالے اب تک کھڑا تھا۔ سہارا چھٹنا تھا کہ میں دھڑام سے منہ کے بل قالین پر گرا۔ اچھی سزا ملی تقدس میں ریا شامل کرنے کی۔

میرے کمرے میں وقفہ وقفہ سے چونکہ دو دھماکے ہو چکے تھے اس لئے میرا حسین ہمسایہ سخت متعجب تھا کہ یہ دوسرے کمرے میں کون کشتی لڑ رہا ہے۔ چند منٹ بعد آخر ایک ننھا سا سراغ رساں میرے کمرے میں آیا اور مجھ سے بولا "پھوپی دریافت کر رہی ہیں کہ آپ کے کمرے میں یہ کون کشتی لڑ رہا ہے

یہ اکرام صاحب کا بچہ تھا۔ شہاب نے اس کو پیار کرتے ہوئے جواب دیا کہ اپنی پھوپی سے کہنا کہ اس کمرہ میں ایک جن رہتا ہے۔ جب وہ قرآن پڑھتی ہیں تو شیطان ان کے کمرے میں سے بھاگ کر مجھ سے لپٹتا ہے۔ وہ ہنستا ہوا چلا گیا اور شہاب نے جاکر بالکل میرے ہی الفاظ دہرائے۔

خیر اس روز اور کوئی بات وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ دوپہر کو میں سوگیا۔ دفعتہً ۳ بجے میری آنکھ کھلی تو ایسا معلوم ہوا گویا پاس والے کمرے میں کورس ہو رہا ہے۔ کچھ بچے بے قاعدگی سے چیخ رہے تھے اور بعض قاعدہ سے گا رہے تھے۔ ہم پھر تماشا دیکھنے اٹھے اور بکمال احتیاط روزن میں سے جھانکا۔ آہا ناچ ہو رہا تھا۔ جو حسن معصوم صبح شفق پر تھا اسوقت جوانی کی تمام تابانی کے ساتھ بچوں کو لئے محو رقص تھا۔ چند بچے رفیقہ کے گرد چکر کاٹ رہے تھے اور وہ شباب و مسرت کا مجسمہ بنی ہوئی ناچتی پھر رہی تھی "یا خدا اس نازنین کو کیا ہو گیا ہے" میں نے دل میں کہا۔

وہ لڑکپن کے الھڑ پن سے ناچ رہی تھی۔ اس کو مطلق احساس نہ تھا کہ اس کی اس وقت کی خوش فعلیاں اور کلیلیں اس کے صبح کے تزہد کے شایان شان نہیں ہیں۔ یکبارگی اسکی شراب ریز آنکھیں اس روزن کی جانب متوجہ ہوگئیں اور آنکھ نے آنکھ کو دیکھ لیا۔ لیکن اس نے بکمال استغنیٰ رُخ بدل لیا اور اپنے کھیل میں مصروف ہوگئی۔

اکرام صاحب کے نصف درجن سے زیادہ بچے اس کمرے میں شور مچا رہے تھے، ان کی چیخ پکار، ہڑبونگ اور ہو حق سے میں گھبرا اٹھا۔ خدا خدا کرکے شوروغل کم ہوا تو میں نے ایک کتاب اٹھائی اور اس کو پڑھنے لگا۔ دفعتہً دروازہ کھلا وہی بچہ جو پہلے آیا تھا پھر میرے کمرے میں داخل ہوا۔

"پھوپی کہتی ہیں کہ آپ ان کو سوراخ میں سے کیوں جھانکتے ہیں" بچہ نے پوچھا۔

"کون جھانکتا ہے" میں نے گھبرا کر کہا۔

"آپ" اس نے جواب دیا۔

"اپنی پھوپی سے کہنا کہ تم ہو اسی قابل کہ تم کو کوئی قبر میں سے بھی جھانک کر دیکھے" میں نے کہا۔ بچہ چلا گیا اور دو منٹ کے بعد آکر پھر بولا "آپ قبر میں ہیں یا کمرہ میں؟"

"نصف قبر میں نصف کمرے میں" میں نے جواب دیا۔

وہ پھر غائب ہوگیا۔ اور پھر آکر بولا۔

"آپ پورے قبر میں چلے جایئے"

"چلے جائیں گے اگر ہم پر ایسا ہی ستم روا رکھا گیا" ہمارا قاصد پھر چلا گیا۔

اس کے بعد مختلف طریقوں سے مجھ سے اظہار بیزاری کیا گیا، مجھ سے نفرت ظاہر کی گئی۔ مگر میں بھی ایسا ڈھیٹ بنا کہ کسی انسلٹ کا اثر قائم نہ ہونے دیا۔

ایک روز آخر ہماری ایسی باقاعدہ اور اسقدر پُرسیاست توہین کی گئی کہ ہم اس کی تاب نہ لا سکے۔ سہ پہر کو میں نے روزن میں سے جھانکا تو دیکھا کہ تمام بچے رفیقہ کے کمرے میں جمع ہیں اور وہ کرسی صدارت پر متمکن ہے۔ گویا باقاعدہ ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ رفیقہ ہمارے طرز عمل کے خلاف دھواں دھار تقریر کر رہی ہے۔ آخر باتفاق آرا اس عظیم الشان مجمع میں یہ ریزولیشن پاس کئے گئے۔

(۱) یہ مجمع اس شخص پر جو دروازہ کے سوراخ میں سے اس کمرے میں جھانکتا ہے ایک پرزور لعنت کا ووٹ پاس کرتا ہے۔

(۲) یہ مجمع اس شخص کو جو روزانہ ہم کو روزن میں سے جھانکا کرتا ہے نہایت ہی ناشائستہ انسان سمجھتا ہے اور اس کے اس طرز عمل سے سخت اظہار بیزاری کرتا ہے۔

(۳) یہ مجمع اس شخص کی اس حرکت کو کہ وہ روزانہ ہم کو

(باقی برصفحہ ۱۲۱)

"چکی" کا ایک باب:-

# نرالی تجویز

(از مرزا عظیم بیگ چغتائی چیف جج جاوڑہ)

بڑی بیوی کے انتقال پرملال نے ایک نئی صورت حال پیدا کردی ؛
ہماری مختصر خانہ داری میں ایک مسئلہ لاینحل ہوکر رہ گیا۔ چھوٹی بیوی اول تو ناتجربہ کار۔ ایک دم سے جو سارے گھر بار اور بچوں کو سنبھالنا پڑا تو ہوش زایل ہوگئے۔ بچے بڑی بیوی سے مانوس تھے اور پھر چھوٹی بیوی سے ویسے ہی لاگ ڈانٹ رکھتے تھے۔ ادھر سارے گھر کا خانہ داری کا انتظام۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ جبتک ملازمہ نہ ملے عذر ہوگیا۔ لیکن حسب منشا نوکرنی کا ملنا ایک وہ نعمت غیر مترقبہ ہے جسکا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ۔ ع۔ میری جان چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ غرض ہے کہ مشکل سے یا کسی طرح وہ کمبخت مل تو جاتا ہے ملازمہ تو ملتی ہی نہیں۔ جسے دیکھو تاؤ بھاؤ بتا رہی ہے۔ آئی ہیں نوکری کرنے اور سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ ہار کر جھک مار کر دکھ بھی لو تو وہ مضمون کہ۔ کام کی نہ کاج کی ڈھائی سیر اناج کی۔ اور پھر چھوٹی بیوی کیا کچھ نہ چاہتی۔ کوئی کام کرتی ہے تو چور ہے۔ اور کوئی چور نہیں تو رات کو نہیں رہ سکتی کوئی کام کرتی ہے تو تنخواہ ایک گرہ بجوٹ کی دو۔ پھر طرح طرح کی شکائتیں لیلو۔ کوئی نوکروں سے جاکر اندر کی باتیں لگاتی ہے تو کوئی بچوں سے متنفر۔ نتیجہ یہہ کہ یہہ مسئلہ لاینحل ہوکر رہ گیا۔ بالخصوص اسوجہ سے کہ لاکھ نوکرنی کام کی ہو پر ہماری نظروں میں کیا جچے۔ ہم تو بڑی بیوی کا کام دیکھے ہوئے تھے۔ چھوٹی بیوی بیچاری مرنے والی کو یاد کرتی تھی اور سچ مچ آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی۔ نتیجہ اسکا یہہ نکلا کہ ہمیشہ نوکرنیوں کی تلاش رہنے لگی اور جب دیکھو ہمارا گھر نوکرنی نہ ہونے کے سبب الٹا پڑا ہے۔ چھوٹی بیوی کے عیش و آرام میں خلل پڑ گیا۔ کہاں تو یہہ آسانی کہ بچہ کو اٹھا کے پیٹ دیا اور لیگئیں بڑی بیوی۔ بیمار پڑے تو ہماری بلا سے اور اچھا رہے تو ہماری بلا سے۔ اور یہہ بڑا ہوا ۔ ۔ ۔ لہذا ضرورت اور سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسی عورت ملجائے جو ہماری ہی ہوکر رہ جائے۔ اور بس چلتا چھوٹی بیوی کا تو پھر کسی بڑھیا سے میرا نکاح کرا دیا ہوتا۔ دن رات میری جان کھاتی۔ میں کیا کرتا۔ اُدھر خود اس نے اپنی ہر ملنے جلنے والی سے نوکرنی کی رٹ لگا دی اور ادھر میں نے ہر ملنے جلنے والے سے کہہ رکھا کہ خیال رکھے کہ کوئی عورت ایسی ملے تو بہتر ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ ایسی عورت تو دیہات سے مل سکے۔ لہذا میں نے اس کا بھی خیال رکھا اور جہاں کہیں بھی دورہ کے سلسلہ میں جانا ہوتا ہر کس و ناکس سے کہہ دیتا۔ یہہ تلاش جاری ہی تھی اور آئے دن کی پریشانیوں سے چھوٹی بیوی تنگ ہی تھی کہ ایک عجیب تجویز پیش ہوئی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک دیہات کا ملنے والا ذات کا داروغہ آیا۔ راجپوتانہ میں داروغہ کے معنی بہن غلام۔ یعنی باندی زادے جن کی عورتیں بطور باندیوں کے اب بھی رہتی ہیں۔ اس کیساتھ میں نے یہہ احسان عظیم کیا تھا کہ خاص اپنی کوشش سے اس کو ایک مقدمہ سے بچایا تھا جس میں جیل ہو جاتی اور پھر اپنے ایک دوست سے کہکر اس کو نمک کے محکمہ میں چپراسی کرا دیا تھا اور یہہ خاص ترقی کے امیدوار تھے اور اسی لئے میرے پاس آئے تھے۔ دراصل ان حضرت سے ملاقات اس طرح ہوئی تھی کہ یہہ گھی کی تجارت کرتے تھے اور سچے گھی دیتے تھے اور بخالص گھی کے سبب مقدمہ میں پھنسے تھے۔ ایسے کہ اس تجارت ہی سے تائب ہوگئے۔ انکا نام ہیرا تھا۔

ان سے جو میں نے اپنی ماما کی ضرورت کا ذکر کیا اور شرایط سنائیں۔ نہ ایسی بوڑھی ہو کہ کام نہ کر سکے اور نہ ایسی جوان کہ چٹکیاں بجائے۔ گھر کو گھر سمجھ کر رہے۔ کوئی مرا جیتا نہ ہو تو بہتر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو انہوں نے

سوچ سمجھکر سرہلایا۔ بولے کہ ایسی عورت ملنا ممکن ہے۔ مگر ایک تجویز ہے بشرطیکہ پسند ہو۔ وہ یہہ کہ ان کی ایک رشتہ کی بہن ہے۔ گنواری اور قبول صورت کوئی پندرہ سولہ برس کی۔ وہ حاضر ہے۔ گوپی بناکر رکھ لو۔ شرط یہہ کہ سال میں دو جوڑی دینا ہونگے۔ پچاس روپیہ کا چاندی کا زیور دینا ہوگا۔ دوسو روپیہ نقد اس کی ماں کو دینا ہونگے۔ گھر کا سارا کام کاج کرے گی۔ بیوی اور بچوں کی خدمت کرے گی۔ کھانا پکائیگی۔ پانی بھر لائیگی۔ کام نہ کرے مار و چاہے پیٹو۔ تنخواہ کچھ نہیں۔ مگر شہر والا کاغذ تحریر کرنا پڑیگا۔ اور نادار اس سے ہو تو گذارہ کی معدار ہوگی اور جو بخطا اپنی مرضی سے نکالدیا تو دوسو روپیہ نقد رخصتی کے دینا پڑیں گے۔

لاحول ولا قوۃ۔ میں نے کہا "ابے بیہودے۔ دروغ کے بچے تو نے بھی ہم کو کوئی ایسا ہی کام کا سمجھا ہے جو ہم اس ناجائز بیہودگی کو گوارہ کریں"

لیکن اس احمق کو دیکھئے ہنستا ہے۔ کہتا ہے کہ اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے ان حضرت کو سمجھایا کہ یہہ سخت منع ہے اور سخت مذہبی اور اخلاقی جرم ہے کہ بغیر نکاح کئے کسی عورت کو ڈال لیں۔ انتہا سے زیادہ لغو اور ناشائستہ لوگ ہیں جو بے نکاحی عورت گھر میں ڈال لیں۔

اس کا جواب یہہ ملا کہ اچھا ایسا ہی ہے تو نکاح کرلو۔ اور جو یہہ کہا کہ ہندو ذات کی کسی عورت سے نکاح ناممکن تو کہا کہ مسلمان کرلو۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اب کیا اعتراض کی گنجائش۔ مگر میں نے انکار کردیا۔ یہہ کہکر کہ گھروالی اس بیہودگی کو پسند نہیں کرسکتی۔ یہہ بات اس کی سمجھ میں بھی نہ آئی کہ ایسا بھی کسی طرح ممکن ہے کہ گھروالی مردوں کے اس قسم کے معاملات میں دخیل بھی ہوسکتی ہے۔ اور نہ اسکی یہہ سمجھ میں آیا کہ میری منکوحہ عورت ہوکر پھر وہ کسی طرح بھی نہ تو باہر پھر سکے گی اور نہ گنواروں اور ہندوانہ لباس پہنے پانی بھرتی پھرے گی۔ قصہ مختصر میں نے انکار کردیا اور وہ چلا گیا۔

لیکن اب گھر میں آکر جو یہہ لطیفہ چھوٹی بی کو جو سنایا تو وہ چونک کے بولی "سچ پوچھ" میں نے اس کو چہرہ کو دیکھا۔ یہہ واقعہ تھا کہ وہ اس تجویز کو پسند کرتی تھی۔ میں نے متعجب ہوکر کہا "ہوش میں بھی ہو کہ نہیں۔ کیا تم پسند کروگی کہ ایک جوان لڑکی سے میں نکاح کرلوں"

وہ بولی "مجھے منظور ہے"

میں نے اول تو یقین نہ کیا لیکن نہیں۔ واقعہ یہہ ہے کہ اس کو مزہ پڑ چکا تھا۔ سوکن کا سکھ اٹھائے ہوئے تھی۔ جانتی تھی کہ مار جوتیوں کے سیدھا کرلوں گی۔ ایک مفت کی خادمہ ہاتھ آئیگی۔ پڑی رہیگی گھر میں باندیوں کی طرح دراصل وہ خوب جانتی تھی گھر کی مالکہ وہ ہے۔ یہہ بھی جانتی تھی کہ میں اس کو کتنا چاہتا ہوں۔ مال اور جائداد۔ روپیہ پیسہ سب اسی کے نام ہے اور محبت کا میری یہہ حال ہے کہ آنکھ کے اشارہ پر کٹھ پتلی کی طرح کام کرتا ہوں۔ میری اور میری دل وجان کی مالک تھی۔ میرے پیارے بچوں کی ماں اور میری جان سے زیادہ پیاری بیوی۔ میں سچ سچ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ عقل کام نہ کرتی تھی کہ اس دنیا کی پیاری ترین چیز نے میرے اوپر کیسا جادو کررکھا ہے۔ تین بچوں کی ماں ہوچکی تھی مگر میرے لئے وہی نئی نویلی دلہن اور عشق ومحبت کا ایک شیریں خواب اور عیش وعشرت کا گنجینہ تھی جس نے میری زندگی میں نہ صرف ایک نئی روح پھونک دی تھی بلکہ میری جوانی کے لمحات کو پرکیف اور رنگین بنادیا تھا۔ اور یہہ واقعہ تھا کہ محض ایک اچھی نوکرانی نہ ملنے کے سبب خانہ داری کے جھگڑوں اور بچوں کے تقضیوں نے لطف زندگی کرکرا کردیا تھا۔ اور ان تمام باتوں کے علم اور احساس نے چھوٹی بیوی کو ایک قوت عطا کردی تھی جس کی بنا پر اس کو بھروسہ تھا کہ اس چھوٹی سی بادشاہت میں مجال نہیں جو کوئی راہ سے بے راہ ہوجائے۔ اس کا خیال بھی صحیح تھا لیکن پھر بھی میں نے منع کردیا۔ بلکہ ہنسکر جھڑک دیا کہ پاگل تو ہو مت۔ اور جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو میں نے کہا کہ بہتر ہے۔ اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں سے مشورہ کرلو۔ جو سب کی رائے ہوئی تو پھر دیکھا جائیگا۔ اسطرح فی الحال تو یہہ بات میں نے آئی گئی کردی۔ لیکن چھوٹی بیوی نہیں بھولی۔ اس نے جس سے بھی ذکر کیا اس نے کہا کہ ایسا مت کرنا۔ اسکا جواب

اس نے یہہ دیا کہ تم کیا جانو۔ مجھے تجربہ ہے۔ تم لوگوں کو تجربہ نہیں۔ اور نہ تم میرے میاں کو یا اس کے مزاج کو سمجھ سکتی ہو۔ لوگوں نے بھی سمجھا کہ یہہ حرکت ان کی گھر میں کوئی نئی نہیں۔ سمجھنے والی جانے۔ نفع نقصان کے پہلو ہر بات میں ہوں گے تو اس میں بھی ہیں۔ اور وہ تسلیم بھی ہیں لیکن ان کو نبہانے اور برتنے کا بیشک کسی کو تجربہ نہیں۔ سچ تو کہتی ہے کہ میں خوب نبہانا جانتی ہوں۔ نتیجہ یہہ کہ یا تو کسی نے زیادہ زور نہ دیا یا دیا تو چھوٹی بی نے اس کان سن اس کان اڑایا اور ادہر ناطقہ ماماؤں کی ضرورت سے ویسے بند تہا۔ چنانچہ پڑ گئی میرے پیچھے کہ بلاؤ ہیرا کو۔ چنانچہ میں نے اُسے بلایا۔ خود چھوٹی بی نے جملہ حالات تفصیل کے ساتھ معلوم کئے۔ خود طے کیا کہ جب ہماری مرضی ہوگی دو سو روپیہ دیکر نکال دیں گے۔ اور اُسے اطمینان دلایا کہ میں بڑے آرام سے رکہوں گی۔ گھر کے کام کی تفصیل بتائی۔ اسکا کیا تہا۔ وہ پہلے ہی راضی ہو گیا۔ نتیجہ یہہ کہ ہیرا کو بھیجا کہ تم جا کر لڑکی کی ماں سے گفتگو کرو اور معاملہ طے ہو جائے تو ہمیں تار دینا ہم یہاں سے روپیہ لیکر آجائیں گے۔

اب چھوٹی بیوی نے یہہ طے کیا کہ ساڑھے تین روپیہ کا شرعی نکاح کر لینا۔ جب جی چاہے گا طلاق دیدیں گے۔ میں نے بھی اب اس مسئلہ پر غور جو کیا تو سراسر فائدہ ہی نظر آیا۔ زرا غور کیجئے گا۔ بہلا کہاں ایسی نوکرنی مل سکتی ہے بغیر تنخواہ کی۔ چنانچہ خوب سوچ سمجھ کر ہیرا کو روانہ کر دیا۔

# چسکی

تیسرے روز ہیرا کا تار آیا کہ آجاؤ۔ چھوٹی بی نے بجائے دو سو کے نقد صرف سو روپیہ طے کئے تھے۔ دراصل خود اس کی غرض مجھ سے اتنی تھی اور اپنی ترقی کرانا تھی لہذا وہ دل سے خواہاں تہا کہ یہہ عجیب غریب رشتہ داری قائم ہو جائے اور وہ سو روپیہ ہی پہ معاملہ طے کر دینے کا وعدہ کرکے گیا تہا۔

چلتے وقت چھوٹی بی نے بڑی بیوی کا کچھ اوندہا سیدہا چاندی کا زیور تہا اس میں سے کئی چیزیں چھانٹ کر دیں کہ یہہ ساتھ لیتے جاؤ۔ کوئی پچاس ساٹھ روپیہ کا زیور ساتھ کر دیا۔

مجھے دراصل علاقہ بیکانیر کے ایک اُوجڑ سے گاؤں میں جانا تھا جو بیکانیر ریلوے کے ایک نہایت ہی چہوٹے سے اسٹیشن سے کوئی آٹھ دس کوس کے فاصلہ پہ تہا۔ میں نے اپنی روانگی کا تار دیا اور اسی روز چل کھڑا ہوا۔

اسٹیشن پر مجھے ہیرا ملا۔ میرے ساتھ نہایت ہی مختصر سامان تہا ایک اونٹ موجود تہا اور اس پر ہم دونوں بیٹھکر روانہ ہوئے۔

ہمارا راستہ ویران اور سنسان ریگستانی علاقہ میں ہو کر تہا۔ بے برگ و گیاہ کا میدان تہا اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے نظر آتے تھے۔ ٹیلے جو آج یہاں ہیں اور صبح کی ہوا سے شام تک وہاں پہونچے۔ نہ کوئی سڑک بن کر قائم رہ سکتی ہے۔ نہ ریل نکل سکتی ہے سوائے اونٹ کے کوئی دوسری سواری کام نہیں دیتی۔ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہم گاؤں میں پہونچ گئے۔ گاؤں کا ہیکو۔ گنی چنی جہونپڑیوں کا انتہا سے زیادہ مختصر مجموعہ تہا اور یہہ بھی سمجھ میں نہ آتا تہا کہ لوگ یہاں رہتے آخر کس خوشی میں ہیں۔ ہر چہار طرف ہے کہ دہول اڑ رہی ہے۔ دو چار پختہ مکان کیا ہیں۔ کھنڈر کہہ لیجئے۔ عجیب غریب ترکیب سے پتھر استعمال کرکے کوٹھریاں بنائی ہیں۔ ایسے کہ غالباً بارش ہو تو سب اندر آجائے۔ اسی قسم کے ایک مکان کے آگے جاکر ہمارا اونٹ بٹھایا گیا۔ ایک وسیع احاطہ تہا جس کی دیوار کانٹوں کی باڑہ سے بنائی گئی تھی اور اس احاطہ کے اندر گویا مکان تہا۔ مجھے لیجا کر ایک کوٹھری میں بٹھایا گیا جسمیں اونٹ کے بالوں کی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پہ ایک سرخ رنگ کا کہاروے کا گدا بچھا تہا۔ اور میرے پہونچتے ہی ایک بوسیدہ بیوہ آئی سخت ہیبت ناک گھونگٹ نکالے۔ ہاتھوں سے میں نے ضرور اندازہ لگایا کہ یہہ محترمہ قطعی چڑیل ہیں یہہ خیر سے لڑکی کی ماں تھیں اور فوراً انہوں نے میری خاطر مدارت کے ساتھ احکام نافذ کئے۔ جن کی تعمیل کے سلسلہ میں خود لڑکی پانی کا لوٹا لیکر آئی۔ لوٹا رکہکر دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے مجھے سلام کیا۔ مجھے بتایا کہ صاحب " یہہ چہوری ہے" اور میں نے اپنی اس عجیب و غریب منسوبہ کو اب سر سے پیر تک دیکہا

کوئی سولہ برس کی عمر۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی یعنی بہاری گورا۔ ناک نقشہ بجید سبک اور سڈول اور کافی دلکش۔ آنکھیں انتہا سے زیادہ چمکدار اور بڑی بلکہ خوبصورت۔ نہایت ہی تندرست۔ چھریرا بدن۔ میانہ سے قدرے نکلتا ہوا قد۔ نہایت ہی بھدی اور موٹے اور میلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھوں اور پیروں میں گلٹ کا زیور۔ ننگے پیر۔ ماتھے پر پیتل کا گول لٹو لگائے جس کو یہاں "بوند" یا بیر کہتے ہیں۔ اسکا نام چمکی تھا۔

اس نے لوٹا پانی کا لا کر رکھدیا اور چلی گئی۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا شام ہو گئی تھی اور میری طبیعت بیزار کسلمند تھی۔ مگر جی خوش ہو گیا جب چائے آئی۔ پودینہ اور دوسرے مصالحے ڈال کر کدھوں آدھ سیر دودھ پڑی ہوئی چائے تھی لوٹا گرم چائے کا کپڑے سے پکڑے اور خالی تھالی دوسرے ہاتھ میں۔ گویا چائے کی پیالی کے عوض تھالی تھی۔ میں نے اطمینان سے چائے پی دو ایک اور حضرات آئے تھے وہ جھانک جھونک کر چلے گئے۔ دراصل خود میں نے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ میں تنہائی پسند کرونگا۔

شب میں کام کی باتیں ہوئیں۔ چمکی کی ماں دروازہ کے پاس بیٹھ گئی اور اسکا بھائی یعنی ہیرا میرے پاس بیٹھا تھا۔ مجھے بولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سنا ضرورت سے زیادہ۔ معلوم ہوا کہ چمکی بڑی ہوشیار لڑکی ہے بھینسوں اور کھیت کے کام لیکر گانا ناچنا ڈھول بجانا تک جانتی ہے۔ ترکاریاں پکا سکتی ہے۔ گوشت تک پکاتی ہے۔ کپڑے بھی دھو لیتی ہے۔ محنت مشقت کا ہر کام کر سکتی ہے۔ بے عذر ہے۔ بھولی ہے۔ بد زبان نہیں ہے۔ ... نفرت رکھتی ہے۔ پنکھے بنانا جانتی ہے ... میں طاق ہے۔ پھر پنکھے میں گوٹ لگا کر اس میں رنگ برنگ کا ڈورے کے پھندنے عجیب و غریب نفاست سے ٹانکتی ہے۔ میں نے نمونہ دیکھے۔ پسند کئے۔ میرے بارہ میں اس کی ماں کو بتایا گیا کہ رئیس اعظم ہوں اور چھوٹی بی کے اخلاق حمیدہ کا اسقدر مبالغہ سے ذکر کیا گیا کہ بیان سے باہر ہے۔ بتایا گیا کہ قطعی وہ مرکھنی نہیں ہیں۔ بڑے آرام سے رکھیں گی۔ بچوں کے اوصاف حمیدہ بیان کئے گئے کہ رونے سے بیچارے

قطعی ناواقف اور مچلنے سے نابلد ہیں۔ چمکی کو قطعی حیران نہیں کریں گے کھانے کے بارہ میں بتایا گیا کہ روزانہ دونوں وقت گوشت پکتا ہے۔ گھی کے خرچ کا سال وہ خود جانتے ہی تھے فوراً تصدیق کی۔ پھر یہہ طے ہو گیا کہ جب چمکی کو دیکھنے آدمی کرایہ ملیگا اور چمکی خود آتی جاتی رہے گی۔ پھر سچ پوچھئے تو خود چمکی کا ماموں یعنی ماں کا چچا زاد بھائی ہیرا ضامن و ذمہ دار تھا۔ ڈرکا ہیکا۔ گھر کا معاملہ تھا۔ چنانچہ طے ہو گیا کہ کل صبح فوراً دوڑا کر اسٹامپ منگا لیا جائے اور اسی اونٹ پر نظامت کا عرائض نویس آجائے اور دستاویز تحریر ہو جائے اور چمکی کو لیکر میں چلدوں۔

دوسرے دن آدمی نظامت گیا اور دو اسٹامپ آئے۔ ایک پر میں نے لکھدیا کہ تمہاری لڑکی کو اپنی بنا کر رکھونگا۔ کوئی تکلیف نہ دونگا۔ پچاس کا زیور ابھی دیتا ہوں جو واپس نہ لونگا۔ سال کے چار جوڑے بنوا دونگا۔ چمکی گھر کا سارا کام کاج کریگی۔ عذر نہ کریگی۔ بیچ طا نہیں ماری جائیگی ٹھیک چال چلن سے رہیگی۔ اولاد جو ہوگی وہ گذارہ پائیگی اور اس کی پرورش میری ذمہ ہوگی۔ چمکی کا ماں کے رشتہ داروں سے ملنے سے نہیں روکونگا۔ سال میں ایک دفعہ یا دو دفعہ کا چمکی کی ماں کا آنے جانے کا کرایہ دونگا۔ چمکی کو ماں کے گھر سال میں ایک دفعہ بھیجونگا اور کوئی روک ٹوک نہ کرونگا۔ اگر نکالونگا تو دو سو روپیہ چمکی کو رخصتی کے دونگا۔ بیچ طل نہیں نکالونگا۔ تا دیباً موٹی لکڑی سے نہیں مارونگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا دستاویز میں نے بر بنائے مال اندیشی چمکی کی ماں سے لکھوا لیا کہ میں اپنی لڑکی چمکی کو اپنی خوشی سے دیتی ہوں۔ سو روپیہ کا چمکی کے سبب قرضہ تھا جو رقم میں نے تم سے لی۔ چمکی تمہاری ہو گئی چمکی اور آج سے تمہاری عورت ہے۔ تم نے چمکی کو زیور وغیرہ بھی دیا اور اس کو اپنی عورت بنا کر رکھو۔ تم کو اختیار ہے اور تم سے جو اقرار نامہ لکھایا ہے اس کی شرایط کی تم کو پابندی کرنا ہوگی۔ چمکی کی میں سگی ماں اور جائیز ولی ہوں اور مختار کل ہوں۔ اور تم کو چمکی کو سونپ دیا ہے اور تم اس کے خاوند و مختار ہو۔

دستاویزات عرائض نویس کے رجسٹر میں قاعدہ سے چڑھوا دیگئی

فریقین کے گواہوں کے روبرو دستخط ہوگئے اور گواہوں کے روبرو میں نے روپیہ اور زیور سنبھلوا دیا اور ماں نے چمکی کو سب کے سامنے مجھے سونپ دیا۔ اس کام سے تیسرے پہر تک فراغت ہوئی۔ اب یہہ طے ہوا کہ کل میں چمکی کو لیکر چلا جاؤنگا۔

لیکن شب میں ایک اور ہی معاملہ پیش آیا۔

## رخنہ اندازی

اس گاؤں سے کچھہ ہی فاصلہ پر ریگستان کے کنارہ پہاڑیوں کا سلسلہ تہا۔ اس کے دامن میں میلوں بنجر زمین چلی گئی تھی جہاں دو چار جہونپڑے بہیلوں کے تہے جو اپنی بھیڑوں اور مویشیوں کے گلہ رکہتے تہے اور یہیں چمکی کا کوئی رشتہ کا چچا بہی رہتا تہا۔ اسکا دور کا کوئی رشتہ تھا۔ اس کو شاید اس معاملہ کی خبر نہ تہی۔ تیسرے پہر کو جب معاملات طے ہوگئے تو گاؤں کا نائی آیا، "کچھہ" وارو،، کے لئے یعنی شراب کباب کیلئے انعام کے طور پر مانگا۔ میں نے دو روپیہ دیدئے۔ اس نے دو چار پنچ ذات بانبیوں یعنی چماروں کو اطلاع کردی اور وہ بہی آئے۔ میں نے دو روپیہ ان کو بھی دیدئے۔ اور غالبًا ان میں سے کسی نے جاکر چمکی کے زبردستی کے چچا کو خبر کردی کہ تمہاری بہاوج کا بہائی ہیرا آیا ہوا ہے جس نے چمکی کو کسی کے ہاتہہ بیچ دیا ہے۔ چنانچہ یہہ چمکی کا چچا نامودی دوڑا۔

شام کو میں جنگل کی طرف سے واپس آرہا تہا کہ میں نے دیکہا کہ ایک آدمی ہیرا کے ساتھ ٹہلتا میری طرف آرہا ہے۔ ہیرا سے دراصل اس نے یہہ کہا تہا کہ تم نے خود رقم لیکر اپنی بہن کو اُتو بنا کر لڑکی دیدی لہذا کچھہ روپیہ مجھکو بہی دلواؤ۔ ہیرا نے واقعہ بیان کیا کہ ایک کوڑی میں نے نہیں لی ہے جو دیا ہے وہ بہن کو دیا ہے۔ اس نے یقین نہ کیا اور اب یہہ معاملہ میرے روبرو ہیرا نے پیش کیا، اب مجھے ایک اور حقیقت معلوم ہوئی۔ وہ یہہ کہ چمکی کی منگنی کسی اور جگہ عرصہ ہوا طے ہوچکی تہی۔ پانچسو روپیہ لڑکے والوں سے ٹہرے تہے۔ پانچسو میں سے دوسو روپیہ وہ دے چکے تہے اور اب ان کے پاس کوڑی نہ تہی۔ نہ وہ بقایا روپیہ دیتے تہے اور نہ چمکی کی ماں لڑکی دیتی تہی۔ چالیس پچاس کا زیور بہی چمکی کی ماں لیکر خورد برد کرچکی تہی۔ اور اب سوال یہہ تہا کہ اگر چمکی کے چچا نے ان کو خبر کردی تو بڑا جھگڑا اٹھہ کھڑا ہوگا رہ گیا یہہ امر کہ چمکی کے چچا کو کچھہ دینا چاہئے یا نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ قاعدے سے کوڑی بہی نہ دینا چاہئے۔ بطور رشوت کے دیا جائے تو اور بات ہے مگر اندیشہ تہا کہ کہیں ان لوگوں کو اطلاع نہ کردے۔ جو سن پائیں گے تو ریگستانی سرحد پر رہنے والے لوٹ مار کے عادی۔ پیشہ ور ڈاکو جہپٹ کے چمکی کو کہیں لے نہ جائیں۔ میں چمکی کے چچا سے ملا۔ میں کیا جواب دیتا۔ سوائے اس کے کہ میرے پاس روپیہ نہیں ہے۔ گھر پر آؤ تو دے سکتا ہوں۔ بصورت دیگر یہاں رقعہ لکہہ لو۔ اس پر پہلا وہ کاہیکو راضی ہوتا۔ یہہ بہی اچھا ہی ہوا کہ میں نے اس کو کچھہ نہ دیا کیونکہ حقیقت یہہ ہے کہ وہ دراصل ایک تیز رفتار اونٹ پر ایک آدمی کو اطلاع کے لئے بہیج بہی چکا تہا۔ اور یہہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ چمکی کا چچا بے نیل ومرام واپس چلا گیا۔

رات کو مجھے خیال ہوا کہ واللہ اعلم خود چمکی بہی راضی ہے یا نہیں۔ لہذا میں نے ہیرا سے پوچہا۔ معلوم ہوا کہ نہ صرف راضی ہے بلکہ اپنے حسابوں وہ لندن میں بیاہ گئی ہے۔ بہت پیشتر سے شہر میں رہنے اور منہ سے رہنے اور عیش وآرام سے بسر کرنیکا نقشہ اس کے پیش نظر ہے۔ نمعلوم کیا کیا پروگرام مد نظر ہے۔ اور بطور اتمام حجت مجھہ سے کہا کہ میں خود تصدیق کرلوں۔ میں نے کچھہ سوچ سمجھکر مناسب سمجھا۔ چمکی کو بلایا۔ میں چارپائی پر لیٹا ہوا تہا۔ پاس ہی چمکی آکر بیٹھہ گئی۔ ہیرا کو میں نے اشارہ کردیا اور وہ اٹھہ گیا اور میں نے اب اس سے باتیں کیں۔ خوب اچھی طرح ٹھونک بجا کر پوچہا اور ہر طرح راضی پایا۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ راضی اور ثابت قدم پایا۔ ساتہہ ہی میں نے اسکو اچھی طرح اطمینان دلایا کہ بڑے آرام سے رکہونگا۔ اور کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اور اس کی آیندہ زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کو گنایا۔ دراصل اس نے کبھی کوئی شہر تک نہ دیکہا تہا۔ عمر میں صرف دو دفعہ ریل پر بیٹھی تہی اور ریگستان کی محدود چہار دیواری سے باہر نکلنے کی بیحد مشتاق تہی۔

رات کا ذکر ہے کہ میں سوگیا تہا۔ کوئی آدہی رات آئی ہوگی کہ ہیرا نے مجھے جگایا۔ معتبر ذریعہ سے اس کو معلوم ہوا تہا کہ چمکی کے چچا نے مجھہ سے

کل ملنے سے قبل ہی ان لوگوں کو اطلاع کرانے آدمی بھیج دیا تھا تو چکی کے دعویدار تھے۔ وہ لوگ کون تھے؟ خود وہ شخص جو چکی کا دعویدار تھا دو دفعہ کا ڈکیتی میں سزایافتہ۔ اور دوسرے رشتہ دار مویشی چرانے اور اسی قسم کے دھندے کرنے کے ماہر تھے غرض اندیشہ تھا کہ عجب نہیں راہ میں ہمیں دھر لیں اور چکی کو چھین لیں یا عجب نہیں کہ رات ہی میں ان پہونچیں اور نتیجہ یہہ ہو کہ یہاں سے روانگی ہی مشکل ہو جائے۔ میں یہہ خبر سنکر سخت پریشان ہو گیا سوال یہہ تہا کہ کیا کرنا چاہئے۔ بعد غور و خوض سے یہہ تجویز ہوئی کہ قبل از وقت رات ہی میں نکل چلنا چاہئے اور وہ بھی انتہائی خاموشی کے ساتھ (رخصتی کا روناملتوی کرکے) آسن پہ بیٹھا۔ دوسرے اونٹ پر ایک اونٹ والا اور ہیرا بیٹھا۔ ان کا اونٹ آگے اور ہمارا پیچھے اور رات ہی میں ہم تاروں کی چھاؤں میں چل پڑے۔ سیدھے راستہ کو پائیں طرف چھوڑا اور قدرے راستہ کاٹ کر پہاڑی کے دامن کے سہارے سہارے خاصی رفتار سے اونٹ چھوڑ دئے۔

رات کا اول حصہ اچھی طرح کٹا۔ لیکن ہمکو نہیں معلوم تہا کہ دشمن ہمارے تعاقب میں آتے ہیں۔ یہاں تعاقب کرنے کا طریقہ بھی خوب ہے۔ پیچھے پیچھے نہیں جاتے۔ بلکہ راستہ چھوڑ کر آگے نکلکر سامنے سے یا بازو سے پکڑتے ہیں۔ دو اونٹوں پر چار آدمی تلواروں سے مسلح ہو کر ہمارے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ سیدھے راستہ پر پڑ کر انہوں نے اپنے اونٹ چھوڑ دئے ہم سے آگے نکلکر راستہ کاٹا اور جب دایرہ بنا کر دیکھا کہ ہمارے اونٹوں کے نشان نہیں ملے تو سیدھے ہماری طرف جھک پڑے۔ نتیجہ یہہ کہ پو پھٹنے سے قبل ہی ہیرا نے بائیں طرف فاصلہ سے دیکھہ لیا کہ تعاقب کرنے والے آئے ہیں۔ کیونکہ تعاقب کرنے کے ریگستانی اصول کے مطابق اس سمت سے ان کے آنے کی توقع تھی۔ بہت جلد اونٹوں کو ہم نے صاف دیکھہ لیا۔ بہتر وقت ہم نے مشورہ میں گنوایا نتیجہ یہہ کہ اندھیاری کے بھوت کی طرح ریت اچھالتے اونٹ ہمارے قریب پہونچے۔ اونٹ والوں نے نعرہ مار کر للکارا۔ میں نے نیام سے نکلی ہوئی سروہی سونت لی۔ رکاب پر کھڑے ہو کر یکدفعہ تو دیکھا۔ اب ہیرا کی بزدلی ملاحظہ ہو کہ پکارتا ہے کہ ٹھہر جاؤ۔ چشم زدن میں ایک اونٹ اوسکے آڑ میں آگیا۔ میں کیا کرتا۔ اس طرح تو چکی کو چھوڑنے والا نہ تہا۔ اونٹ میرا مضبوط تہا میں نے اللہ کا نام لیکر نکیل اس کی دائیں طرف موڑی اور پوری رفتار سے اونٹ میدان میں چھوڑ دیا۔ سیدھا پہاڑیوں کے سلسلہ کی طرف اور دشمن ہمارے پیچھے۔ خوش قسمتی سمجھئے کہ صرف ایک اونٹ نے ہمارا تعاقب کیا دوسرا ہیرا کو گھیرنے میں رہا۔ مجھکو فاصلہ کافی ملگیا تہا اور میں اونٹ کو یا اونٹ مجھکو سچ مچ لے اڑا۔

کوئی آدہ گھنٹہ کی دوا دوش کے بعد آگے کا راستہ بند نظر آیا کیونکہ زمین سنگلاخ اور پہاڑی آڑ میں تھی اور صبح ہو رہی تھی۔ کوئی تین فرلانگ کا ہمارا تعاقب کرنے والوں سے فاصلہ رہ گیا تہا کہ میں نے اونٹ کا رخ سیدھا پہاڑی کی طرف کر دیا۔ سوائے اس کے کوئی چارہ ہی نہ تہا۔

جن لوگوں نے کوہ اراولی کی پہاڑیاں دیکھی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر موقعہ ملجائے تو ان پہاڑیوں میں آدمی ایسا چھپ جائے کہ ڈھونڈے نہ ملے۔ ایک جگہ درے کی صورت بنتی تہی میں نے اس طرف کا رخ کیا۔ دوسرا چارہ کار نہ تہا۔ اونٹ کو بٹھا کر جھٹ سے میں نے چکی کو اتارا۔ اور ہم دونو سیدھے پہاڑی کے ڈھلوان راستہ پر چڑھ گئے۔ یہہ خوب ہوا کہ اونٹ چھوٹتے ہی بھاگ گیا ورنہ دشمن معلوم کر لیتے کہ ہم کہاں اترے ہیں۔ اب ہم نے ایک جھاڑی میں سے دیکھا کہ ہمارے تعاقب کرنے والے ہمارے سامنے سے تیزی سے نکلے چلے گئے۔ میں نے چکی کا ہاتھ پکڑا اور اس کو لیکر جلد سے جلد آڑ میں روپوش ہو گیا۔ تہوڑی ہی دور جا کر تعاقب کرنیوالوں نے ہمارا خالی اونٹ دیکھہ لیا اور میں نے پہاڑی کی بلندی پر سے دیکھا کہ چاروں طرف متعجب ہو کر دیکھہ رہے ہیں۔ یہہ اندازہ لگانے کو کہ ہم کس جگہ اترے۔

لیکن ان جنگلی لوگوں سے بہلا ہماری کیا چلتی۔ مگر جدہر انہوں نے اندازہ لگایا وہاں سے ہم دور تھے۔ میں نے دیکھا کہ پہلے تو دوڑ کر انہوں نے میرا اونٹ پکڑا اور اس کی تلاشی لی۔ پھر دونوں اونٹ کو لیکر پہاڑی کے دامن میں آئے۔ ایک طرف جانے کا راستہ اوپر کی طرف تہا اور یہہ راستہ پہاڑ کے اس حصہ کی طرف جاتا تہا جہاں چھپنے کیلئے بہترین غار تھے۔ چنانچہ یہہ احمق یہہ سمجھے کہ ہم اسی طرف گئے ہونگے حالانکہ میں تو گھبراہٹ میں آنکھہ

پہنچ کر اندھا دھند چڑھ گیا تھا اور مجھکو کیا معلوم کہ اس جگہ کون سا مقام چھپنے کیلئے عمدہ ہے۔ صبح ہو چکی تھی اور سورج نکل رہا تھا۔ ان دونوں موذیوں نے اونٹ ایک جھاڑی سے باندھے اور تیزی سے چڑھنے لگے۔ ان کا راستہ آسان اور صاف تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ سیدھے اسی طرف چلے آرہے جدھر چھپنے کے مقامات دکھائی دے رہے تھے۔ اور میں ادھر چکی کا ہاتھ پکڑے صرف ایک پتھر کی آڑ میں بیٹھا تھا۔ نظر میری ان کی طرف لگی تھی۔ چشم زدن میں بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں وہ اوجھل ہو گئے۔ کوئی پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد میں نے پھر انکو دیکھا تو ایک بلند تر مقام پر تھے۔ آپس میں مشورہ کیا اور ہاتھ کا اشارہ ایک نے دوسرے کو کیا جس سے معلوم ہوا کہ فلاں سمت اختیار کریں گے۔ فوراً پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب میں ان پہاڑوں کی ساخت بھی بتانا چاہتا ہوں۔ سرخ رنگ کے پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ جگہ جگہ سوائے چند بیجا خار دار جھاڑیوں کے یا اکا دکا دوسرے اسی قسم کے سخت جان درخت کے سبزی کا نام نہ تھا۔ جگہ جگہ سخت ناہموار اور پتھریلے راستے تھے۔ سیکڑوں اور ہزاروں من کے بڑے بڑے پتھر جگہ جگہ پڑے تھے۔ ہر چہار طرف سے ناہموار راستہ نیچے جاتے تھے۔ چھوٹے بڑے پتھر لاکھوں کروڑوں من اسارے میں بکھرے ہوئے تھے۔ جہاں ہم کھڑے تھے اس کی پشت کی طرف تھوڑی دور ہٹ کر پھر ایک سخت ناہموار اور خطرناک ڈھال تھا جو پہاڑ کی گویا دوسری منزل تک چلا گیا تھا۔

میں نظر جمائے اسی طرف دیکھ رہا تھا جسطرف یہ دونوں غائب ہوئے تھے کہ ایکدم سے دونوں ایک قریب کی پہاڑی پر نظر آئے اور وہاں سے جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ ہماری پشت کی طرف نہ جا نکلیں اور پھر چوٹی پر اگر چڑھکر دیکھا تو ہم کسی طرح اپنے کو نہ چھپا سکیں گے۔ اس اندیشہ سے مجھے سخت تشویش ہوئی اور میں اسی فکر میں تھا کہ کیا کروں اور نظر گڑائے اس جگہ گھور رہا تھا کہ جہاں میرے اندازہ کے مطابق یہہ نکلنے والے تھے کہ ایکدم سے میں چونک پڑا! وہ دونوں موذی تو ہمارے سر پہ تھے! چوٹی پر پہونچے اور ہمیں دیکھتے ہی ایکدم سے ان کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ میں خود گھبرا گیا۔ حواس باختہ ہوکر میں نے ادہر ادہر دیکھا۔ اب یہہ دونوں سامنے سے اتر کر آئینگے سامنے اونٹ بندہے تھے۔ کوئی دو ڈہائی فرلانگ کے فاصلہ پر صرف اسی میں ہماری بچت تھی کہ ان سے پہلے اونٹوں کے پاس پہونچ جائیں۔ اگر کوشش کی جائے تو یہہ ناممکن نہ تھا۔ پھر دوسرا چارہ ہی کیا تھا۔ چنانچہ اُدہر وہ دوڑے نہیں ہماری طرف، اور ادہر ہم اترے نیچے۔ چڑہائی کی بہ نسبت اترنا دشوار ہے۔ وہ ٹھہرے جنگلی اور میں اس کا عادی نہیں مگر جس طرح بن پڑا ہوگا۔ وہ ہی اس تیزی سے کہ جگہ بہ جگہ گرتے گرتے بچا۔ مگر وہ دونوں اس تیزی سے آرہے تھے کہ بیان نہیں کرسکتا اور پھر ہماری نیت سے وہ آگاہ ہو گئے اور ہماری سیدھ چھوڑ کر انہوں نے بھی وہ راستہ پکڑا کہ اونٹوں کے پاس پہلے پہونچ جائیں۔ اب گویا ایک دوڑ تھی۔ ہم دونوں ان سے قبل پہاڑ سے نیچے آگئے اور پورے ایک فرلانگ کا فاصلہ ہمیں ملگیا۔ واہ ری جنگلی لڑکی! دوڑنے میں مجھ سے بھی چار قدم آگے تھی۔ ایسا بے تحاشا میں شاید کبھی نہ دوڑا ہونگا۔ راستہ میلوں کا بن گیا جسطرح بن پڑا طے کیا۔ جھٹ سے میں نے اپنا اونٹ کھولا۔ اب بٹھالتا ہوں یا چی کو تو بلبلاتا ہے۔ کمبخت بیٹھتا نہیں اور رہ رہا ہے چک پھیریاں اور دشمن ہیں کہ بخار کی طرح چڑھتے چلے آرہے ہیں۔ الہی کیا کروں لیکن جوں توں جھلک کر اونٹ کو بٹھایا۔ اور کوئی سو گز کا فاصلہ رہ گیا ہوگا کہ میں نے اپنی سروہی نیام سے کھینچی اور دشمن کے اونٹ کی داہنی کونچ پر بیدردی سے اس زور کا ہاتھ دیا ہے کہ ایک خوفناک بلبلاہٹ کے ساتھ وہ وہیں کا وہیں ڈھیر ہوکر بیٹھ گیا۔ چشم زدن میں معہ چکی کے اپنے اونٹ کی کاٹھی پر پہونچا۔ جبتک اونٹ اٹھے اٹھے دشمن ہم سے پندرہ بیس قدم کے فاصلہ پر تلواریں سونت کر آگئے تھے۔ میں نے کسکر اونٹ کو چھڑی جو ماری تو گڑگڑاتا ہوا ذرا سا چکرایا اور پھر جو بھاگا ہے تو ایسا کہ اگر سامنے سے ہٹ نہ جائیں دونوں تو میں نے کچل ہی دیا تھا۔ ہوا میں تلواریں چلکر ان کی رہ گئیں اور میں چشم زدن میں ریگستان میں پانی ہوگیا۔

# شکست

میری منزل مقصود اسٹیشن تہا اور اگر چمکی ساتھ ہوتی تو معدوم کدہر نکل جاتا کیونکہ جسطرف سے ہم بہاگے تھے ادہر جانیکا خیال بہی نہ تہا۔ مبادا کہ دوسرے اونٹ والے نہ ملیں۔ واللہ اعلم وہ کدہر گئے اور کہاں گئے۔ چمکی نے راستہ کی غلطی کو بتایا اور تب سے اسٹیشن کا رخ کیا۔ اب ان بدمعاشوں کی سنئے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ یہاں اسٹیشن پر آکر اول تو انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کو ملا لیا۔ ان کو کب گوارا تہا کہ ایک اجنبی اسطرح لڑکی لے جائے۔ انہوں نے آدمی دوڑا کر ایک طوفان زدہ کانسٹبل کو بلا لیا۔ اور نظامت میں تار علیحدہ دلوا دئے۔ قصہ مختصر یہہ موذی میرے انتظار میں تھے کہ میں اسٹیشن پہونچا۔ ہیرا کا حال سنئے۔ اس مخمصہ سے نکلنے کیلئے وہ حضرت بے تعلق ہوکر بہاگ گئے۔ اس شرط پر کہ ان کے خلاف کوئی کوشش نہ کیجائے۔ میرا اونٹ پہونچتے ہی یہہ لوگ چاروں طرف سے آگئے اور ان کو تو میں جانتا نہیں تہا لیکن چمکی کے نام نہاد رشتہ کے چچا کو میں نے پہچان لیا۔ اب میں نے غلطی محسوس کی کہ میں نے قطعی غور نہیں کیا۔ مجہکو پیشتر سے معلوم ہونا چاہئے تہا کہ دشمن اسٹیشن پر ہونگے۔ ذرا غور نہ کیا۔ وہ بہی دراصل اسوجہ سے کہ مجہکو نہیں معلوم تہا کہ اسٹیشن ماسٹر وغیرہ وغیرہ سب ملجائینگے میرے اترتے ہی سوالات کئے گئے۔ میں نے سچا سچا قصہ بیان کرکے دستاویز دکہایا جسکا جواب چمکی کے چچا نے یہہ دیا کہ یہہ سب جہوٹ اور غلط ہے۔ ونیز یہہ کہ ماں کو میرے ہوتے ہوئے کوئی اختیار نہیں جو لڑکی کو اسطرح کسی کو دیدے۔ یہہ عذر کہ لڑکی نابالغ نہیں ہے اور یہہ چچا نہیں ہے طے نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہہ کہ فی الحال مجہہ کو بتایا گیا کہ پولیس تہانہ چلنا پڑیگا، بلکہ پہلی گاڑی سے خود تہانہ دار صاحب آتے ہونگے۔ یہہ سنتے ہی میں سخت گہبرا لیا۔ یا اللہ میں کیا کروں۔ جو پولیس نے حراست میں لیلیا تو یہاں تو کوئی ضامن بہی نہ ملیگا۔ یہہ تو طے ہے کہ میں عدالت میں پہونچتے ہی فوراً چہوٹ جاؤنگا بلکہ عجب نہیں اگر انصاف کریں تو میں پولیس سے ہی چہوٹ جاؤں لیکن سوال یہہ ہے کہ پولیس والے بہی ٹہیکی کی ماں۔

ہیرا اور دوسرے لوگوں کے بیانات لینے سے پیشتر تو مجہے چہوڑنے سے رہے۔ اور جو اُن کے جی میں آگئی تو فراری کا مقدمہ قائم کرکے مجہے حراست میں لے کر اپنے آہستہ آہستہ مہینہ بہر تک تفتیش جاری رکہیں گے۔ سوال تہا کہ ایسے موقعہ پر اب مجہے کیا کرنا چاہئے۔ کیا یہہ کسی طرح ممکن تہا کہ میں چمکی کو چہوڑ چہاڑ کر بہاگ جاؤں۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب میرے بیانات کو صحیح مان کر کہہ رہے تھے کہ "جی ہاں۔ مگر تحقیقات کرنا بہی تو ضروری ہے" بظاہر مجہہ سے ہمدردی کر رہے تھے اور میں جانتا تہا کہ یہہ ریاکاری کر رہا ہے لیکن میں نے بہاگ جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہ کیا۔ دشمن کے دوسرے ساتہیوں کے بارہ میں لاعلمی ظاہر کی۔ مگر یہہ بہی اندیشہ تہا کہ وہ بہی پیدل رگڑتے ہوئے آتے ہونگے۔ چمکی کو اسٹیشن ماسٹر صاحب نے اپنے دفتر میں بٹہا دیا کیونکہ میں کس طرح گوارا نہ کرتا تہا کہ وہ دشمنوں کے قبضہ میں جائے۔ اور خود اسٹیشن ماسٹر صاحب سے باتوں میں لگ گیا اور باتیں بہی اس قسم کی کہ سبکو اندازہ لگ جائے کہ چمکی کو چہوڑ کر میں کسی طرح بہی نہ جاؤں گا۔ خواہ کچہہ بہی ہو جائے۔ میں نے کہدیا تہا کہ میں بڑی سے بڑی عدالت تک لڑونگا۔ میں نے دیکہا کہ سب میرے جوش و خروش سے اندازہ لگا چکے ہیں کہ چمکی کو میں چہوڑ کر نہیں جاؤنگا اور کسی کو میرے بہاگ جانے کا شبہ تک نہیں رہا۔ میں نے اِدہر اُدہر ٹہلنا شروع کیا اور دیکہا کہ کسی کو بہی شبہ نہیں ہے۔ باہر نکلا تو کانسٹبل نے میرے اوپر نظر رکہی۔ یہہ ایک چہوٹی سی پولیس چوکی کا کانسٹبل تہا۔ تہوڑی دیر میں اس کا بہی شبہ جاتا رہا۔ کیونکہ میں کئی دفعہ آیا اور گیا اور اِدہر اُدہر گہوما۔ ایکدم سے میں نے دیکہا کہ ہے موقعہ۔ لپک کر میں اپنے اونٹ کے پاس پہونچا اور چشم زدن میں بیٹہکر ہرا ہو گیا۔ ایک غل مچا اور میں نے مڑ کر دیکہا کہ لوگ میرے تعاقب کی نیت سے اونٹوں کی طرف دوڑے۔ مگر میں نکل چکا تہا اور مجہے بہاگنے کیلئے کافی فاصلہ مل گیا۔ مگر تعاقب کرنے والے بہی بلا کے تھے۔ میں نے اونٹ کی رفتار ایسی رکہی تہی کہ تعاقب کرنے والے میری گرد کو بہی نہ پاسکیں اور میں ریل کی پٹڑی کے سہارے سہارے بہاگا تہا کیونکہ مجہکو معلوم تہا کہ اگر میں نے ٹہیک رفتار قایم رکہی تو میں کسی نہ کسی طرح

بیکانیر کی سرحد پار کر جاؤں گا۔ میری سانڈنی بڑے دم خم کی تھی اور میں اس رفتار سے چلا تھا کہ آدہ گھنٹہ گذر گیا اور میں نے تعاقب کرنے والوں کو بار بار مڑ کر دیکھا مگر نظر نہ آئے۔ حتیٰ کہ مجھے شبہ ہوا کہ واپس لوٹ گئے۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی اور کاٹھی میں بیکانیری بادلہ (چھاگل) بندہا ہوا تہا میں نے اونٹ روکا اور پانی پیا۔ گلاس بادلہ پر کستے میں ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ میں نے نہایت ہی اطمینان سے اونٹ روکا۔ گلاس اوٹہایا ہی تہا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ فاصلہ پر میرے تعاقب کرنیوالوں کا اونٹ نظر آیا۔ ریگستان کے خاص حربہ کا خیال آیا۔ فوراً میں نے ریت سے گلاس کو بہر لیا۔ جیب میں گلاس کو رکہکر جہٹ سے بیٹھکر پہر پوری تیزی سے روانہ ہوگیا۔ اور اسی صبا رفتاری میں ایک جنگلی آدمی سے میں نے ہاتھ اوٹہا کر راہ پوچھی اوس نے سر ہلا کر بتایا جس سے مجھے تصدیق ہوگئی کہ میں ٹہیک سرحد کیطرف جارہا ہوں۔ میں نے مڑ کر اب تعاقب کرنے والوں کو دیکہا۔ دو آدمی تہے۔ سوال یہہ تہا کہ اگر میں نہ بہاگوں تو یہہ میرا کیا کر سکتے ہیں۔ گرفتار کرنے کا سوال ہی نہ تہا۔ پہر بہاگنے کی بہی حد ہوتی ہے۔ حملہ کرنے سے رہے۔ کیونکہ ایک آدمی وہی کانسٹبل تہا۔ رہ گیا دوسرا تو سوال یہہ تہا کہ تلوار میرے بہی ہاتہہ میں۔ میں کون اور وہ کون؟ لاحول ولاقوۃ۔ ایک سید زادہ اور ایک غلام اوسکا پیچہا کرے۔ فوراً میں نے سانڈنی کو روک کر کاوا دیکر گھمایا۔ چشم زدن میں ہم دونوں آمنے سامنے تہے۔ وہ اونٹ قریب لانے لگا تو میں نے سروہی نیام سے سونت کر کہا "خبردار…. …. فدا الگ۔

---

ماں بیٹی ہمارا انتظار بہت بے چینی کے ساتھ کر رہی ہوگی" یہ کہکر اس نے نرنجن کی سمت اپنا سر کرکے تعظیم کے ساتھ جہکایا اور چلنے کے لئے تیار ہوا۔ نرنجن بولا راستہ میں اندہیرا ہوگا اور موسم بہی خراب ہے میں لالٹین لیکر ابہی آتا ہوں۔ نرنجن لالٹین لیکر آگیا اور باپ بیٹے کے ہمراہ راستہ دکھاتے چلا۔ تہوڑی دور چل کر اس نے باپ اور بیٹے کے مسلسل انکار کے باوجود ملو کو اپنے کندہوں پر سوار کر لیا۔ دونوں ٹانگیں اپنی گردن کے گرد ڈالکر ایک ہاتھ میں لالٹین پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اندہے فقیر کا ہاتھ پکڑا اور چل پڑا۔

راستہ بتانے کیلئے ملو کی تیز نگاہیں اور دہان کے کہیت کی پگڈنڈی کافی تہی۔ چنانچہ وہ تہوڑی دیر بعد مکان کے قریب پہنچ گئے۔ دور سے ملو نے اپنے جہونپڑے کے باہر روشنی دیکہی اور چلا کر کہا "وہ رہا ہمارا مکان" باپو جی ہم پہنچ گئے ہیں"

ماں دیا ہاتھ میں لئے سامنے آپہنچی۔ نرنجن نے ملو کو اتار دیا اور وہ دوڑ کر ماں سے لپٹ پڑا "ماں ہم آ گئے۔ اب فکر کی کیا بات ہے"

نرنجن نے نتن کا ہاتھ چہوڑ دیا اور کہا "باوا، تم بڑے ہی خوش نصیب آدمی ہو" اور یہ کہکر ایک چہوٹا سا بنڈل اندہے فقیر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا "یہ ایک سوتی ساڑی ہے اپنی وفادار اور شوہر پرست بیوی کو پوجا کے تحفہ کے طور پر دیدینا اور ایک دہوتی بہی ہے اسے آپ پہن لیجئے گا" اور یہ ایک روپیہ اسے ملو کو دینا ایک دہوتی اور تمہیں اس کے لئے لے دینا۔" ساڑی اور دہوتی دراصل وہ چیزیں تہیں جو نرنجن نے اپنی بیوی اور اپنے لئے پوجا کے واسطے لی تہیں۔ اور جن چیزوں کو اس کی بیوی نے جلن میں پہینک دیا تہا اور جس کے بدلے ریشمی ساڑی لینے وہ اپنے بہنوئی کی طرف دیکہہ رہی تہی۔

اس سے پہلے کہ نتن نرنجن بابو کی مہربانیوں کے لئے شکریہ کے الفاظ منہ سے نکال سکتا نرنجن بابو وہاں سے چلدیا،

ہوا سائیں سائیں کر رہی تہی۔ بادل گہرے کہڑے تہے راستہ بہیانک اور ڈراؤنا تہا مگر نرنجن بابو بے خوف وخطر کسی پُراسرار طاقت کے سہارے پر چلا جا رہا تہا۔ وہ برابر چلتا رہا حتیٰ کہ اسے معلوم ہوا قریب کی ندی اسے اپنے آغوش سے باہر پہینکنے کے لئے تیار نہیں ہے وہ پانی میں پہنچکر اس پار نکلنا چاہتا تہا جس کا کنارہ آجتک کوئی نہ دیکہہ سکا ہے۔!!

---

# خوش نصیب فقیر

(جناب لطف قمر شنی صاحب ضابی۔ اے دہلوی)

"ملّو بیٹا، اٹھو، چلنے کا وقت آگیا، ملّو!"

یہ ماں کی آواز تھی اپنے آٹھ سالہ بچہ کو طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھانے کے لیے ماں۔ روزانہ یہی لفظ دہراتی تھی۔ آواز کا کچھ اثر نہیں ہوا تو ماں نے آہستہ سے بچہ کو ہوشیار کرنے کے لئے جھنجوڑا۔ بچہ بے خبر نیند میں تکیہ سے سرکتا سرکتا پلنگ کے آدھے حصہ میں پہنچ چکا تھا اور نیند سے غافل ہو رہا تھا کہ ایک مردانہ آواز نے بھی شریک ہو کر بچہ کو اٹھانے کی تدبیر کی "ہاں، بیٹا۔ جلدی اٹھو نہیں تو دیر ہو جائے گی۔ ملّو!" او یقیناً بڑی دیر کچھ سو چکے۔" بیٹا! سچ ہے کہ تیری عمر کے اور بچے ابھی آرام کی نیند سو رہے ہوں گے، مگر بیٹا تجھے آرام کہاں نصیب۔ تیرے لئے راحت کے کیا معنی، تجھے اپنا کام کرنا ہے۔ اٹھ میرے بیٹے!!"

اس کے بعد ایک سرد آہ تھی جو باپ کے کلیجہ سے نکلی اور لفظوں سے زیادہ طاقت اظہار رکھتی ہے۔ مگر جس بچہ کے لئے یہ الفاظ کہے گئے تھے وہ ایسی بے خبر نیند سو رہا تھا کہ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ماں نے اب کی بار بچہ کو کسی قدر معمولی شدت کے ساتھ جھنجوڑا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا جلدی جلدی منہ پر چھپکا مارا۔ ایک دو جھیاں لیں اور ماں کے پاس جا بیٹھا۔ ماں نے ناشتہ کے لئے کیا دستر خوان سجایا تھا اس کے اظہار سے دل کڑھتا۔ کیا کہا جائے کچھ ابلے ہوئے کھکرا لگرے چاول سڑا سا تیل۔ ایک ہری مرچ اور دو تین ابلے ہوئے آلو، یہ تھی وہ کائنات جو ماں نے لاکر سامنے رکھی تھی۔ نتن رام نے جو کھانا تھا کھا لیا تھا اور اب بیٹے کے فارغ ہونے کا منتظر بیٹھا تھا۔

بچہ نے چند نوالے پے در پے منہ میں ڈال کر جلدی سے تیار ہونے میں کوئی دیر نہیں لگائی۔ اٹھا۔ گلی کی اور کونہ میں سے لکڑی اٹھائی ایک سرا باپ کے ہاتھ میں دیا اور دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں لیا اور دونو باپ بیٹے گھر سے چل پڑے۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ آپ اس نابینا فقیر اور اس کے خورد سال بچہ کو شہر کی طرف آتے ہوئے ضرور دیکھیں گے۔ یہ اپنے گاؤں سے چلتے تھے، بہت سویرے اور شہر میں آکر گھر گھر، دکان دکان بھیک مانگتے تھے۔ انکا گاؤں شہر سے کوئی دس میل ہوگا۔ بڑی سڑک جو اس گاؤں کے پاس سے ہو کر شہر کی سمت جاتی تھی کوئی ایک میل کے فاصلہ پر تھی اور راستہ میں دہانوں کا ایک کھیت پڑتا تھا۔ نابینا نتن رام اور اس کا دبلا سا لڑکا اس کھیت اور سڑک پر سے ہوتے ہوئے شہر میں کوئی پانچ چھ گھنٹہ میں پہنچتے تھے اسلئے انہیں سورج نکلنے سے بھی پہلے نکلنا ہوتا تھا تب جاکر وہ دوپہر ہونے سے شہر میں آتے تھے۔ گھر گھر دکان دکان مانگتے۔ دوپہر ہوتے سایہ دار جگہ میں بیٹھکر کچھ مانگی ہوئی چیزیں کھا لیتے اور بچہ باپ کے زانو پر سر رکھکر گھنٹہ دو گھنٹہ سو لیتا اور تازہ دم ہو جاتا سہ پہر کو وہ ایک آدھ گھنٹہ اور ادھر ادھر بھٹکتے اور سورج چھپنے سے پہلے شہر سے چل پڑتے۔ رات ہوتے ہوتے گاؤں پہنچ لیتے۔ اصل دیر ہو جاتی رات کے نو بج جاتے تھے۔

اب کی بار پوجا کا تہوار بڑی جلدی آگیا۔ نتن کو دیکھ نہ سکتا تھا مگر دل کی آنکھ سے اس پر سب حال روشن تھا کہ اس کے لڑکے ملّو کے تن پر ایک معمولی اور میلا سا چیتھڑا لپٹا ہوا ہے

جو صرف گھٹنے سے اوپر اور ناف سے نیچے ایک لنگوٹی سی ہے اور عرصہ ہوا کہ وہ دہوتی کے طور پر کام دیتا تھا۔ پھٹتے پھٹتے وہ صرف ایک چیتھڑا رہ گیا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ جس چیز سے اسے تکلیف پہنچ رہی تھی وہ یہ خیال تھا کہ اس کی بیوی بھی تقریباً ننگی ہے۔ گو دیکھ تو اسے بھی نہ سکتا تھا مگر اسے خوب معلوم تھا کہ ایک دانے کے موقع پر کسی نیک آدمی نے پچھلے سال ایک دہوتی دی تھی وہ اس نے اپنی بیوی کو دیدی تھی جو ابھی تک چل رہی تھی۔ ایک سال تک چلتے چلتے وہ پھٹ گئی تھی۔ دوسری پوجا آگئی مگر غریب گھر والی کو ایک ایک سے سوا دہوتی ملنی نصیب نہ ہوئی اور اب بھی کوئی امید نہ تھی۔ مگر نتن سوچ رہا تھا تہوار کا موقع ہے آجکل شہر میں بڑی چہل پہل ہے لوگ ہزاروں کے سودے کر رہے ہیں مگر۔ مگر۔ یہ امیر دکان دار ان کے پاس دل نہیں ہوتا پتھر کا دل رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ہزاروں روپیہ بٹورتے ہیں مگر غریب کی مدد کے لئے ان کے پاس صرف چلکارا اور دھتکار موجود ہے۔ لیکن خریدار۔ ہاں خریدار دسیوں پچاسوں روپے کا سودا لیتے ہیں کسی بھلے آدمی کے لئے دو تین روپیہ کے کپڑے ایک غریب خاندان کیلئے بازار سے دلوا دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

نابینا اپنے خیالوں کو لئے ہوئے گھر سے نکلا۔ سورج نکل رہا تھا اور یہ دونوں دہانوں کے کھیت میں آدہا راستہ عبور کر چکے تھے۔ یکایک ملو نے لکڑی کا اپنی طرف کا سرا پر چھوڑ کر تالیا بجاتے ہوئے کہا۔ "باوا، باوا، ذرا دیکھنا جہاں آسمان اور یہ کھیت مل رہا ہے کیسی آگ سی لگ رہی ہے۔ ایک ندی سی آگ کی بھی جا رہی ہے۔ باوا، وہاں چلا جاؤں، کیسا سہانا دریا ہے!" ملو بڑے غور اور شوق سے سورج کے نکلنے کا انتظار دیکھ رہا تھا وہ کئی بار یہاں سے گذرا تھا یہی وقت گذرا تھا مگر کبھی اس نے مشرق سے سورج نکلنے کا یہ تماشا نہیں دیکھا۔ نتن کی جب آنکھیں تھیں تو وہ بھی یہ نظارے دیکھا کرتا تھا اس نے جوش و خروش پر سرد آہ بھر کر تصور کی آنکھ سے دیکھا ایک دریائے آتشیں مشرق کے افق پر بہہ رہا ہے۔ اس کے کنارے سنہری ہیں اور چکا چوند آنکھوں کے لئے ایک حیرت انگیز نظارہ ہے۔ دل کے لئے سرور ہے اور دماغ تو حیرت سے کام ہی نہیں کرتا۔ ادہر ادہر چند پہاڑی نظارے۔ کچھ نیل کے کھیتوں کا منظر اور آفتاب کے طلوع کا نظارہ نتن نے تصور کیا۔ وہ وقت یاد کیا جب اس کی آنکھیں بالکل اچھی تھیں اور وہ اپنا ہل لیکر سورج نکلنے سے پہلے اپنے کھیت پر جو بہت دور تھا پہنچ جایا کرتا تھا۔ اور جب سورج کی دمک دیکھتا تو حیرت سے ٹھٹک جاتا آج جبکہ اس کی آنکھیں نہ رہی تھیں اس کے تصور کی آنکھ بہت حساس ہو گئی تھی اور اس نے آج لڑکے کے اشارہ پر وہ وہ مشاہدات کئے جو شاید تھا نکے پن میں بھی کبھی نہ کئے تھے۔

لڑکے نے اپنا سر اٹھایا اور چلنے کے لئے ایک دو قدم بڑھائے مگر باپ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ بچارے ملو کو اب اپنی غلطی کا علم ہوا اس کا باپ تو اندہا ہے اس سے نظارۂ آفتاب کا ذکر کرنا کیا معنی لڑکا کچھ شرمندہ ہوا اور کہنے لگا، "باوا، مجھ سے بھول ہوئی تم تو دیکھ نہیں سکتے، پر سچ کہتا ہوں ایسی خوبصورت چیز میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی تھی"۔ نتن نے سمجھا لڑکے کو شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ وہ جھٹ بول اٹھا، "ہاں، بیٹا اچھا ہے جو کچھ تم نے دیکھا، ٹھیک بہت خوبصورت آسمان ہوتا ہے جب صبح سورج نکلتا ہے، میں خوش ہوا کہ تم نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ تو اب چلو!" یہ کہکر وہ چل پڑا۔

وہ عام سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑکیں معلوم کس زمانہ میں بنی تھیں، ان کی مرمت کا خیال کسے آتا تھا اور اگر آتا بھی تھا تو "مالی مشکلات" کا مستقل عذر آڑے آجاتا تھا۔ اصل میں تو یہ سڑک پیدل چلنے والوں کے لئے نہیں تھی مگر کبھی کبھی ان پر گاڑیاں۔ ٹھیلے۔ اور لاریاں بھی گذرتی دیکھی گئی تھیں۔ اب تو موٹریں بھی یہاں سے جانے لگی تھیں۔ حالانکہ یہ سڑک موٹروں کیلئے نہ تھی۔

پتلی سی سڑک۔ ٹوٹی پھوٹی۔ بیچارے راہگیر دِنوں کے اسے دن شکار ہوتے رہتے تھے۔ بلی۔ کتا کوئی بکری وغیرہ شکار ہو جاتے تو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا کہ کیا ہو گیا۔ ہاں اگر کوئی آدمی جھپٹ میں آگیا تو واقعہ "سانحہ" کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ ذرا گڑبڑ ہوتی تھی۔ کبھی کبھار مقدمے بھی چل جاتے تھے۔ جرمانے بھی دو ایک پر ہو گئے۔ اور بس معاملہ ہمیشہ ختم ہو جاتا تھا۔ اگر آپ نے یہ کہہ دیا کہ صاف سڑک کو بڑا کیوں نہیں کراتے اس کی مرمت کیوں نہیں کرائی جاتی تو بڑی مالی مشکلات کا پتھر آپ کے دماغ پر اس زور سے مارا جائیگا کہ حواس جاتے رہیں گے اور آپ کے سارے اعتراض دھرے رہ جائیں گے۔ بلکہ آپ کو قائل ہو جانا پڑیگا۔ عقلمند آپ سے کہیگا:-

"بابو جی" بات یہ ہے حادثے تو حادثے ہی ہیں ہوتے ہیں اور ہوتے رہینگے۔ معلوم ہے آپ کو سلطنت برطانیہ میں حادثات کی تعداد کیا ہے۔ مجھے تو معلوم ہے۔ بتاؤں آپ کو اعداد وشمار صرف ایک ہی سال کے میں نے سرف ۱۹۳۴ء میں (۷۱۲۵) آدمی مارے گئے۔ (۲۱۲۶۴۱) زخمی ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کو ترقی کرنی ہے اور تہذیب سے رہنا ہے تو اسے یہ خراج ضرور دینا پڑیگا۔ اسے تو آپ کسی طرح بھی نہیں روک سکتے۔ کیوں صاحب! جھوٹ کہتا ہوں میں؟"

آپ کو کچھ شرمندگی سی ہوگی۔ عقلمند ترقی پسند انسان فاتحانہ اکڑے آپ کی طرف دیکھیگا اور آپ سوچنے لگیں گے کہ جہاں تک موجودہ تہذیب وترقی کے تعلق ہمارا ملک بیشک بہت پیچھے ہے۔ اسے شرم آنی چاہئے کہ اموات اور مجروحین کی تعداد بڑھائے وہ اپنی ذمہ داری محسوس کرے اور سوچے کہ تہذیب کے دائرہ میں آنے کے لئے حادثوں اور سڑک کے سانحات کی تعداد بڑھانے کے لئے اسے کتنے آدمی مارنے ہونگے اور کتنے مجروح کرانے ہونگے!

ملّو کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ چلنا پڑتا تھا اور نتّن بھی بہت چوکنا رہتا تھا۔ نتّن نے جہاں کسی موٹر کی آہٹ آدھے پونے میل سے سنی وہ بھانپ جاتا تھا خطرہ قریب آرہا ہے۔ فوراً کہتا بیٹا سڑک کے بالکل کنارہ کنارہ ہو کر چل۔ مگر موٹروں سے زیادہ تکلیف اور خوف ملّو کو جس چیز ہوتی تھی وہ ایک بڑا ہیبت ناک جانور تھا۔ اکثر ملّو کو اس سڑک پر کہیں سے آتا ہوا ایک ہاتھ دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑ کی طرح اونچا جانور دو ہیبت ناک دانت منہ میں سے نکلے ہوئے اور سونڈ کو اِدھر اُدھر بھیانک طریقہ سے ہلاتا ہوا وہ جب گذرتا تو ملّو کا خون خشک ہو جاتا۔ آج اس نے سوچا کہ ہاتھی نہیں دکھائی دیگا۔ مگر جس چیز کا ڈر ہو اس کا خیال کرنے سے ہی وہ چیز سامنے آجاتی ہے چنانچہ آج بھی ہاتھی سامنے سے جھومتا ہوا آتا دکھائی پڑا اور ملّو سہم گیا۔ اور باپ سے کہا۔ "بابا ہاتھی تو پھر آرہا ہے"

باپ نے بچہ کے ڈر کو محسوس کرکے کہا "بیٹا گھبراؤ نہیں۔ مجھے سڑک کے کونہ کے کھڑا کردو اور تم سڑک سے ادھر کی طرف کھڑے ہو جاؤ جب ہاتھی گذر جائے راستہ چلنا پھر شروع کردو"

بچہ نے ایسا ہی کیا۔ باپ کو ایک طرف کنارہ سے کھڑا کر دیا اور خود ایک طرف دبک کر بیٹھ گیا۔ ہاتھی قریب آنے لگا تو اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جب اندازہ سے یہ محسوس ہوا کہ ہاتھی کچھ فاصلہ پر نکل گیا ہوگا اور اب اسے پہاڑنے کیلئے واپس آنا پسند نہ کریگا تو ملّو نے بھی اپنی ایک آنکھ نصف کے قریب ڈرتے ڈرتے کھولی اور ہاتھی کو آگے جاتا دیکھکر اپنی کمین گاہ سے نکل آیا۔ باپ کو شہر کی طرف لے چلنے کیلئے اُسنے پھر وہی انہماک شروع کردیا۔

# باب دوسرا

دونوں شہر میں داخل ہوئے پوجا کی وجہ سے شہر میں بڑی چہل پہل تھی مگر ہر شخص اپنے کام میں اسقدر تیزی کے ساتھ مصروف تھا کہ خیرات دینا تو کجا بات کرنے کی بھی فرصت نہ پاتا تھا۔ نابینا نے اپنی صدا لگائی:-

"اندھے کو دیدے بابا۔ اندھے کو دیدے مائی۔ بھلا ہوگا بابا ایک پیسہ دیتا جانا!"

دن بھر ہو گیا پھرتے پھرتے مگر جھولی خالی اور پیسہ بھی ایک نہ آیا تھا۔ آخرکار وہ ایک خالی بنگلہ کے پاس پہنچے اندر بہت لوگوں کی

آوازیں آرہی تھیں۔ نابینا فقیر نے دل میں سمجھا اونچا گھرانا ہے بہت سے آدمی جمع ہیں یہاں اچھی خیرات ملیگی۔ نابینا فقیر نے آواز لگائی "اندھے کو دیدے بابا، اندھے کو دیدے مائی۔ بھلا ہوگا بابا، ایک پیسہ اندھے کو بھی دیتا جا"!

بوڑھا نابینا فقیر بنگلہ میں چلا گیا اور آواز لگاتا رہا۔ ایک آدمی نے چلا کر کہا "جا جا نکل جلدی یہاں سے۔ صاحب پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں اور تیرے لئے کچھ رکھوا نہیں گئے ہیں چل چل جلدی یہاں سے"!

یہ آواز بنگلہ کے چوکیدار کی تھی۔ مسٹر مہتا اور ان کی بیوی پوجا کی چھٹیاں منانے کے لئے شیلانگ گئے ہوئے تھے اور نوکر نے سارے بنگلہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس اوکھے وقت میں وہ اپنے یار دوستوں کو جو قریب ہی رہتے تھے دعوت دے رہا تھا اور کافی آدمی جمع تھے۔ بنگلہ کا سامان فرنیچر۔ چرائے ہوئے کیک۔ بچے ہوئے بسکٹوں کے انبار اور باورچی خانہ کی ساری چیزیں تو قبضہ میں تھیں ہی یار دوستوں کی تواضع کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کونسا مل سکتا تھا۔ آس پاس کے خانساماں بیرے۔ خدمتگار اور دیگر ایسی قماش کے دعوتی کرسیوں۔ صوفوں پر پڑے صاحب لوگوں کا پارٹ ادا کر رہے تھے۔ چا ر پک رہی تھی۔ سامان نوش جان ہو رہا تھا اور ایک دوسرے سے زیادہ دُون کی لے رہا تھا۔ ایک بولا "بڑا ہی بدمعاش ہے یہ بڈھا جب اسے دیکھا اندھا دیکھا"، دوسرا بولا "اجی نہیں، بنتا ہے آنکھیں اس کی دیکھو کیسی جھپک رہی ہیں! دن بھر بھیک مانگتا ہے اور شام کو اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو جاتی ہیں"!

"اندھا ہوں بابا اندھا، دیدے بابا ایک پیسہ بھلا ہوگا، بھلا"!

ایک نے کہا "یار، اتنا سامان جمع کیسے کیا؟" چوکیدار نے بڑے فخر سے کہا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ نوکروں کا کام ہاتھ کی صفائی دکھانے کا ہے۔ روز تھوڑی تھوڑی چیزیں اڑاتے رہے"!

"مگر سُنا ہے میم صاحب بہت دیکھ بھال کرتی ہیں"

"اجی بڑی ہی کنجوس ہے، ایک پیسہ کا سودا مہنگا آجائے تو الٹا واپس کرا دیتی ہے، یہ تو بھیا تعلیم ہے تعلیم ایک ایک پیسہ کا حساب جان گئے ہیں مگر تم جانو ہم بھی یہی کام کرتے ہیں دھوکہ دیتا ہوں"!

"ہاں استاد، کیوں نہیں آخر پرانے آدمی ہو"۔

"دیدے بابا، اندھے فقیر کی بھی سُن لے، ایک"!

"ابے، گیا نہیں تو ابھی، چالاکیاں کرنے کیلئے کہیں اور جا، یہاں تو دوسروں کو بھی لوٹ لیں۔ تجھے کیا دینگے"!

ایک بولے "بڑا باتونی ہے یہ فقیر اور ایسا بنا پھرتا ہے جیسے واقعی اندھا ہو"!

ملّو کے دل پر چوٹ لگی اور بولا "بابو جی، نہیں ایسا مت کہو باوا کو کچھ نہیں دکھائی دیتا وہ کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتے"، اس پر اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ چوکیدار کو یہ حالت دیکھکر بہت ترس آیا اور اس نے کہا "اچھا، اچھا ٹھہر وہیں میں تیرے لئے ایسا سامان لاتا ہوں جو آجتک تو نے دیکھا بھی نہ ہوگا"!

یہ کہکر وہ اندر سے کچھ کیک کچھ انگریزی مٹھائیاں اور بسکٹ لیکر باہر آیا اور فقیر کی جھولی میں ڈالدئے۔ فقیر دعائیں دیتا ہوا بنگلہ سے نکل پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔

سورج بہت گرم ہو چکا تھا اور انہیں بھوک بھی لگ رہی تھی اس لئے ملّو اپنے باپ کو ایک سایہ دار جگہ پر لے گیا۔ ملّو کو متن نے کچھ کھانے کو دیا اور خود کچھ نہ کھایا۔ وہ کہنے لگا "بیٹا تم ایک نابینا فقیر کے لڑکے ہو تمہیں ایسے نرم دل بنے رہے کہ بات بات پر آنسو ٹپکیں تو گذارہ کیسے ہوگا۔ بھیک پر چلکارے کھانا۔ دھتکار پھٹکار برداشت کرنا در در کی ٹھوکریں کھا کر باتیں سن کر پیٹ بھرنے کا سامان کرنا آسان کام نہیں ہے"، یہ کہکر اس نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سرد آہ بھری۔

وہ خود کچھ کھانا نہیں چاہتا تھا تاکہ کھانا بچ جائے کہ وہ اپنی بیوی گنگا منی کو دکھا سکے انہوں نے دن بھر میں کیا جمع کیا تھا اور وہ کیسی عجب چیز تھی۔

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ملّو سو گیا۔ جب دوپہر کا سورج ذرا

ڈھلنے لگا تو باپ بیٹے پھر چل پڑے ۔۔۔ دو مارکیٹ میں پہنچے۔ کہیں سے ایک کیلا۔ کہیں سے دو ایک آلو۔ ساگ کی پتیاں۔ سڑے بھُسے پھل ان کی جھولی کے بوجھ کو بڑھاتے رہے۔ باپ بولا ملو مجھے کسی بڑے کپڑے والے کی دکان پہ لے چل۔

ایک دکان راستہ میں پڑتی تھی۔ مگر دکان تک پہنچنا مشکل کام تھا بھیڑ بہت تھی۔ اور سڑک پر موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ راہگیروں کا ہجوم بیحد بڑھ گیا تھا۔ ایک نابینا فقیر اور اس کے سہمے ہوئے بچہ کیلئے راستہ سے زور آزمائی کرنا آسان کام نہ تھا۔

ملو باپ کو لئے سڑک کے کنارہ کنارہ چل رہا تھا کہ ایک سائیکل سوار گھبراہٹ میں جو اترا تو بچہ جھپیٹ میں آگیا اور سہم کر ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ سائیکل سوار تیوری پر بل ڈالکر بولا "مرنے کیلئے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ راستہ میں چلا آتا ہے اندھوں کی طرح"

ملو ڈر گیا اور بڑی مشکل سے ایک طرف کو نکل کر پٹری کے پاس جا کھڑا ہوا۔ سامنے ایک موٹر تھی بہت وسیع و عریض۔ بڑی چمکدار اور خوبصورت اپنے مالک کی امارت و نفاست طبع کے اشارہ کر رہی تھی۔

ملو کے کہنے پر نتن نے آواز لگائی! "اندھا ہوں بابا، مائی کے نام پر ایک دھوتی دلوا دے کوئی داتا، کوئی۔ کوئی میری بھی سن لو اندھے فقیر کی"

ملو نے باپ کو موٹر کے اور قریب کر دیا۔ فقیر نے پھر آواز لگائی۔ موٹر میں بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کہا "بہت ہیں تم سے زیادہ مستحق، آگے جاؤ آگے"

عورت کی آواز پہچان کر نتن نے کہا "مائی جی ایک سستا سا کپڑا تن ڈھانکنے کو"

ایک عورت گرج کر بولی "ہم مائی ہیں، ہم مس صاحب ہیں آئندہ ایسا مت بولنا"

اتنے میں دوکاندار کا آدمی بنارسی ساڑھیوں کے تھان لئے آ پہنچا اور عورتوں کو دکھانے لگا۔ ایک اور عورت نے موٹر میں سے کہا "جبتک یہ منحوس سامنے کھڑا ہوا ہے ہم آرام سے سودا کیا خرید سکتے ہیں۔ پہلے اسے آگے بھگائیے"

دوکاندار کے آدمی نے ملو کی گردن پکڑ کر دھکا دیا وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے گرا۔ لکڑی ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔ آدمیوں کی بھیڑ میں اسکا تلاش کرنا لاتیں کھانے کے لئے جانا تھا اس لئے بچہ باپ کا ہاتھ پکڑ کر پھر آگے بڑھا:۔

# تیسرا باب

"صبح سے سارے دن کا اندازہ ہو جاتا ہے"۔ مگر اس روز ایسا نہیں ہوا۔ صبح کو آسمان پر بادل نہ تھے بالکل صاف اور چمکدار سورج نکلا ہوا تھا مگر شام ہوتے ہوتے آسمان پر بادل آنے شروع ہو گئے لیکن موسم کی گرمی اور لوگوں کی بدحالی ٹھنڈی ہوا چلنے سے ذرا بدل گئی۔ نتن کو آج کے تجربات نئے نہیں معلوم ہو رہے تھے اس کے لئے ہر مصیبت مصیبت ہی تھی اور اپنی ساری مصیبتوں کی وجہ پچھلے جنم کے کرموں کو بتاتا تھا۔ کہتا تھا "تم جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے"۔

وہ گھر سے ابھی بہت دور تھے ملو کو بہت زور کی پیاس لگ رہی تھی۔ قریب پانی پینے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اور نہ کوئی مکان دکھائی دیتا تھا۔ سنسان سڑک پر وہ چلے جا رہے تھے مگر ملو پر پیاس دم بدم بڑھتی معلوم ہو رہی تھی۔ لکڑی کھو گئی تھی اور ملو اپنے باپ کا ہاتھ پکڑے لئے جا رہا تھا۔ باپ بچارا کیا مدد کر سکتا تھا۔ آخر کہنے لگا اگر آس پاس کوئی مکان ہو تو وہاں چل کر پانی کو پوچھیں مگر مکان ہندو کا ہونا چاہئے اور نیچ ذات کا نہ ہونا چاہئے ورنہ پانی نہیں پیا جا سکتا۔ ملو بولا ایک جگہ روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ شاید آدھ گھنٹہ کا راستہ اور ہو گا۔ وہاں چل کر پوچھیں گے کہ کہیں پینے کے لئے ذرا سا پانی بھی مل سکتا ہے۔

جس وقت نابینا فقیر اور ملو نرنجن بابو کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے وہ مکان کے صحن میں ایک بید کی آرام کرسی پر لیٹے ہوئے

اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر نظر ڈال رہے تھے۔ بعض لمحے انسان کی زندگی میں ایسے آجاتے ہیں کہ وہ تلخیوں سے بیزار ہو کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بس ایک ایسا ہی لمحہ تھا جس پر نرنجن بابو، ایک نوجوان دکھی کریجویٹ پہنچ چکا تھا۔ کہ اندھا فقیر آپہنچا۔

اس کے دوست رشک کرتے تھے اس کی زندگی پر کیونکہ اسے امتحان پاس کرتے ہی ایک نوکری مل گئی تھی جو آج کل ناقابل یقین چیز معلوم ہوتی ہے۔ نرنجن طالبعلم ہی تھا کہ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ امتحان پاس کرتے ہی اس کے ہم زلف نے جو ایک اچھا وکیل اور وسیع اثر کا آدمی تھا کوشش کر کے نوکری دلوا دی۔ اگرچہ اس کی تنخواہ صرف (۴۰) روپے تھی مگر پھر بھی غنیمت تھی کیونکہ عام طور پر آدھر ایک گریجویٹ (۱۵) (۲۰) روپے سے زیادہ نہیں کما سکتا نرنجن کا گاؤں شہر سے سات میل کے فیصلہ پر واقع تھا اور اسے دفتر جانے کیلئے پیدل سفر کرنا پڑتا تھا وہ بائیسکل بھی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ وہ ایک ذاتی آرام کی چیز ہے اور جبتک وہ اپنے مرحوم باپ کے چھوڑے ہوئے وسیع قرضہ سے بالکل سبکدوش نہ ہو جائے ذاتی آرام و تفریح کے چیزیں خریدنے کے دھیان بھی نہیں کر سکتا تھا وہ دفتر سے کام کر کے محنت و مشقت کے باعث چور ہو کر واپس آیا۔ چونکہ چھٹیاں ہونے والی تھیں اس لئے پچھلا حساب اور کام سب درست و مکمل کرنا تھا۔ یہ نامکمل کام صرف اس ہی کے نہ تھے۔ اسے دوسروں کے کام بھی کرنے پر ہوتے تھے اس کے بغیر وہ دفتر میں گذارہ کیسے کرتا۔ خیر۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ گھر پہنچا تو نوکر نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی بہن کے ساتھ کار میں بیٹھکر شہر چلی گئی ہے اور کل شام تک مکان پر واپس نہیں آئے گی۔

بہن کے ساتھ شہر چلے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا مگر وہ شہر جانے کا مقصد خوب سمجھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ کچھ روز ہوئے اس نے پوجا کے تہوار کے لئے کچھ چیزیں خریدیں تھیں جن میں ایک سوتی ساڑھی بھی تھی۔ بچارا غریب کلرک اس سے زیادہ اور کیا اپنی بیوی کو پوجا کا تحفہ دے سکتا تھا مگر تعلیم یافتہ بیوی کو شوہر کی حالت پر ترس آنے کی بجائے غصہ آیا اور اس نے سوتی ساڑھی دیکھکر آگ بگولہ ہو کر کہا۔ "پوجا سال میں ایک بار ہوتی ہے۔ تہوار کے روز کوئی بھی ایسی خراب چیز پہنتا ہے۔ اگر تم مجھے خوش نہیں رکھ سکتے تھے تو شادی مجھ سے کیوں کی تھی" اور پھر ایک مخصوص طعن کے ساتھ جو صرف عورتوں کا ہی حصہ ہے بولی: "مجھے معلوم ہے کہ تم اگر دو مہینہ کی تنخواہ بھی لگا دو تو میری مرضی کی ساڑھی نہیں خرید کے دے سکتے اور اگر خرچ کر بھی دو تو کیا تعجب کی بات ہے اور یہ بات تو تم کبھی بھی نہیں بھول سکتے کہ نوکری تمہیں کس نے دلوائی ہے۔ اگر میری بہن کے شوہر کی مہربانی نہ ہوتی تو نوکری مل ہی تو جاتی" اور یہ کہکر اس نے ساڑھی اٹھا کر ایک چھوٹی میز پر پھینک دی اور ذرا تسلی دیتے ہوئے کہا، "خیر آپ کو دو مہینہ کے تنخواہ کیا دو روز کی تنخواہ بھی مجھ پر خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑیگی۔ میں شہر جاؤنگی اور ریشمی ساڑھی مجھے میرا" جنوائی بابو،، دلوا دیگا۔ تم کیا دلواؤ گے،، اس بات کو جب نرنجن نے دوبارہ غور کیا تو شرم و ندامت سے عرق عرق ہو گیا۔ اپنی حالت اسے کتے کی زندگی سے زیادہ بدتر معلوم ہونے لگی۔ ایک بار نہیں بار بار اور بعض وقت نہایت گہرے اور مخفی موقعوں پر اس کی بیوی یہ بات منہ پر لا چکی تھی کہ اسے اس جیسی لڑکی سے شادی ہرگز نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ آج وہ اس کا خیال کئے بغیر اجازت لئے بغیر شہر چلی گئی؟" اس نے سوچا اس زندگی کو۔ اس بیوی کو۔ اس سارے جھمیلے سے کیونکر نجات حاصل کرے اور آرام کی زندگی گذارنے لگے۔

نوکر کو بخار ہو گیا تھا اور اسے کھانا بھی خود ہی تیار کرنا پڑے گا تھکا ہوا ہے تو ہونے دو کھانا تو پکانا ہی پڑیگا۔ اس نے غور کیا اس زندگی میں آخر کونسی ایسی کشش ہے جو انسان اس سے چمٹے رہنے کی کوشش کرے۔ وہ ہملیٹ کی طرح "ہوں کہ نہ ہوں" کے مسئلہ کو ابھی طے کر رہا تھا کہ ملوا اور اندھا فقیر دو ہستیاں اس کے سامنے اس طرح آکھڑی ہوئیں گویا کوئی فرشتے ہیں جو آسمان سے اس کو نجات دلانے آئے ہیں۔ نرنجن نے پوچھا آپ کون ہیں، اور کیا چاہتے ہیں۔ اندھے فقیر نے بتایا میں ایک فقیر ہوں آنکھوں سے محتاج ہوں اور یہ میرا لڑکا ہے جو بھیک

مانگتے وقت مجھے لیکر چلتا ہے۔ ہم بہت پیاسے ہیں کچھ ٹھنڈا پانی پئیں گے۔ پانی پینے سے پہلے متن نے معافیاں مانگیں۔ اور گڑگڑا کر پوچھتے ہوئے اس بات کا یقین کر لیا کہ نرنجن کے ہاں پانی وہ پی بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو نرنجن کے دئے ہوئے پانی سے خوب سیراب ہوا اور ملو نے بھی خوب پیٹ بھر کر پانی پیا۔

نرنجن نے اندھے فقیر کو بیٹھنے کے لئے جگہ دیدی۔ یہ ایک ایسی ہستی تھی جو اس سے بھی زیادہ اندوہناک زندگی بسر کر رہی تھی اور نرنجن اس کی داستان سننا چاہتا تھا۔

متن نے اپنی زندگی کی کہانی سنانی شروع کی اور ابھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ملو نے بیچ میں بول کر کہا۔ "باوا، چلو گھر، ماں انتظار کر رہی ہوگی۔ رات اندھیری ہے اسے فکر ہوگا"۔ "ہاں بیٹا۔ ضرور چلو"، باپ نے جواب دیا۔ "بابو جی میرے حال پر بہت مہربان ہیں اور میں ان کا شکرگذار ہوں کہ وہ غریب کی کہانی سننا گوارہ تو کرتے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو ہماری کہانی سننا چاہتے ہوں۔ اس لئے میں ذرا سی بات اور کرونگا"۔

"تو پھر بابو جی! میں نے بیاہ کر لیا۔ گنگا منی میری بیوی واقعی ایک دیوی تھی اس جیسی ستی ساوتری ملنی ناممکن ہے۔ آجکل ایسی وفا کرنے والی بیویاں کہاں ملتی ہیں دو سال تک ہم بڑے آرام اور آسانی مسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ دن بھر ہل لئے کھیتی کرتا رات کو آرام سے گھر میں سوتا۔ اتفاق سے ایک دن مجھے بخار چڑھا، گھر آیا اور پھر ایسا پڑا کہ تین مہینہ تک چارپائی سے نہ ہلا مجھے میعادی بخار ہو گیا تھا۔ جب اچھا ہوا تو دیکھا کہ آنکھوں کی بینائی بخار جاتے کا نذرانہ بن گئی ہے اور اب مجھے در در ٹھوکریں کھانا اور پیسہ پیسہ مانگ کر گذارہ کرنا پڑیگا میں جب بیمار پڑا تھا تو یہ لڑکا ماں کے پیٹ میں تھا مجھے معلوم نہیں اس کی شکل صورت کیسی ہے۔ ہاں ٹٹول کر اس کے ہاتھ پیر کچھ محسوس کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اس کی ماں اگر جواہر تھی تو یہ ہیرا ضرور ہوگا حضور، بابو جی، آپ کو معلوم نہیں یہ لڑکا کیسا ہوشیار ہے اور کس طرح میرا کام کرتا ہے"! ملو اپنے بارے میں باپ کی یہ تعریف سنکر کچھ گھبرا سا گیا اور چلنے کے لئے پھر اصرار کیا۔ "ہاں بیٹا، میں ابھی چلتا ہوں ذرا ٹھہرو" یہ کہکر متن نے پھر اپنی کہانی جاری رکھی۔ "یہ لڑکا سارے گھر کا ایک ہی سہارا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں اس کی ماں ہمارے لئے کتنی ہوشیاری سے کام کرتی ہے اور غریبی کے باوجود وہ سب کچھ کرتی ہے جو اس کے بس کی بات ہے۔ گھر کا سارا کام کاج۔ برتن مانجھنے، بھات پکانا، غرض سب ہی کام۔ پھر وہ ٹوکریاں بن کر لڑکے کو دیدیتی ہے اور یہ بیچارہ کے روزانہ ٹوکریوں کو بازار میں لیجا کر بیچ دیتا ہے۔ میری بیوی کی زندگی بہت ہی تکلیف میں گذرتی ہے مگر وہ ایسی باوفا عورت ہے کہ آجکل بہت کم ہوتی ہیں۔ یہ ملو چھوٹا سا تھا کہ میرا ساڑھو آیا اور مجھے اس بچہ کو اور گنگا کو لیجانے کیلئے کہنے لگا وہ ایک کھاتا پیتا آدمی ہے اور ہماری مدد کرنے کا خیال اسے بہت تھا مگر میری بیوی نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا چاہے مجھے اپنے شوہر کے ہمراہ گھاس کھا کر گزارہ کرنا پڑے لیکن میں کسی دوسرے کے گھر جا کر ہرگز نہیں رہوں گی۔ خود مجھے اپنی بیوی کے اس روکھے پن کی شکایت تھی مگر اس نے مجھے بتایا کہ میری بیوی کی بہن کا شوہر بہت ہی خراب آدمی ہے وہ عین میری موجودگی میں اسے گلے سے لگانا اور پیار کرنا چاہتا تھا مگر وہ بھاگ گئی اور میں نے اس کے بعد اس کو کبھی منہ نہ لگایا۔ میں تو، حضور، اندھا ہوں مجھے کیا معلوم وہ ظالم کیا کرنا چاہتا تھا۔ مگر میری بیوی کبھی جھوٹ نہیں بولتی اور اس نے جو کچھ کہا اور کیا اس پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں میں غریب اور فقیر ہوں مگر وفادار بیوی اور ہر حال میں شوہر پرستی کرنے والی بیوی کا خاوند ہونے کی حیثیت سے میں بڑے بڑے لوگوں کے مقابلہ پر اپنے آپکو مالدار اور صاحب نصیب سمجھتا ہوں اس کی عمر اگرچہ ابھی ۲۵ سال کی ہے مگر محنت مشقت کرنے اور دکھیاری ہونے کے سبب اس کا حسن ختم ہو چکا ہے۔ بوڑھی عورتیں اب بھی کبھی کبھی اس کی جوانی اور حسن کا ذکر کر کے اس کی تعریف کرتی ہیں تو میرا دل خوشی اور جوش سے بھر جاتا ہے اور شکر کرتا ہوں اس مالک کا جس نے مجھے ایسی نیک اور مدد کرنے والی بیوی دی۔ وہ کتنی ہی بوڑھی ہو جائے میرے لئے وہ ۱۶ سالہ دلہن کی طرح رہیگی۔ میرے اندھے پن کی خوبیوں کو اور بھی طرح ظاہر کرتا مگر اب وقت نہیں ہے اسکی

بقیہ بر صفحہ ۱۸

# سُدھارِنتی

(ازجناب اشرف صبوحی صاحب دہلوی)

یورپ کے سائنس داں بیسویں صدی کے ربع اول سے مسئلہ حیات اور روح کو حل کرنے میں کوشاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کافی جدوجہد کی گئی تو بہت جلد نظامِ عالم کو مختلف افراد کی خلعت پر قادر ہوسکیں گے۔

ہندوستان کے بعض ماہرانِ علومِ جدید بھی ارتقاء کے اِن مسائل پر غور کررہے تھے کہ ۱۹۵۰ء میں البوسی ایٹڈ پریس نے ایک نہایت تعجب انگیز اور سنسنی خیز خبر شائع کی کہ مدراس کے مشہور محقق ڈاکٹر آئر Iyer نے ہر قسم کے جانداروں کی ابتدائی صورت تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے اور عنقریب وہ اپنی مصنوعات کی نمائش کرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف اپنی سائنٹیفک تحقیقات اور علمی معلومات کیلئے ہندوستان کے ہر حصہ میں پوری شہرت رکھتے تھے اور ان مسائل میں آپ کا نام کافی اعتماد رکھتا تھا۔ تاہم اس خبر کو تعلیم یافتہ طبقہ نے انتہائی بے اعتباری کے ساتھ پڑھا۔ اور باوجود سائنس کے سیکڑوں معجزے دیکھنے کے چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

دُنیا میں اخبارات کے اڈیٹر اپنی ذہنیت کے لحاظ سے ایک عجیب مخلوق ہے۔ اِن کے خیالات کی پرواز ہی نرالی ہوتی ہے۔ چنانچہ دہلی کے انڈین پریس کے مالک نے اپنے ایک ہوشیار نمائندے کو مدراس جاکر ڈاکٹر صاحب کی اِس علمی تحقیقات کے متعلق مزید حالات دریافت کرنے پر رضامند کیا۔

مسٹر کشور جو نہایت قابل مضمون نگار اور سائنس کے طالب علم تھے۔ بڑے شوق سے روانہ ہوئے۔ مدراس پہنچکر ڈاکٹر آئر کی نسبت مقامی پریس کی رائے معلوم کی اور ان کے مکان پر جا پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی لیبوریٹری میں تھے کارڈ پہنچا۔

ڈاکٹر آئر جن کی عمر پچاس باون سال کے قریب ہوگی نہایت ذہین اور حد درجہ کے خلیق انسان تھے۔ انھوں نے کارڈ دیکھا: "ایم کشور شاستری۔ طالب علم سائنس"۔ کچھ سوچا: "اچھا یہیں لے آؤ"۔

معمولی علیک سلیک کے بعد مسٹر کشور نے ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات سے دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسی شوق میں دہلی سے مدراس تک پہنچا ہوں۔

ڈاکٹر: "مبارک ہیں بھارت ماتا کے وہ سپوت جن کو علم کی پیاس ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ تم میری تحقیقات سے کافی معلومات بہم پہنچاؤ۔ یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے دوستانہ طریق پر مسٹر کشور کا ہاتھ پکڑا اور شیشے کی الماریوں کی ایک لمبی قطار دکھائی: "یہ میری تحقیقات کی دُنیا کا پہلا منظر ہے"۔ اِن الماریوں میں بہت سے خانے تھے۔ اور ہر خانہ میں مختلف قد و قامت کے اور مختلف صورت و شکل کے چھوٹے چھوٹے جانور اپنی اپنی زندگی کیلئے کشمکش کرتے دیکھے۔ مسٹر کشور نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا یہ بالکل انسانی صنعت ہے؟"

ڈاکٹر مسکرایا اور بولا: "بالکل انسانی مسٹر کشور۔ یہ سائنس کے میدان کی پہلی دوڑ ہے"۔

"تو آپ اس دنیا کے منافق ہیں ! اللہ اللہ انسان میں بھی کیا قدرت ہے "

"ابھی شاید تم نے علم کی طاقت پر غور نہیں کیا !"

مسٹر کشور نے ڈاکٹر کی ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے پوچھا "آپ نے سب سے بڑا اعجاز کونسا پیدا کیا ہے ؟"

اس کا انھوں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ مسکراتے ہوئے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

چند قدم چلنے کے بعد ڈاکٹر نے دبی زبان سے مسٹر کشور کے کان میں کہا "میں تمہیں ایک بالکل نئی چیز دکھاتا ہوں۔ مگر تم اس بات کا اقرار کرو۔ عہد استوار عہد کرو کہ تم اس کا کسی سے ذکر نہیں کروگے "۔ کشور نے وعدہ کرتے ہوئے دل سے واپس کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی صنعت گری کا یہ راز بالکل راز رہے گا "

اب لیبورٹری کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے تھے یہاں لمبی لمبی میزوں پر صندوقوں اور صندوقچیوں کی قطاریں لگائی دیں۔ کمرہ کے وسط میں ایک بڑی مربع میز پر چند اس قسم کی نلیاں۔ سلنڈر اور آلات موجود تھے جن کے لئے اردو زبان میں ابھی تک نام بھی ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ دیواروں میں جا بجا خانے بنے ہوئے تھے اور ان خانوں میں قطار در قطار چھوٹی بڑی بوتلیں اور سائنس کے متعلق مختلف کلیں سجی ہوئی تھیں ایک سرخ لیمپ کی روشنی تھی جو چھت میں آویزاں تھا۔ اور ہوا میں اس قسم کی بو تھی جیسے کسی تیز عرق کو جوش دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کہنے لگا "یہ میری لیبورٹری کا خاص حصہ ہے بہت کم لوگوں کو اس کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ اس محفل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ یہ کہکر ڈاکٹر نے ایک شیشے کے بکس کا ڈھکنا اٹھایا " سائنس کی کرشمہ سازی ملاحظہ ہو " مسٹر کشور نے اندر نگاہ کی تو اس میں عورت کی رحم کی شکل کا ربوز کے برابر ایک تھیلا پڑا تھا۔ اس تھیلے کو ایک لچک دار نالی کے ذریعہ سے ایک لمبے سرخ سلنڈر کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا جس میں برقی تار لگے ہوئے تھے۔ اس کے اندر دل کی طرح باقاعدہ حرکت ہو رہی تھی۔ اس کے سوا اور کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ مسٹر کشور کو جب اس معمہ کے حل کرنے میں ناکامی ہی تو اس نے کہا " کیا آپ اس کی تشریح کریں گے ؟"

ڈاکٹر تھوڑی دیر خاموش رہا۔ وہ مسٹر کشور کی سمجھ سے مایوس تھا۔ اپنی ذہانت کے اثر کو دوبالا کرنیکی خواہش تھی پھر بولا "جو کچھ میں کہنے کو ہوں تم اسے شاید باور نہ کرسکو۔ سائنس کی ایجادات ابتدا میں ہمیشہ بعید الفہم ہوا کرتی ہیں " اس کے بعد وہ پھر اس طرح رک گئے گویا اس کے خیالات ٹٹول رہے ہیں مسٹر کشور نے اطمینان کے لہجہ میں جواب دیا " ڈاکٹر صاحب! میرے دل میں آپ کا بڑا احترام ہے۔ آپ جو کچھ کہیں گے میں اسے صحیح تسلیم کروں گا۔ علم جب عملی صورت اختیار کرلیتا ہے تو یقین کرلینا ہی پڑتا ہے "

ڈاکٹر نے کچھ کہنے سے پہلے کرانومیٹر سے اس کی حرکات گنیں۔ پھر اس پر ایک آلہ لگایا جو دل کی حرکات معلوم کرنے سے کسی قدر مشابہ تھا۔ بعد ازاں مسٹر کشور کی طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ اور اس چیز کی جانب اشارہ کر کے کہا " یہ ایک مصنوعی بچہ ہے۔ سائنس کی جد وجہد کا انتہائی مرحلہ "

مسٹر کشور کا یہ سن کر سر چکرا گیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا " کیا ! انسان کا بچہ ؟"

" ہاں ! انسان کا بچہ۔ بالکل ایسا ہی جیسا مرد اور عورت پیدا کرسکتے ہیں ! "

" پھر تو آپ سائنس کی دنیا میں خدائی کریں گے "

ڈاکٹر کا چہرہ زیادہ سنجیدہ ہوگیا۔ اور اس نے مسٹر کشور

کی حیرت کا موازنہ کرتے ہوئے کہا "میری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ مصنوعی انسان پیدا کرسکوں۔ میں نے اپنی دولت، اپنی صحت اور کوششوں کا تمام سرمایہ اسی ایک خیال کی نذر کردیا ہے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہوگیا تو یقیناً مجھ سے بڑھکر دنیا میں کوئی شہرت اور خوشی کا مالک نہ ہوگا۔

"واقعی اس سے زیادہ شہرت کیا ہوسکتی ہے۔"

"یہی نہیں بلکہ اس طریق پر انسان کی پیدائش کے یہ معنی ہوں گے کہ میں آئندہ اس کے اندر اعلیٰ درجہ کے احساس پیدا کرسکوں گا۔ میرے بچے میں بہترین ذہانت ہوگی۔ اس کے اعضا بھی ایسے بناؤں گا جو ارتقاء کی بدولت ہمیں اب تک حاصل نہیں ہوئے۔"

مسٹر کشور کی نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ ششدر اس کی تقریر سن رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "مسٹر کشور اس بات کو یاد رکھو کہ میں جو انسان پیدا کرنا چاہتا ہوں اس کے متعلق میری آرزو ہے کہ اس کی پیدائش میں کسی قسم کا حیوانی مادہ نہ برتا جائے۔ ہر چیز یہاں تک کہ وہ جوہر لطیف جو بجائے خود اُس کی پرورش کرتا ہے نباتاتی رس ہیں۔ ہمارے رشی منی گھاس کے پتلوں میں جان ڈال دیا کرتے تھے کیا ہم اس دورِ علم وعمل میں اتنا بھی نہ کرسکینگے۔"

مسٹر کشور نے اس رحم نما پتیلے کی طرف جو نہایت باقاعدگی کے ساتھ حرکت کررہا تھا اشارہ کرکے پوچھا "کیا یہ آپ کی پہلی کوشش ہے؟" اور کیا اس میں حسبِ دلخواہ کامیابی کی امید ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا "پہلی کوشش! نہیں۔ ہزاروں ناکام تجربوں کے بعد یہاں تک نوبت پہنچی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اب تک سارا کام بڑی خوش اسلوبی اور صحیح نتائج کے ساتھ سرانجام پاتا رہا ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ چھ مہینے کے عرصہ میں بچہ پیدا ہوجائے گا۔ موجودہ حالت میں یہ تخم چھ پونڈ وزنی بچہ کے برابر ہوگیا ہے۔"

مسٹر کشور کی عجیب حالت تھی۔ اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کے اندر کوئی مافوق الفطرت طاقت ضرور ہے۔ مغربی دنیا آپ کی اس ایجاد کا ذکر سن کر کیا کہے گی؟ لیکن آپ یہ تو فرمائیے کہ اس کے اندر دماغ بھی ہوگا۔ اور اس مصنوعی انسان کی شکل وصورت کیسی ہوگی؟"

ڈاکٹر نے تیوری چڑھائی۔ مسٹر کشور کو گھورا اور حقارت آمیز لہجے میں بولے۔

"کیسا نامعقول سوال ہے۔ تمھارے حواس کیوں باختہ ہوگئے۔ دماغ اور شکل تو ایک طرف میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے میں وہ تمام باتیں موجود ہوں جو موجودہ نسل انسانی میں معدوم ہیں۔ وہ ایکس رے شعاعیں، مقناطیسی لہریں، ہپناٹزم اور روحانیت کی موجیں، نظروں سے پوشیدہ عالم اور اُن کی موجودات سب کو دیکھ سکے۔ وہ ہوا میں پرندوں اور پانی میں مچھلیوں کی طرح اُڑ اور تیر سکے۔ وہ تمام اسرارِ قدرت سے واقف ہو۔"

مسٹر کشور نے بڑھتے ہوئے استعجاب کو ضبط کرتے ہوئے کہا:۔

"سائنس باوجود کوششوں کے اب تک نیند اور خواب کے ظہورات کا پتہ چلانے سے قاصر ہے لیکن آپ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں! ہاں میرا بچہ اِن تمام کمالات کا مظہر ہوگا" ڈاکٹر نے یہ الفاظ بڑی سنجیدگی سے کہے۔ اُن کے چہرہ پر اس قسم کا فلسفیانہ اطمینان تھا کہ مسٹر کشور اپنے سوال پر شرمندہ سا ہوگیا۔ اتنے میں ڈاکٹر نے ایک اور پوشیدہ سلنڈر نکالا۔ اس چھوٹے سے شیشہ کے آلہ میں ایک چھوٹا سا بندر اُچھلتا کودتا نظر آیا۔ یہ بندر دو انچ سے بڑا نہ تھا۔ اس کی چار آنکھیں اور چار ہی کان تھے۔ اِن کے علاوہ اس میں بعض ایسے اعضا بھی پائے جو اور کسی حیوان میں نہیں دیکھے گئے۔ ڈاکٹر نے مسٹر کشور کے چہرے سے اُس کی حیرت کا اندازہ کر

کے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"چین میں جو بونے درخت ہوتے ہیں اُنہی کے اصول پر میں بونے بندر بھی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جانور اگرچہ قطعاً مصنوعی نہیں ہے تاہم اس میں بہت کچھ میری صنعت کو دخل ضرور ہے۔"

مسٹر کشور نے سوال کیا:۔

"ڈاکٹر صاحب معاف کیجئے گا۔ کیا دنیا میں اس قسم کی مخلوق بھی موجود ہے جس کا سائنس والوں کو پتہ نہیں؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "لاانتہا لا تعداد میں! اگر ہم ان سے واقف نہیں تو قصور صرف ہمارا ہے۔ قدرت نے ہمیں اُن اعضاء سے محروم رکھا ہے جن کی مدد سے ہم انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ میں اپنے علم کی بنا پر پریوں، فرشتوں، جنوں بھوتوں اور ارواحِ خبیثہ اور لطیفہ کے وجود کا قائل ہوں۔ یہ بندر جسے تم دیکھ رہے ہو۔ ایکس رے شعاعیں اور مادیت کے ہر وجود کو دیکھ سکتا ہے۔ اس قسم کی ساری صفات بلکہ اس سے زیادہ اس لڑکے میں ہونگی جس کو میں مصنوعی طور پر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ بڑا ہو کر ہمیں نامعلوم عالموں اور اُن میں بسنے والی مخلوقات کے متعلق بہت سی عجیب و غریب باتیں بتا سکے گا۔ اور اس لیے میں نے اس کا نام شدھانتی تجویز کر لیا ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں لیبوریٹری سے باہر آئے۔ اور مسٹر کشور عجائبات سے لبریز دماغ اور نئی نئی دریافتوں کا ذخیرہ لئے ہوئے ڈاکٹر آئر سے رخصت ہوئے۔ مسٹر کشور نے جو کچھ ڈاکٹر آئر کی لیبوریٹری میں دیکھا تھا اگر رات کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو یقیناً خواب پریشاں سمجھتا۔ لیکن اس نے مصنوعی بچہ کو اسکی ابتدائی حالت میں دن کے وقت خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور ڈاکٹر کی شہرت ہندوستان میں باعتبار ایک محقق سائنس کچھ کم نہ تھی اس لئے مسٹر کشور کیلئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ ڈاکٹر کی باتوں پر یقین کرتا اور جو کچھ دیکھا تھا اسے بالکل صحیح سمجھتا۔

دہلی واپس آکر مسٹر کشور نے ڈاکٹر آئر سے ملاقات اور اس کے کارناموں کا مختصر سا خاکہ اخبار کے لئے لکھا۔ لیکن اس معرکہ کی بات کو عمداً چھوڑ دیا جس کو پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کر آیا تھا۔ کئی مہینے کے بعد ڈاکٹر کا ایک خط مسٹر کشور کے نام آیا کہ "میں نے مدراس سے نقل مکان کر کے کولمبو میں رہائش کا انتظام کر لیا ہے اور جب تک میری یہ دریافت مکمل نہیں ہو گی غالباً یہیں رہوں۔ آپ اطمینان رکھیں کہ ہر نئی بات کی آپ کو برابر اطلاع ملتی رہے گی۔"

اس کے بعد کئی سال گذر گئے۔ ڈاکٹر کا کوئی خط نہیں آیا جتنے خط مسٹر کشور نے لکھے وہ سب لاپتہ ہو کر واپس آگئے۔ شوق کے بیتاب ہو کر ایک مرتبہ مسٹر کشور کولمبو بھی گئے۔ لیکن جب وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ چند ہفتے ہوئے وہ چین و جاپان کی سیاحت کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ مسٹر کشور کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنے شوق کا ماتم کرتے ہوئے دہلی آئے اور گذشتہ تمام واقعات کو ایک مقناطیسی خواب سمجھکر خاموش ہو گئے۔

مدراس میں ڈاکٹر آئر سے ملاقات کئے اور اُنکی جادو گری کا تماشہ دیکھے ہوئے بیس کا عرصہ گذر چکا تھا۔ مسٹر کشور نے ڈاکٹر کی کامیابی کی توقع دل سے بھلا دی تھی کہ ایک روز مسٹر کشور اپنے دفتر میں بیٹھے کسی خیال میں سگریٹ پی رہے تھے ایک خوبصورت نوجوان اندر داخل ہوا۔ اور مسٹر کشور کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ دیکر خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ خط میں لکھا تھا:۔

"میرے عزیز دوست! حامل ہذا میرا بیٹا 'سدھانتی' ہے۔ جو تعلیم کی غرض سے دنیا بھر کا سفر کر رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ تمھیں بہت سی عجیب و غریب باتیں سنائیگا اور تم کو اس کی شخصیت سے یقیناً دلچسپی ہو گی۔ اگر تم کسی طرح اس کی مدد کر سکے تو میں ممنون ہونگا۔

تمھارا صادق

ایچ۔ ایچ۔ آئر

---

خط پڑھ کر مسٹر کشور کا دماغ چکرا گیا۔ خوشی اور استعجاب نے اس کو مبہوت کر دیا۔ اُس نے دوبارہ نوجوان کے خوشنما سڈول جسم اور خوبصورت چہرہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ مسٹر کشور اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے عالم تحیر میں کرسی پر پیچھے کی طرف جھک گئے۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگے "ڈاکٹر آئر بھی ہندوستان کا ایڈیسن ثابت ہو نیوالا ہے۔ آخر اس نے مصنوعی انسان پیدا کر ہی لیا۔ کیسا وجیہ اور کس قدر نظر فریب"

چند سکنڈ کے بعد مسٹر کشور نے نوجوان سے کہا:۔

"جب تک آپ دہلی میں رہیں میری مہمانی قبول فرمائیے میں ہر خدمت کیلئے حاضر ہوں"

اس نے مسٹر کشور کی درخواست پر کوئی اعتنا نہیں کیا۔ بلکہ اس نے کہا:۔

"میں نے ایک افسانہ لکھا ہے۔ کسی اچھے اخبار یا رسالہ میں شائع کرانا چاہتا ہوں۔ اُس کا عنوان "دوسرے عالموں کی روحوں سے میری ملاقات" ہے۔ کیا آپ اس کا انتظام کر سکتے ہیں؟"

نوجوان کی اس بات نے مسٹر کشور کے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا۔ اِس لئے کہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ "میرا پیدا کیا ہوا بچہ اِن سب باتوں سے واقف ہو گا جو ہمارے لئے اسرار ہیں"

مسٹر کشور نے جلدی سے گھبرا کر پوچھا "آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور حقیقی تجربہ کی بناء پر لکھا ہو گا" نوجوان نے جواب دیا:۔

"یہی سمجھنا چاہیئے کیونکہ جو بات ہم فرض کر لیتے ہیں وہ حقیقی تجربہ کے برابر ہی درجہ رکھتی ہے۔ تمام اکتشافات دراصل انسانی ذہن ہی کی پیداوار ہوتے ہیں" مسٹر کشور نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ درست کہتے ہیں۔ لیکن اخبار یا رسائل کے ایڈیٹر معاملہ کو اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کے تبصرہ کا زاویہ دوسرا ہوتا ہے" وہ بولا "کچھ مضائقہ نہیں۔ میں اپنے قصہ کو اُن کے مذاق کے مطابق بنا کر لایا ہوں۔ اس میں اگر اور خوبی نہیں تو اصلیت ضرور ہے۔ علاوہ ازیں میرے والد کی شہرت اسے کامیاب بنانے کے لئے کچھ کم نہیں"

مسٹر کشور بڑے غور سے نوجوان کی طرف دیکھتا رہا۔ دل میں سوچا "یہ آدمی ہے یا طلسم راز؟"

مگر بظاہر صرف اس قدر کہا "مسٹر سدھانتی! آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ اس صورت میں تو جو کچھ بھی آپ لکھیں گے ہر ایڈیٹر اس کے چھاپنے کو تیار ہو گا۔ آپ کے پاس اس قصے کا مسودہ تیار ہے؟"

نوجوان نے مسودہ نکال کر کشور کے سامنے ڈال دیا اور کہنے لگا۔ اس میں اعلیٰ اور اسفل دونوں عالموں میں میری سیاحت کا ذکر ہے"

مسٹر کشور نے مسودہ کے ورق کھولے اور پڑھنا شروع کیا۔ لکھا ہوا تھا:۔

"... اور بہشت اور دوزخ کی کوئی شکل اور صورت نہ تھی۔ روشنی اور تاریکی زمانہ کی سطح پر ملی ہوئی تھیں۔ انسان کی روح تصور کی ہوا میں مست تھی۔ تخیل کی فضا میں کوئی وجود موجود نہ تھا۔ فطرت کے ظہور کی گونج تھی مگر اس میں حصہ لینے والا کوئی موجود نہ تھا۔ انسان نے خواہش کی کہ اس میں نیکی اور بدی پیدا ہو۔ ایسا ہی ہوا۔ پھر خواہش کی کہ اس کی نمائش کی جائے۔ اور جنت اور جہنم سامنے آ گئے۔ کرۂ ہوائی اپنے اندر اعمال کی ایک دُنیا لئے ہوئے ہے۔ ہر عمل ظاہر میں ختم، مگر دراصل ہوائی اوراق میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر آواز برقی رَو کے ذریعہ ہوا میں پہنچا کر پھر سُنی جاتی ہے اسی طرح حرکات بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ انسان اس مادّی زندگی سے گزر کر جب اپنی اصلی زندگی شروع کرے گا تو جو کچھ اس نے یہاں

کیا ہے وہ پھر سامنے آجائیگا۔۔۔یہی عذاب و ثواب ہے اور اسکی
مجموعی صورت کا نام بہشت اور دوزخ ہے"۔

مسٹر کشور مسودہ پڑھتے پڑھتے یکایک رک گیا اور نوجوان
کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک اخبار پڑھ رہا تھا۔ مسٹر کشور نے پوچھا
"یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے بہت ہی سوچ سمجھکر لکھا ہے
کیونکہ اس زمانہ کے لوگ ایسی باتیں باور کرنے کیلئے فوراً تیار
نہیں ہوتے" نوجوان نے شانہ ہلاکر جواب دیا۔

"اگر آپ ایک ایسے انسان کی صورت اختیار کرسکیں
جس کو فطرت نے اس بات کی اجازت دی ہو کہ انقلاب اور زمانہ
سے بالاتر ہوکر ان عالموں میں جو نظروں سے غائب ہیں پرواز
کرسکے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ حقیقت جس پر زمانہٴ موجودہ کے
لوگوں کو فخر ہے محض ایک اصلاحی گورکھ دھندا اور تخریب ہے"!

مسٹر کشور نے سر ہلایا اور مسودہ کو پھر پڑھنا شروع کیا۔

"عالم ارواح کے سفر کی ہر منزل مختلف قسم کے مسافروں
سے آباد تھی مگر یہ اختلاف اضافی تھا۔ یہ مسافر کچھ پستی کیطرف
جارہے تھے اور کچھ بلندی کی جانب۔ آگے بڑھا تو حدِ نظر تک
سبزہ زار ہی سبزہ زار تھا۔ جا بجا پُرامن فرودگاہیں تھیں۔ ہوا کے
سمندر میں بڑے بڑے عالیشان بجرے خوشگوار ترنم کے ساتھ
تیر رہے تھے۔ غور سے دیکھا تو جامد محلات اور یہ متحرک بجرے
وہی روشن کُرے ہیں جن کو لوگ ستارے اور سیارے کہتے
ہیں۔ فضا کے اندر تسکین بخش موسیقی کے سُر اس طرح سُنائی
دیتے تھے جس طرح موسم بہار کی آمد پر خوش گلو پرندوں کے چہچہے
یہ وہی آوازیں تھیں جو حسن و عشق کے تصادم سے پیدا ہوکر ہوا
میں گونجتی رہتی ہیں اور جن کو معمولی مادی انسان نہیں سُن سکتا
ہر طرف امن۔ ہم آہنگی۔ صحت اور خوشی کا راج تھا۔ یہاں کے
رہنے والے خیال کی پاکیزہ مصوری کے نمونے اور نور کی تصویریں
تھیں۔ زبانوں کے بدلے اُن کے دل بولتے تھے اور آواز
کی جگہ کلام کی صورت بن کر سامنے آجاتی تھی۔ میں نے دل میں کہا
کہ کیا اچھا ہو اگر مجھکو یہاں رہنے کی اجازت مل جائے۔ اس خیال
کے پیدا ہوتے ہی ایک مست خرام کا دل مہتاب کی طرح روشن
ہوگیا۔ اور اس میں نورانی لہروں نے نکل نکل کر میری آنکھوں
کے سامنے یہ عبارت لکھدی:۔

"تم کو پہلے مایا کا تیاگ کرنا ہوگا۔ جب تک تم دولت یا
خواہشات نفسانی کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہو یہاں نہیں
رہ سکتے" یہ دیکھتے ہی میں اپنی ہستی کو بھول گیا۔ اور ہوا کی ایک
لطیف جھونکے کے ساتھ ایک دوسرے عالم میں جا پہنچا۔ یہاں
ہماری دُنیا سے زیادہ چہل پہل تھی۔ بغض و حسد کا دور دورہ تھا
فریب و دغا قانون میں داخل تھے۔ ریل کے انجنوں میں سیاہ
کاری کا کوئلہ جھونکا جارہا تھا۔ موٹریں صداقت کے خون سے
چل رہی تھیں۔ ہوائی جہازوں کے پنکھے ہوا کو زہریلی بنارہے تھے
انبوہ در انبوہ مخلوق چلتی پھرتی نظر آئی۔ ظاہر آراستہ اور باطن
گندے۔ دیکھنے میں شاندار اور فیشن ایبل مگر ضمیر مُردہ۔ باتوں
میں فساد کی بُو اور حرکات میں ریاکاری کا رنگ۔ حسن تھا تو
ایمان کا دشمن۔ عشق تھا تو عصمت کے خون کا پیاسا۔ اس عالم
کی سیر سے بہت جلد میرا جی گھبرا گیا۔ اور میں یہاں سے نکلنے کا
راستہ معلوم کرنے کیلئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک سپاہی
نے ڈانٹ کر پوچھا: کیا جیب کترنے کیلئے کسی مالدار کی تلاش میں
ہے۔ میں نے دو بدو جواب دیا "تم نے جیب کترے ہونیکی کیا
علامت دیکھی جو اس طرح مجھ پر اتہام دھرتے ہو" اس نے اسی
لہجہ میں کہا "بدمعاش اپنی وضع تو دیکھ۔ تیرے جیسے پردیسی ہمیشہ
چور ثابت ہوتے ہیں" اتنے میں ایک ٹیکسی میرے قریب سے گذری
میں نے اُس کو روکا اور یہ کہتا ہوا اس میں بیٹھ گیا کہ "جہاں اس
شہر کی میونسپل حدود ختم ہوتی ہیں وہاں لے جاکر مجھکو
چھوڑ دو"۔

اس کے بعد جب میں نے دوبارہ اس دنیا کا رخ کیا تو معلوم ہوا کہ میرا خاکی جسم مدت ہوئی جلا دیا گیا ہے۔ ناچار ایک نئی ہستی کی مختلف منزلیں طے کرنیکی تیاریاں کرنے لگا۔ اور جب میں دنیا میں نمودار ہوا تو جسم۔ فرائض۔ ماحول وغیرہ ہر چیز نئی نظر آئی۔ لیکن اس کا مجھے پورا علم تھا کہ میری روح وہی ہے"۔

مسٹر کشور جب اس قصے کو پڑھ چکے اور نظر اٹھائی تو دیکھا نوجوان کھڑکی میں کھڑا ہوا سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"عزیز من یہ ایک غیر معمولی طور پر دلچسپ مضمون ہے لیکن واقعات اس قدر عجیب ہیں کہ اگر اس کے لکھنے والے آپ نہ ہوتے تو مشتہر کے پیچھے شعراء غرسال چھوڑنے پڑتے۔ لیکن اس مضمون میں کچھ اجمالی باتیں ہیں جن کی تفصیل کی ضرورت ہے۔ آئندہ تشریح کی روشنی ڈال کر اس سلسلہ کو جاری رکھنا پڑے گا"۔

وہ ہنسا "کیا آپ اسی ابتدا کو انتہا سمجھے ہیں؟"

"معاف کیجئے میں نے اپنی رائے کے اظہار میں جلدبازی سے کام لیا"۔ یہ کہکر مسٹر کشور سنبھل کر کرسی پر بیٹھے اور دل میں سوچنے لگے کہ میرے لئے اس شخص کی بدولت۔ دولت اور شہرت حاصل کرنیکا کیسا اچھا موقع ہے۔ اور زمانہ مستقبل کے متعلق طرح طرح کی تجاویز کا سبز باغ لگانا شروع کر دیا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اخبارات میں اس مضمون کا نوٹ چھپوا دوں۔ کہ میرے پاس دور حاضرہ کا "کشن" ٹھہرا ہوا ہے۔ جو ماں کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔ سائنس کا بچہ ہے۔ لوگ جب وقت مسلم۔ ہندو۔ انقلاب وغیرہ چوٹی کے اخباروں میں اسکا ذکر پڑھیں گے تو ہر ایک میری ملاقات کا خواہشمند ہوگا۔ بعض اسے بے وقت کا اپریل فول بھی سمجھیں گے لیکن میری عینی شہادت تمام شبہات کو دور کر سکتی ہے"۔

اس قسم کے خیالات کو دل میں لئے ہوئے مسٹر کشور اُٹھے۔ نوجوان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہا "کل میں ملک کے بڑے بڑے ایڈیٹروں۔ لیڈروں اور عجائب پرست احباب کو آپ کی ملاقات کیلئے دعوت دوں گا"۔ نامور آدمیوں کو روشناس کرانیکا یہی طریقہ ہے"۔ نوجوان رخصت ہوا۔

تیسرے روز علی الصبح دار الحکومت کے تمام اخبارات کے قائمقام اور بہت سے خوش باش لوگ مسٹر کشور کی ملاقات کو آئے۔ مسٹر کشور نے انھیں ان واقعات سے باخبر کیا جو بیس سال قبل اُس نے ڈاکٹر آئر کی لیبوریٹری میں معائنہ کئے تھے اپنے بیان کی تصدیق میں مصنوعی جانوروں اور جنین کے فوٹو گراف بھی دکھلائے اور وہ خطوط بھی پیش کئے جن میں ڈاکٹر آئر نے اپنی اس ایجاد کا اشارۃً ذکر کیا تھا۔ اس لئے ان سب کو مسٹر کشور کی باتیں صحیح ماننی پڑیں۔

نوجوان سُدھانتی سے عام ملاقات کیلئے اتوار کا دن مقرر ہوا۔ جو تیسرے روز آنیوالا تھا اور ساتھ ہی ایک معقول فیس بھی طے کر لی گئی۔ چنانچہ اس مضمون کے تار تمام اخبارات کو بھیج دیئے گئے۔ دوسرے دن سے اخبارات میں اس نوجوان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ چھپنا شروع ہو گیا۔

اتوار آئی صبح ہوئی۔ سُدھانتی شاید ابھی بیدار بھی نہ ہوا ہوگا کہ مسٹر کشور کے پاس مختلف لوگوں کی طرف سے آئے ہوئے تاروں کا انبار لگ گیا۔ بعض نے اس روز کی آمدنی کا ٹھیکہ لینا چاہا تھا۔ بعض اس بارے میں مزید کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ بعض نے ہوائی جہاز کے ذریعہ پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔ اور بعض خاص طور پر خلوت میں ملاقات کرنیکے آرزومند تھے۔ اور اس کیلئے اچھی اچھی رقمیں پیش کی تھیں۔

سدھانتی کا لکھا ہوا قصہ بھی کئی اخباروں میں چھپ چکا تھا۔ مسٹر کشور جب ہوٹل میں پہنچے جہاں یہ نوجوان مقیم تھا تو لوگوں کی اس قدر کثرت تھی کہ راستہ چلنا دشوار تھا۔ اخبارات

کے ایڈیٹروں ۔ نمایندوں اور لیڈروں کے علاوہ بڑے بڑے مالدار ۔ مارواڑی سوداگر ۔ ڈاکٹر ۔ پروفیسر ۔ لکھ پتی رئیس ۔ خطاب یافتہ ہندو مسلمان ۔ اعلیٰ طبقے کے انگریز ۔ لیڈیاں ۔ پارسی مرہٹہ گجراتی ۔ بنگالی خواتین غرضکہ ہر عمر ہر جنس اور ہر رنگ کے آدمی جمع تھے ۔ اتنی جگہ نہ تھی کہ گذر کر اس معرکہ کی خبر اس کے اصل ہیرو کو دی جاسکتی ۔

آخر بہ دشواری مسٹر کشور اس بھیڑ کو چیرتے ہوئے اُس کے کمرے میں پہنچے ۔ وہ بیدار ہو چکا تھا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ مسٹر کشور نے صبح کا ایک اخبار اُس کے ہاتھ میں دیکر کہا :۔

"مسٹر شدھانتی ذرا اسے دیکھنا" اس نے ایک مضطربانہ انداز سے اخبار پر نظر ڈالی ۔ سرخیاں پڑھیں اور اس کے بعد اپنے متعلق مضمون پڑھا ۔ جوں جوں وہ اس مضمون کو پڑھتا تھا اس کے اضطراب میں ترقی ہوتی جاتی تھی ۔ آخری سطر پر پہنچکر اس کی پریشانی کی انتہا نہ رہی ۔ رنگ زرد ہو گیا ہاتھ کانپنے لگے اور سر کرسی کی پشت سے جا لگا ۔ مسٹر کشور نے یہ حالت حد درجہ کی بے چینی کے ساتھ دیکھی ۔ حیران ہو کر پوچھا ۔

"کیا ہوا ۔ خیر تو ہے ۔ آپ بیمار تو نہیں ہیں؟"

نوجوان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جواب دیا :۔

"غضب ہو گیا ۔ اُف میرے خدا اب کیا ہوگا؟" مسٹر کشور ان الفاظ کو سُن کر اور گھبرا گئے اور انھوں نے کہا آپ کیا کہتے ہیں" اس میں قابل اعتراض کونسی بات ہے؟

اُس نے ایک اندوہناک چیخ ماری اور سر کے بال نوچتے ہوئے کہا :۔

"یہ جو کچھ لکھا ہے سرتا پا جھوٹ ہے ۔ یہ اخبار جب میرے والد کی نظروں سے گذریگا تو وہ کیا کہیں گے ۔ خدا ان اخبار والوں کے ہتھکنڈوں سے بچائے ۔ اُف!"

مسٹر کشور اب بھی نہ سمجھے اور کسی قدر زور دیکر بولے :۔

"آپ خواہ مخواہ گھبراتے ہیں ۔ میں اس خوف کے معنی نہیں سمجھتا ۔ اس ملاقات کی کیفیت میں کونسی بات جھوٹی درج ہوئی ہے"

نوجوان اپنے جذبات کی بے پناہ کش مکش سے تنگ آ چکا تھا جھنجلا کر کہنے لگا "آپ سے ایک خوفناک غلطی ہوئی ہے بیحد خوفناک"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ میں مصنوعی انسان نہیں ہوں" اتنا کہکر وہ گھبراہٹ کی حالت میں کھڑا ہو گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پھر بولا "آپ کو یہ گمان کیونکر پیدا ہوا کہ میں مصنوعی انسان ہوں"

مسٹر کشور کی پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ۔ آنکھیں پتھرا گئیں رگوں میں خون منجمد ہونے لگا ۔ پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ آگیا اس نے انتہا ضبط سے کام لیا اور پوچھا ۔

"توبہ! توبہ! کیا تمھارا نام شدھانتی نہیں ہے؟ بیس سال ہوئے تمھارے والد نے مدراس میں مجھے رحم کی شکل کا ایک تھیلا دکھایا تھا ۔ کیا تم اُس سے پیدا نہیں ہوئے؟"

ایک از خود رفتہ دیوانہ کی طرح اس نے اپنا منہ پیٹ کر جواب دیا : "غضب! غضب میں تو اپنے باپ کا قدرتی بیٹا ہوں اور اُس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ کولمبو میں رہتے تھے وہ جنین بڑھتے بڑھتے آخر غلاظت کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا" مسٹر کشور چکر کھا کر دیوار سے جا لگے اور پوچھا "تم اپنے باپ کے قدرتی بیٹے ہو اور سائنس کی کرامت کا انجام غلاظت کا ڈھیر ہوا ۔ کیا سچ کہتے ہو؟"

"میرے پاس اسکے بیسیوں ثبوت ہیں جن سے روز روشن کی طرح ثابت کر سکتا ہوں ۔ اُف! میرے خدا اب کیا ہوگا ۔ اے ستم ظریف اخبار نویس تو نے یہ کیا کیا" یہ دونوں قدرتی انسان سائنس کے فریب میں مبتلا کمرہ میں دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر پھر رہے تھے بار بار ٹیلیفون کی گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ملازم ہر منٹ کے بعد مٹھیاں بھر بھر کر ملاقاتی کارڈ اندر ڈال رہا تھا مگر ان دونوں کو [illegible]

[illegible]

# حقیقتِ انسانی کا ادراک

(از جناب آغا رفیق بلند شہری)

ایک مثل مشہور ہے "انسان کا دل مقفل صندوق ہے اور تجربات قفل کی کنجی" اس مثل میں دل سے مراد ضمیر یا انسانی فطرۃ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ انسان ایک ایسا راز ہے جس کا دریافت کرنا آسان نہیں ہے دنیا کے تعلقات اور کاروبار اگرچہ اس امر پر مجبور کرتے ہیں کہ انسان کی حقیقت دریافت کرکے اوس سے تعلقات قائم کئے جائیں یا کاروبار کا سلسلہ شروع کیا جائے لیکن انسانی فطرۃ ایسی واقع ہوئی ہے یا ایسے تاریک پردوں میں مخفی ہے کہ کوئی شخص چند دنوں یا چند مہینوں اور بعض اوقات چند سالوں میں بھی اوس کو دریافت نہیں کرسکتا۔

اگرچہ کسی شخص کو یہ معلوم ہوجائے کہ اوس کا شریک کار یا ملازم اس طبیعت اور فطرت کا انسان ہے تو وہ اوس کے ساتھ اوسی قسم کا معاملہ رکھے گا جو اوسکی شان کے شایان ہے یعنی اگر وہ خوش معاملہ۔ دیانتدار۔ انصاف پسند اور شریف وخلیق انسان ہے تو تمام کاروبار اور خانگی امور کو اوس کے حوالہ کردیا جائے گا اور اوس پر کامل اعتماد وبھروسہ کیا جائیگا اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی بظاہر نہایت خلیق۔ انصاف پسند اور خوش معاملہ ہے لیکن باطن میں انتہادرجہ کا بدطینت بددیانت خودغرض اور مکار ہے اوس پر نہ تو ایک لمحہ کے لئے اعتبار کیا جائے گا اور نہ اوس کے کام پر کبھی اعتماد ہوگا اور باہمی بے اعتمادی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلقات ختم ہوجائیں گے اس بناء پر انسان مجبور ہے کہ اول دوسرے انسان کی حقیقت کو دریافت کرے اور پھر اوس سے تعلقات کو قایم کرے یا اوس سے کوئی معاملہ کرے اہل علم نے ہی ضرورت کو پیش نظر رکھکر انسانی فطرت کو دریافت کرنیکے اصول وضع کئے ہیں اور انسان کے اعضاء کی شناخت یا ظاہری اخلاق وعادات سے اوس کے باطن کی حالت پر روشنی ڈالی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود کافی غور وخوض اور عرصہ دراز کے تجربات کے کسی قاعدہ کو کلیۃ قاعدہ اور کسی تجربہ کو آخری تجربہ نہیں کہا جاسکتا اور کسی اعتبار سے بھی اصول موضوعہ سے انسان کی صحیح حقیقت کو دریافت نہیں کیا جاسکتا مثلاً علم فراست ہمکو یہ بتاتا ہے کہ سرمگین بڑی آنکھیں خلق وسخاوت پر دلالت کرتی ہیں اور چھوٹی آنکھیں اور تنگ پیشانی بدخلقی اور بخل کی علامت ہے لیکن تجربات سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں رکھنے والے انتہادرجہ کے مکار۔ دغا باز۔ بدخلق۔ بخیل۔ خودغرض۔ اور جرائم پیشہ انسان بھی ہوتے ہیں اور تنگ پیشانی چھوٹی آنکھیں رکھنے والے انسان خلیق سخی۔ علم دوست۔ ذکی وذہین اور انتہادرجہ کے شریف طبیعت بھی ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انسانی حقیقت کو دریافت کرنے کیلئے انسان نے جو قواعد واصول مقرر کئے ہیں وہ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئے اور انسان کی حقیقت ان اصول موضوعہ کے وضع کرنے کے بعد آج بھی اتنی ہی مخفی ہے جتنی کہ اس سے پہلے تھی اور انسانی حقیقت کو دریافت کرنے کا وہی پرانا طریقہ

اب بھی اتنا ہی مخفی ہے جتنا کہ پہلے تھا۔

مشرق کے قدیم محققین نے ہمکو بتایا تھا کہ انسانی حقیقت تین تاریک پردوں کے پیچھے مخفی ہے اور جب تک ان پردوں کو سامنے سے نہ ہٹایا جائے گا انسانی حقیقت نقاب سے باہر نظر نہیں آسکتی واقعہ یہی ہے جو بات عرصہ دراز کی کوشش اور تحقیقات سے معلوم کی جاسکتی ہے وہ آجکل کے عجلت پسند کیونکر چند فرضی قیاسات سے بآسانی دریافت کرسکتے ہیں۔

انسانی حقیقت ایک راز ہے اور ایک مشکل سے حل ہونے والا معمہ ہے جسکو طویل تحقیقات اور عرصہ دراز تک معاشرت کے بعد دریافت اور حل کیا جاسکتا ہے اور بڑی جد و جہد کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ کون امین ہے اور کون خائن۔ کون مخلص و وفادار ہے، اور کون خود غرض اور بے وفا یہ حقیقت دریافت تو ہوجاتی ہے لیکن کب؟ جبکہ وقت گذر جاتا ہے اور انسان کافی نقصان برداشت کرچکتا ہے۔

انسان ظاہر پرست ہے اور عجلت پسند یہی وجہ ہے کہ وہ تجربات میں اپنی عمر اور وقت کو ضائع کرنا پسند نہیں کرتا اور انسان کی ظاہری حالت کو دیکھکر اوس کی نسبت ایک رائے قایم کرلیتا ہے۔ لیکن اکثر اوقات اوس کی رائے غلط ہوتی ہے اور ظاہر کو دیکھکر اوس نے جو فیصلہ کیا تہا وہ باطن کے خلاف ہوتا ہے اور اس ظاہر پرستی اور عجلت پسندی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیا میں انسانی حقیقت کی نسبت بری رائیں قائم کی جارہی ہیں۔ باہمی اعتماد جاتا رہا ہے۔ معتمد انسان دستیاب نہونے سے کاروباری حلقوں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے اور بعض قوموں کی شرارت نے تو شریف طبقات کے انسانوں اور سرمایہ داروں کو اون سے اتنا بدظن کر دیا ہے، کہ اوس کے نام سے کانوں پر ہاتھ دہر لیتے ہیں۔

بہر نوع اگر انسانی حقیقت کو دریافت کرنا ہے انسانی فطرت کو معلوم کرنا ہے اور انسان کی انسانیت کی پرکھہ مطلوب ہے تو بتدریج اون تاریک پردوں کو اٹھاؤ جو انسانی حقیقت کو چھپائے ہوئے ہیں انسان سے سب سے پہلی ملاقات میں اوسکی ظاہری حالت سے ہمکو جو بات معلوم ہو اور ہم اوس بات یا تجربہ سے جو فیصلہ اوس کی نسبت کریں یہ گویا اوس کی حقیقت کے سامنے سے پہلا پردہ اٹھانا ہے۔ اوس کے بعد متعدد ملاقاتوں گفتگوؤں اور صحبتوں سے جو باتیں معلوم ہوں اور ہم ان تجربات کی بناء پر اوسکی نسبت جو رائے قائم کریں وہ گویا دوسرا پردہ اٹھانا ہے پھر طویل معاشرت اور لین دین کے کافی معاملات کے بعد جو حقیقت ظاہر ہو وہ گویا تیسرا پردہ ہے جو حقیقت واقعی سے قریب تر کر دیتا ہے۔

## انسانی حقیقت کا پہلا مظہر

جب تم کسی ناواقف انسان سے ملتے ہو تو سب سے پہلے تمہاری نظر اوس کے بیرونی ظواہر پر پڑتی ہے یعنی اوس کے قد و قامت۔ ملاحت و رنگ اور لباس وغیرہ پر گویا تم نے اوس کے ظواہر کو دیکھکر اوس کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ گویا انسانی حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے تم نے پہلا پردہ اٹھایا ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے ظواہر کو دیکھکر حقیقت انسانی کو دریافت کرلیا جاتا ہے یعنی پہلی ملاقات اور پہلا تجربہ ہی باطن کی حقیقت تک پہنچا دیتا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے اور بہت تھوڑے انسانوں کو خدا نے ایسا ملکہ دیا ہے کہ وہ پہلی ہی نظر میں انسانی فطرت کو معلوم کرلیں۔

بہر نوع جلد باز اشخاص پہلی یا دوسری ملاقات ہی میں اپنے دماغ میں ایک خیال قایم کرلیتے ہیں اور بعض کو اپنی بصیرت پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ ایک نظر دیکھ لینے یا ایک مرتبہ گفتگو

کرلینے کے بعد آخری رائے قائم کرلیتے ہیں اکثر اوقات اون کا فیصلہ غلط ثابت ہوتا ہے اور جو رائے کسی کی فطرت کی بابت انہوں نے قایم کی ہوتی ہے وہ قطعاً غلط ہوتی ہے۔ اور کبھی اندازہ درست بھی ہوجاتا ہے اگر اون کی رائے درست ثابت ہوئی تو اوس شخص سے تعلقات قایم کرکے کامیاب اور خوش ہوتے ہیں اور تجربہ سے رائے غلط ثابت ہوئی تو اپنی عجلت کا خمیازہ بھی برداشت کرتے ہیں۔

ایک نوجوان شخص کی نظر جب کسی حسین وجمیل عورت پر پڑتی ہے وہ اوس کے بے پناہ حسن اور اعضا کی خوبیوں کو دیکھتا ہے۔ اوس کے قدوقامت کا حسن اوسکو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ جمال کی شان فریفتگی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ آواز کی نزاکت اور روح گرویدگی پر آمادہ کرتا ہے اور غزالی آنکھیں خمار کی سی کیفیت پیدا کرتی ہیں تو بے اختیار اوس کے دل اور دماغ کی تمام قوتیں اوس کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیتی ہیں کہ وہ اوس کی محبت کو اپنی دل میں جگہ دے اپنی آنکھوں میں اوس کی حسن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تصویر کو چھپالے اور اپنی خیالی قوت کو اوس کے تصور میں گم کردے۔

نوجوان کا یہ فیصلہ صحیح فیصلہ نہیں ہوتا اسلئے کہ اوس نے ابھی انسانی حقیقت کے چہرہ سے صرف ایک ہی پردہ اٹھایا ہے اور باقی دو پردوں کے اٹھانے اور اون کے اندر جو چیز مخفی ہے اوس کو معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے، وہ جب ان پردوں کو اٹھانے کی کوشش کریگا اپنی پہلی ہی نظر میں جسکو اپنا دل دیدیا ہے، اور اپنی محبوبہ بنانے کا فیصلہ کرچکا ہے جب اوس سے گفتگو کریگا۔ اوس کی فطرت کو جانچے گا۔ اوس کی زندگی اور معاشرت کی رفتار کو دیکھے گا تو یقیناً اوس کو اپنی عجلت پر ندامت ہوگی اور وہ اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوگا اسلئے کہ عام طور پر خوبصورت شکیل اور پسندیدہ اوضاع واطوار کی چیزیں اپنے باطن میں زہر رکھتی ہیں ہاں ایسا قاتل زہر جس کا کوئی تریاق نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک نوجوان عورت۔ ایک حسین دوشیزہ کسی نوجوان حسن مجسم نوجوان کو دیکھکر پہلی ہی نظر میں یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ یہ نوجوان اوسکی زندگی کو درخشاں بنادیگا نوجوان سے وابستگی اوس کی دنیا کو جنت بنادے گی اور اوس کی ازدواجی زندگی کے لئے اس نوجوان سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا لیکن اوس کی یہ رائے قطعاً غلط ہوتی ہے اور اوس کی یہ تمام امیدیں نقش برآب ثابت ہوتی ہیں جبکہ وہ اوس نوجوان کے باطن سے آگاہی حاصل کرتی ہے اوس کے باطن کی گندگی اور تاریکی آخر اوس کو متنفر بنادیتی ہے اور وہ نوجوان کو مار سیاہ سے زیادہ خطرناک اور زہریلا قرار دیدیتی ہے۔

عشق ومحبت اور شادی بیاہ کے معاملہ سے قطع نظر کرلو اسلئے کہ اس سلسلہ میں ظواہر پر فیصلہ کرنا بڑی حدتک ایک مخفی جذبہ پر مبنی ہوتا ہے۔ محبت کی آنکھیں بے نور ہوتی ہیں عشق اندھا ہوتا ہے ہاں عیوب ہمیشہ عشق کی آنکھوں سے مخفی رہتے ہیں محبت کی نظروں اور عشق کی آنکھیں جب کسی چیز کو پسند کرلیتی ہیں تو اوس کے عیوب بھی کمالات دکھائی دیتے ہیں وہ آنکھیں جن میں خودغرضی بھری ہوتی ہے محبت کی نظر میں ہمدردی سے معمور ہوتی ہیں وہ حسین چہرہ جس سے غرور وتمکنت اور خشونت کے شعلے نکلتے ہوتے ہیں محبت کی نگاہ میں معصوم چہرہ ہوتا ہے اور منہ کے دہانہ پر ہنسی کھیلتی نظر آتی ہے ہاں انسانی حقیقت کو دریافت کرنے کے لئے عشق ومحبت کی دنیا کو چھوڑ دو اور ان معاملات پر نظر ڈالو جنمیں کوئی ایسا مخفی جذبہ نہیں ہوتا جو ظواہر کے حسن پر آخری فیصلہ کرنے پر مجبور کردے ان تمام معاملات میں انسان اکثر پہلے مظاہرہ پر رائے قایم کرلیتا ہے اور دوسرے مظاہروں کا انتظار نہیں کرتا قدیم تمدن میں بھی

انسان کی یہی حالت نہیں ہے بلکہ علوم و فنون اور تجربات کا سمند چاروں طرف موجزن ہے اور انسان امکان بھر احتیاط کو تمام امور میں ضروری خیال کرتا ہے انسان۔ انسانی حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے تینوں پردوں کو اٹھانے کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتا۔

جب ہم کو اپنے کسی قومی ادارے کے لئے ناظم کی ضرورت ہوتی ہے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے معلم مطلوب ہوتا ہے۔ یا کسی کو اپنے شہر علاقہ یا صوبہ کا حاکم و نگراں بنانا ہوتا ہے تو ہم اس قسم کی تمام اہم ضرورتوں میں انسان کے پہلے مظہر کو دیکھکر آخری فیصلہ کر لیتے ہیں یعنی جو شخص ہم کو مشتین نظر آتا ہے اوس کو قومی ادارے کا ناظم بنا دیتے ہیں جو شخص مستعد اور محنتی دکھائی دیتا ہے اوس کو بچوں کا استاد مقرر کر دیتے ہیں اور جس شخص میں غیر معمولی ہیبت۔ دبدبہ اور شوکت نظر آتی ہے اوس کو حاکم و نگراں قرار دے لیتے ہیں

انسانی ظواہر پر آخری رائے قائم کرنے والوں میں زیادہ تعداد اون لوگوں کی ہے جو باطنی خوبیوں کو غالبًا حقیقی خوبیاں خیال نہیں کرتے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ جب اپنے حلقہ میں بیٹھتے ہیں اور اشخاص کا ذکر چھڑتا ہے تو عمومًا اون کی زبان سے اس قسم کے الفاظ نکلتے ہیں فلاں اسکول کے ناظم نہایت خلیق اور منکسر المزاج ہیں۔ فلاں مدرسہ کے سکرٹری نہایت وجیہ ہیں۔ فلاں مسجد کے امام صاحب کی آواز میں خاص درد ہے وہ جب نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہیں تو نمازیوں پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ فلاں مولوی صاحب وعظ میں اس درد سے شعر پڑھتے ہیں کہ مجلس وعظ سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا اور فلاں پیر صاحب کے ہاتھ اسقدر نرم و نازک ہیں کہ بے اختیار بوسہ دینے کو جی چاہتا ہے کیا یہ ظاہری خوبیاں اس قابل ہیں کہ ان پر توجہ کی جائے اور ان کو باطنی خوبیوں پر ترجیح دیجائے اس کے مقابلہ میں کتنے آدمی ہیں جو یہ کہتے ہوں کہ فلاں حاکم علمی قابلیت اور قانونی دستگاہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اور فلاں مولوی صاحب قرآن حدیث اور فقہ پر اتنا عبور رکھتے ہیں کہ ہر مسئلہ نوک زبان ہے

جن لوگوں کے ظواہر کو دیکھکر ناظم معلم اور حاکم مقرر کیا گیا ہے اور جنکی ظاہری خوبیوں پر روزانہ تبصرہ ہوتا رہتا ہے اگر ان کی باطنی حالت کو جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علمی اعتبار سے کورے ہیں۔ انتظامی صلاحیت سے خالی ہیں اور تعلیم کے طریقوں سے قطعًا ناواقف۔

ظواہر پر فیصلہ کرنے والے صرف عوام کالانعام ہی نہیں تعلیم یافتہ لوگ بھی ہیں کہ اون کی احتیاط پسندی اس معاملہ میں اکثر غیر ضروری ہوتی ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے جس خدمت پر لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے وہ اس کو خوبی کیساتھ انجام نہیں دیتے اور نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

ظواہر پر فیصلہ کرنے میں ایک اور چیز کو بھی بڑا دخل ہے اور وہ چیز اگرچہ ظواہر میں شامل نہیں ہے۔ لیکن مظاہر میں اس اعتبار سے اوس کو داخل کر لیا گیا ہے کہ اوس کے نتائج ظواہر ہی جیسے ہوتے ہیں وہ چیز شہرت و ناموری ہے جو قوم کے بعض سربرآوردہ لوگوں۔ بعض مقرروں اور اہل قلم وغیرہ حضرات کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کوئی شخص ان مشاہیر سے ملتا ہے تو بے اختیار اوس کے احترام کا جذبہ اوس کے اندر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ان کو غیر معمولی عظمت و عزت سے دیکھتا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دل و دماغ کو اس کی تکلیف نہیں دیتا کہ اون کی شہرت و ناموری سے قطع نظر کر کے اون کی حقیقت کو معلوم کرے جو بسا اوقات اوس کے خلاف ہوتی ہے جو ظواہر میں نظر آتی ہے۔

یہی شہرت و ناموری اکثر اوقات ایسے غلط نتائج پیدا

کرتی ہے کہ اگر انسان کو پہلے سے ان نتائج کا علم ہو جاتا تو وہ کبھی شہرت و ناموری کے اس پتلے کو کوئی عزت وعظمت نہ دیتا پھر بھی شہرت و ناموری بعض اوقات بدترین چیزوں کو بہترین چیزیں تسلیم کرنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے مثلاً ایک شاعر ہے جس کی بعض نظموں نے اوس کو شہرت کے آسمان کا آفتاب بنا دیا ہے شہرت کی اس معراج پر پہنچنے کے بعد اوس کا ہر شعر گویا بہترین شعر سمجھا جاتا ہے اور اوس کی ہر نظم ادب کے جواہر ہوتے ہیں حالانکہ وہی نظم اگر کسی معمولی شاعر کے نام سے پیش کی جاتی تو کوئی اوس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتا اور اوسمیں ہزاروں فنی خرابیاں پیدا کر دی جاتیں ہی طرح کوئی غیر مشہور شاعر بہترین نظم لکہتا ہے ہاں مشہور شعراء سے بہتر لیکن اوسکی نظم کو کوئی پڑہتا بھی نہیں اسلئے کہ وہ شہرت کا تاج اپنے سر پر نہیں رکہتا ہے اور اوس کو شہرت کے ظواہر نے ابھی تک عیوب وسقم کی دنیا سے باہر نہیں نکالا ہے۔

ہم نے شہرت و ناموری کی مثال اس موقع پر صرف شاعر سے دی ہے، اسی پر دوسرے فنون اور علوم میں مہارت رکہنے والوں کو قیاس کر لیا جائے۔

غرض یہ کہ انسانی حقیقت کو معلوم کرنے کی عام طور پر کوشش نہیں کی جاتی ہے اور صرف ظواہر کو دیکہکر انسانی حقیقت کے ادراک کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے جو قطعًا غلط ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام معاملات میں اس فیصلہ سے ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔

## انسانی حقیقت کا دوسرا مظہر

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ارشاد ہے

"تکلموا۔ تعرفوا ان المرء مخبوء تحت لسانہ"

یعنی آدمی سے گفتگو کر کے اوس کی حقیقت کو دریافت کرو۔ اسلئے کہ انسان کی حقیقت اوس کی زبان میں مخفی ہوتی ہے۔

جب تم کسی خوش پوش۔ وجیہ۔ خلیق اور متناسب اعضا انسان سے ملتے ہو تو تمہارے دل میں اوس کی جگہ پیدا ہو جاتی ہے اور اوس کی نسبت تم ایک رائے قایم کر لیتے ہو اوس شخص کی نسبت تمہارا یہ اعتقاد اور تمہارے یہ رائے اُس وقت تک قایم رہتی ہے جب تک کہ اوس کی حقیقت سے دوسرا پردہ نہ اُٹھ جائے یعنی جب تک تم معاملات و مسائل پر اوسکی بحث۔ گفتگو نہ سن لو اگر اس شخص نے اجتماعی مباحث اور سیاسی مسائل وغیرہ پر دلنشین بحث و گفتگو کی اور گفتگو و تقریر میں وسعتِ مطالعہ۔ ذکاوت اور علمی قابلیت کا ثبوت دیا تو تمہاری نظر میں اوس کی وقعت بڑہ جائے گی اور دل میں اوس کے لئے مزید گنجائش پیدا ہو جائے گی اور اگر اوس نے اپنی بے علمی۔ ناواقفیت اور بلادت کا ثبوت دیا تو تم نے اوس کی نسبت جو رائے قایم کی تھی، اوس کو بدلنا پڑے گا اور تمہارے دل میں اوس کی کوئی وقعت نہ رہیگی اور اگر اوس نے متوسط درجہ کی قابلیت کا ثبوت دیا تو جو رائے تم قائم کر چکے ہو وہ وہیں باقی رہیگی نہ کسی قسم کی اوس میں تبدیلی ہوگی اور نہ وہ رائے غلط قرار پائی گئی۔

اسی کے ساتھ اوس شخص کی ظاہری حالت یعنی وضع قطع اور لباس وغیرہ بھی اوسکی نسبت رائے قایم کرنے میں خاص مدد دیتے مثلاً کوئی اہل علم معمولی لباس میں ہو اوسکی وہ وقعت نہوگی جو خوش پوش اور خود دار عالم کی ہوتی ہے۔ یا کوئی اہل قلم قومی ادارے کا کوئی ناظم کوئی خطیب اور کوئی لیڈر علمی حیثیت سے زبردست اقتدار کا مالک ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اوسکو پہلی مرتبہ دیکہا اور پہلی مرتبہ اوسکی بحث و گفتگو یا تقریر کو سنا ہے وہ اوس کی نسبت بہترین رائے اوس وقت قایم کر سکیں گے

جبکہ وہ خلیق و متواضع بھی ہو خوش پوش اور خوبصورت بھی ہو اور رفتار و گفتار کی خوبیوں کا بھی مالک ہو۔ مطلب یہ ہے کہ معنوی خوبیوں کے ساتھ اگر انسان میں ظاہری خوبیاں بھی ہوں تو بہتر من رائے قائم کرنے میں اون سے بھی کافی مدد ملتی ہے۔

غرض انسانی حقیقت کو دریافت کرنے کیلئے دوسرا پردہ اوس وقت اٹھتا ہے جبکہ اوس سے بحث و گفتگو کی جائے گفتگو اور تقریر سے انسان کی حقیقت کے بہت سے سربستہ راز کھل جاتے ہیں۔ دوسری ملاقات اور پہلی نظر میں ہم نے جو رائے قائم کی ہوتی ہے وہ اکثر غلط ثابت ہوتی ہے لیکن اس پردہ کے اٹھ جانے سے بھی انسانی حقیقت کا پورا پورا ادراک نہیں ہوتا۔

بہت سے لوگ ہیں جو کسی مرد یا عورت کی نسبت رائے قائم کرنے میں دوسرے مظہر ہی کو کافی سمجھتے ہیں یعنی بحث و گفتگو اور پہلے مظہر میں اوس کو انسانیت کی صفت سے متصف پاکر اوس سے معاملات کو شروع کر دیتے ہیں لیکن یہ رائے بھی اکثر غلط ثابت ہوتی ہے اور انسان اپنی اس غلطی سے نقصان اٹھاتا ہے۔

بہت ممکن ہے انسان پہلے مظہر کے امتحان میں بوجہ احسن کامیاب ہو اور دوسرے مظہر میں بھی اوس کے اندر کوئی کمزوری نہ پائی جائے لیکن تیسرے مظہر میں وہ قطعاً ناکام رہے انسان حسین و وجیہ بھی ہوتا ہے اور خلیق و متواضع بھی۔ خوش پوش بھی ہوتا ہے اور خود دار بھی۔ علم و ادب کی قابلیتوں سے بھی آراستہ ہوتا ہے۔ اور فنی مہارتوں کا مالک بھی لیکن اوس کے اندرونی معاملات اسقدر خراب اور گندے ہوتے ہیں کہ اوسکی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتے ہیں اور جو شخص اوس کے پہلے اور دوسرے مظہر کو دیکھکر اوس کی فضیلت کا اعتراف کر چکا تھا اوس کے داد و ستد کے معاملات۔ خود غرضی اور لالچ کے مظاہر۔ اور بدبینی و بدطینی کے مناظر کو دیکھکر اپنی رائے کو بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ پہلے اور دوسرے مظہر پر بھی انسانی فطرت و حقیقت کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی اور انسانی حقیقت کا پورا پورا ادراک کرنے کے لئے طویل تجربے اور مسلسل معاشرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ہیں جو تیسرا مظہر دیکھنے کا انتظار نہیں کرتے اور اپنے معاملات میں انہیں دونوں امتحانات کو کافی سمجھتے ہیں مثلاً لڑکی کے والدین یا خود لڑکی جب کسی نوجوان کو حسین و جمیل۔ خوش پوش اور خود دار پاتے اور معاشرت و ملاقات میں پاکیزہ معاشرت وسیع الاطلاع۔ اور مہذب و مودب دیکھتے ہیں تو آنکھیں بند کر کے زندگی بھر کے لئے دونوں کو قانونی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی زندگی میں شریک ہو جاتے ہیں یعنی پہلے اور دوسرے مظہر کو دیکھکر ایک رائے قائم کرتے اور پھر اوس رائے پر اسقدر اہم کام کر لیتے ہیں جس کا تعلق دائمی موت اور دائمی زندگی سے ہوتا ہے اون کا فرض تھا کہ وہ عجلت سے کام نہ لیتے اور تیسرے مظہر کو بھی دیکھتے یعنی نوجوان کی باطنی حالت کا مطالعہ کرتے اوسکی علمی قابلیت اور معنوی محاسن پر نظر ڈالتے اور اس کے بعد صحیح رائے قائم کر کے معاملہ کو استوار کرتے

آجکل کے شادی بیاہ اور کاروباری معاملات ہی اصول پر ہو رہے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے مردوں کی زندگی بدخلق۔ ناشایستہ۔ جاہل اور بعض اوقات بدکار عورت کے ہاتھوں موت سے بدتر بنی ہوئی ہے اور بہت سی عورتیں جاہل۔ بدمزاج۔ کمینہ خصلت۔ بدمعاش۔ بدکار اور بدطینت۔ مردوں کے پلے باندھ کر دنیا میں دوزخ کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

خاموشی انسان کے عیوب اور نقائص کی پردہ دار ہے بہت سے مرد ہیں جو خاموشی سے اپنے عیوب و نقائص کو چھپائے رہتے ہیں اور بہت سی عورتیں ہیں جو شرم و حیا کے مظاہرہ میں

سکوت کو اختیار کرلیتی ہیں اور ذاتی نقائص وعیوب کو ظاہر نہیں ہونے دیتیں یہاں تک کہ اپنے اخفا کے اغراض کو حاصل کرلیتے ہیں اور جو لوگ دھوکہ کھاکران سے معاملات کرلیتے ہیں وہ اپنی عجلت پر ہمیشہ پچھتاتے ہیں۔

عاقل و دانا انسان موقع سے فائدہ اٹھانے کیلئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور اپنی کمزوریوں اور عیبوں کو چھپاکر اپنے اغراض کو حاصل کرنے کا کوئی موقع ترک نہیں کرتا وہ جب اپنے آپ کو اہل علم کے مجمع میں پاتا ہے جہاں زبان کی ادنےٰ سی لغزش راز کو طشت ازبام کردیتی ہے وہاں سکوت کو غنیمت کرلیتا ہے اور اپنی نسبت لوگوں کو اس امر کا یقین دلادیتا ہے کہ وہ ضرور عالم و فاضل ہے لیکن انتہا درجہ کا خوددار کہ فضول مباحث وگفتگو میں حصہ نہیں لیتا اسی کے ساتھ وہ اگر حسن ظاہری کا بھی مالک ہے۔ چہرہ پر ہیبت انگیز ملاحت اور آنکھوں میں وقار و تمکنت ہے تو غالباً وہ تمام مجمع میں فضائل و محاسن کا تنہا مالک ہے۔

# انسانی حقیقت کا تیسرا مظہر

انسانی حقیقت اسی پردہ کے اندر مخفی ہے ادھر یہ پردہ اٹھا اور اُدھر انسان اپنی اصلی صورت میں نظر آیا لیکن اس پردہ کے اٹھنے کا انتظار بہت کم لوگ کرتے ہیں اور فطری عجلت سے مجبور ہوکر اپنی ضرورتوں کو اسپر موقوف نہیں رکھتے۔

انسانی حقیقت کے چہرہ سے اس پردہ کو اٹھانے اور انسان کو اسکی حقیقی صورت میں دیکھنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے۔ یعنی مہینوں اوس کے ساتھ رہنے اوس کے معاملات کو دیکھنے۔ اوس کی تمدنی اور معاشرتی حالت کو جانچنے اور اوسکے ضمیر سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے

ان حقائق سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ انسان کے لین دین کے معاملات کو دیکھے اور بعض اوقات تجربہ کے لئے خود بھی جزوی رقم سے لین دین کرے۔ خرید و فروخت کے طریقوں پر نظر ڈالے۔ صدق و کذب کو جانچنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ امانت و خیانت کا امتحان لے اور اس کے بعد اوس کی نسبت کوئی فیصلہ کرے۔

جواریوں کی جماعت کے ایک ماہر فن شخص کا قول ہے کہ "انسانی حقیقت کا ادراک جوئے کے ذریعہ نہایت آسانی سے کیا جاسکتا ہے" بظاہر یہ تجربہ اس امر پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ اول تو خود جوئے کی رغبت انسانی اخلاق و عادات کا آئینہ ہوتا ہے پھر اوس پر دوسروں کا مال چالاکی سے حاصل کرنے اور اپنے مال کو بدنیتی اور مکروفریب سے بچانے کی کوشش انسان کے تمام ظواہر و بواطن امور کو ظاہر کردیتا ہے اور انسان جوئے خانہ میں اپنی اصلی شکل میں نظر آجاتا ہے۔

انسان کی حرص و طمع۔ امانت و خیانت اور صدق و کذب کا حال تو جوئے کی رغبت سے معلوم ہوتا ہے یا جوئے میں اوس کو شریک کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے اور بقیہ عادات وخصائل کی کیفیت معاشرت سے دریافت ہوتی ہے۔ اور عقلی و ذہنی ذکاوت یا دنارت، حماقت کے نمونے عام معاملات اور اہم امور پر غور و خوض کے بعد اوسکی رائے میں نظر آتے ہیں مثلاً انسان کی خانگی زندگی میں ماں باپ اور بھائیوں سے اوس کے سلوک کو دیکھکر اوس کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی اوس کی بدمزاجی۔ بدنیتی۔ بدخلقی۔ بے عقلی۔ اور تنگ دلی بھی خانگی معاشرت میں ظاہر ہوتی ہے اور خلق و سخاوت۔ فیاضی و کریم النفسی اور دانشمندی و خودداری کا اندازہ بھی خانگی زندگی ہی سے ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوستوں کے اندر اور رنگ میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اور گھر میں اصلی رنگ اثر

دکھاتا ہے مثلاً اوس کا برتاؤ دوستوں کے ساتھ نہایت شریفانہ ہے اور ہر شخص اوس کے خلق اور سنجیدگی کی تعریف کرتا ہے لیکن گھر کے اندر اس نمائشی شرافت، خلق اور سنجیدگی کا پتہ بھی نہیں ہوتا اور وہ انتہا درجہ کا بدخلق سخت مزاج اور کینہ پرور نظر آتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان گھر سے باہر بدمزاج بدخلق اور سخت گیر نظر آتا ہے اور گھر کے اندر نہایت خلیق مہربان۔ ہمدرد اور شریف طبیعت دکھائی دیتا ہے بہت ممکن ہے حقیقت وفطرت کا یہ اختلاف عوارض کے سبب ہو یا اغراض پر مبنی۔

مختصر یہ کہ تیسرا مظہر انسان کو اوسکی اصلی صورت میں پیش کردیتا ہے اور اوس کا ظہور عموماً اہم مواقع یا اہم خدمات ومناصب پر فائز ہونے کے بعد ہوتا ہے یا انسان اپنی اصلی فطرت ہی سے اہم مواقع۔ اور اہم خدمات اور اہم مناصب کو حاصل کرتا یا حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

انسان کتنا ہی خوبصورت کیسا ہی وجیہ ہو۔ کتنے ہی اچھے اور بہترین کپڑے زیب تن رکھتا ہو۔ کتنا ہی خوش خلق اور مہذب ومؤدب ہو لیکن جب تک اوس میں انتظامی۔ علمی اور ادبی قابلیتیں نہوں گی کبھی اوس کو کسی سیاسی انتظامی اور علمی منصب پر مقرر نہیں کیا جائے گا مطلب یہ ہے کہ اہم مناصب وخدمات اوس کو اوسی وقت نصیب ہوں گی جبکہ وہ اپنے تیسرے مظہر میں کامیاب ثابت ہو اور اوس میں مناصب حاصل کرنے کی اہلیت پائی جائے اسی پر دوسرے امور کو قیاس کرلینا چاہئے یعنی یہ کہ انسان پہلے اور دوسرے مظہر میں حقیقی انسان نہیں کہلاتا اور نہ اوس کو انسانیت کا جامع کہا جاسکتا ہے بلکہ انسانیت کے کمال کا اعتراف اوس وقت کیا جاتا ہے جبکہ اوس کے اندر معنوی خوبیاں نظر آتی ہیں اور اوس کا باطن پاکیزہ ہوتا ہے۔

## تنگ دامانیٔ الفاظ

پانی لے سکتے ہیں دریا سے اگر کوزے میں ہم
بہتے دریا کی روانی بند کرسکتے نہیں
شعر یوں کہنے کو کہہ لیں لیکن اختر سچ یہ ہے
دل کے محسوسات کو لفظوں میں بھر سکتے نہیں

## چاندنی رات

فضا ہے نور کی بارش سے سیم گوں اس وقت
جہان مست پہ طاری ہے اک سکوں اس وقت
نہ چھیڑ درد جدائی کی داستاں اے دل!
تجھے خبر نہیں میں کس کے پاس ہوں اس وقت

اختر انصاری

# نئے ادب کی ضرورت

## پر

## چند مشاہیر کی رائیں

ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ اُن کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کیلئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا۔ یا قافیہ کے الفاظ کیطرف نہیں جاتا۔ بلکہ اُس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔ اُس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی وہ شدت ہے جس سے ہمارے وہ جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور مذہبیات کی منزل مقصود ایک ہے صرف اُن کے طرزِ خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنیکی کوشش کرتا ہے۔ ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چُن لیا ہے ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں۔ یا ہم پر جو کچھ گذرتی ہے وہی تجربات اور وہی چوٹیں تخیل میں جاکر تحقیق ادب کی تحریک کرتی ہیں شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدتِ احساس ہوتی ہے۔ اُتنا ہی اس کا کلام دلکش اور بلند ہوتا ہے۔ جس ادب سے ہمارا ذوقِ صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے۔ ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبہ حُسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کیلئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے اُس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا زمانۂ قدیم میں مذہب کے ہاتھ سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی اور وہ تخویف یا تحریص سے کام لیتا تھا۔ عذاب و ثواب کے مسائل اُس کے آلۂ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے، اور اس کا آلۂ کار ذوقِ حُسن ہے۔ وہ انسان میں اِس ذوقِ حُسن کو جگانیکی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حُسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں یہ ذوق جتنا ہی بیدار اور پُرعمل ہوتا ہے اُتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوتِ احساس کے ذریعہ اِس جذبہ حُسن کی تنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مُستحسن ہے، انسانیت سے خالی ہے۔ اور وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ تیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے وار کرتا ہے۔ یوں کہئے کہ وہ انسانیت کا، علویت کا، شرافت کا علم بردار ہے۔ جو پامال ہیں مظلوم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

”ادیب کا مِشن محض نشاط اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے، اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے، وہ وطنیت اور سیاسیات کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ اُن کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے

والی حقیقت ہے :-

* * *

"ہم ادب کو محض تفریح و تعیش کی چیز نہیں سمجھتے ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو۔ جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی"۔

پریم چند مرحوم

* * *

"ہمارے لئے بزرگان سلف نے ادب کا ایک بہت بڑا ترکہ چھوڑا ہے اس میں خوبیاں بھی ہیں خرابیاں بھی ہیں۔ ہمارا کام اپنی ضروریات کے مطابق ان کمیوں کو پورا کرنا اور نئی نئی چیزوں کا پیدا کرنا ہے۔ ہماری اکثر پرانی قسم کی غزلوں میں ایک خیالی صنم کے عشق میں بیقرار رہنا، مصنوعی نعمت کی نوک جھونک، مبالغہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا، سرد آہیں بھرتے رہنا۔ ہر گھڑی مقدر کا رونا رونا، کفن سر سے باندھے رہنا، یہ ایک الٹی قسم کی ذہنیت اور ایک غیر فطری اور بیکار اور لغو زندگی کی علامات ہیں۔ ع غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے۔ اب نہ ایسی خیال آرائی برداشت ہوسکتی ہے، نہ ایسی ناز برداریاں ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہم اپنے ملک الشعرا کے اس قول پر کان دھریں کہ ؎

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے + کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

بلکہ اب بھی ہمیں اپنے "ترجمان حقیقت" کی اس ہدایت پر عمل کر دکھانا ہے کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

راقم نے سکول کے دنوں میں جب یہ شعر سنا ؎

جو چمن سے گذرے تو اے صبا تو یہ کہنا بلبل زار سے
کہ خزاں کے دن بھی قریب ہیں نہ لگانا دل کو بہار سے

تو فوراً اپنی تنگ بندیوں کیلئے "زار" تخلص اختیار کر لیا لیکن جب ذرا ہوش سنبھالا اور دنیا کا نیا انداز دیکھا تو معلوم ہوا کہ مشرق و مغرب میں "بلبل زار" اور "زار روس" دونوں کا زمانہ ہو چکا ہے۔ ہم ابھی یہی رونا رو رہے ہیں کہ "غم کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے" اور "آہستہ خرام بلکہ مخرام" اور وہاں بیل گاڑی کی بجائے موٹر کار۔ اور ہوائی جہاز اور ریڈیو اور کیا کیا کچھ۔ رگ رگ میں زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔!

جناب جوش ملیح آبادی خوب لکھتے ہیں: "شباب و محبت کا واسطہ، اپنے ادبیات میں حیات و بیداری کا خون دوڑائیے اور وطن عزیز کے لئے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے جس کی سنہری اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس فوج در فوج اور قطار اندر قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔"

یہ درست ہے کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"۔ ہمارے ادب کے چمن میں بجائے بلبل و قمری کو کوئل اور فاختہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستانی فضا پیدا کرو۔ مقامی فسانے لکھو، ہندوستان کے مذاہب کا تذکرہ کرو۔ لیکن ساتھ ہی "گھر سے نکل کے دیکھو ہندوستان والو" دیکھو کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مغرب کی نئی زندگی کو دیکھو وہاں کے تازہ ادب کو دیکھو کیونکہ آزادی کی تنظیم کی منصوبہ بندی کی، اشتراکیت کی، اور عدل و مساوات کی موجیں اس کے طوفانی سمندروں میں اچھل رہی ہیں۔ تم میں بھی نئی زندگی کا احساس پیدا ہوگا تو نئے سے نئے خیال پیدا ہوں گے اور وہ اپنے لئے خود بخود اظہار کے نئے طریقے

ڈھونڈھیں گے۔ اس طرح ایک نئی طرزِ تحریر، نئے الفاظ اور ایک نیا ادب پیدا ہوگا۔ اور جو خیال ایک صحیح قسم کی زندگی سے پیدا ہوگا جو اپنے لئے مشکل الفاظ نہ تلاش کریگا بلکہ وہ دیتے تک کو دل میں آسانی سے جگہ پیدا کر لے گا۔ ہمارا مقصد ہونا چاہئے عام لوگوں کی تعلیم و ترقی۔ اس کے لئے ضرورت ہے اصلاح شدہ شاعروں کی، آسان فلمی ڈراموں کی، اور رسالوں خصوصاً روزانہ اخباروں میں آسان عام فہم زبان میں نئے اصلاحی و انقلابی خیالات کی۔ المعات، کیفیات، ان مجہولات کی جگہ اگر دل سے دل کی باتیں ہوں، سیدھے سادے جذبات ہوں۔ دنیا کی تازہ تحریکوں کا نقشہ ہو۔ سائنس کی روز افزوں ترقی کا بیان ہو تو ہماری جاہل ناواقف قوم ادبیات سے کتنا فائدہ اٹھائے پھر ادب اُس کی بیداری کا ذریعہ بن جائے۔ اور ایک نئی زندگی کی بنیاد پڑے۔ کہیں کہیں کوئی آواز بلند ہو رہی ہے۔ مغربی ادب کے مطالعہ اور اقبال کی حیرت انگیز شاعری نے ایک نئے دور کا آغاز ضرور کیا جس سے بعض نوجوان مصنف اور شعراء متاثر ہوئے لیکن اِس کے ساتھ ہی بدقسمتی سے نشاط پسندی اور ایک غلط قسم کی "ٹیگوریت" اور نام نہاد "رومانیت" نے پھر ہاتھ پاؤں شل کر دیئے "تو دوپٹہ چن رہی تھی اور میرا دل دھڑک رہا تھا" یا "اے شاہدِ حقیقی! میں تیرے نور جمال سے بے اجر ہو کر افتاں و خیزاں آ رہا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ اِس دل کی دھڑکن اور اِس اندھا دھند نام نہاد حقیقت پرستی کی روک تھام کی اشد ضرورت ہے۔ فطری خیالات کی اور آسان زبان کی حاجت محض اس لئے نہیں کہ ہماری زبان دوسری زبانوں کا مقابلہ کامیاب طور پر کر سکے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ وہ خود ہمارے لئے مفید ثابت ہو اور ہماری صحیح تعلیم و تربیت کی ضامن بنے۔ پھر کچھ شبہ نہیں کہ دوسرے لوگ اِس سے ضرور متاثر ہوں اور دیکھیں کہ کیسے ہم نے اپنی زبان کو اور ہماری زبان نے ہمیں شاہراہ زندگی پر سیدھے رستے ڈال دیا ہے۔!"

**میاں بشیر احمد بی۔اے (آکسن)**
بیرسٹرایٹ لا، مدیر "ہمایوں" لاہور

✣ ✣ ✣ ✣

"ہمارا ملک ہر قسم کے مذہبی توہمات کا شکار ہے۔ مذہبی تعصب یا رُوحانیت نے جو گل ہندوستان میں کھلائے ہیں۔ سب کو معلوم ہیں۔ رُوحانیت کی خاطر ہم نے غلامی تک قبول کر رکھی ہے۔ رُوحانیت کے علاوہ ہمیں اپنے اخلاق پر بھی ناز ہے، ممکن ہے کہ ناز بجا ہو، مجھے اِس سے بحث نہیں۔ رونا اس بات کا ہے کہ مذہب، رُوحانیت اور اخلاق ادبی دُنیا میں بھی گھس گئے ہیں اور اس بُری طرح کہ نکالے نہیں نکلتے۔ ادبی فن کو مذہب روحانیت اور اخلاق کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ جب میں اپنے تعلیم یافتہ دوستوں کی زبانی سُنتا ہوں کہ فلاں کہانی، فلاں ڈرامہ یا نظم دھارمک ہے یا اخلاق اور روحانیت سے پُر ہے تو مجھے یہ خیال کر کے رنج ہوتا ہے کہ سیاسی سوراج کی طرح ہمارا ادبی سوراج بھی ابھی کوسوں دور ہے۔ ہر ایک ملک اور زمانہ کا اخلاق مختلف ہے، بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہیگا مگر خوبصورتی ایک اٹل چیز ہے۔ خوبصورتی کے پرو انے مذہب و ملت رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ایک غزل یا افسانہ کو اخلاقی یا روحانی یا مذہبی نظر سے دیکھنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ ایک پھول سے ہم پوچھیں کہ تیرا مذہب کیا ہے اور تیرے پیدا ہونے کا راز کیا ہے۔ اور تو اپنی خوشبو اور خوبصورتی کو بڑی بے باغ میں کیوں بکھیر رہا ہے۔۔۔"

**پروفیسر بھوپال سنگھ ایم۔اے، ڈی (لٹ)**

✣ ✣ ✣

"۔۔۔۔۔ یہ زمانہ غپ شپ اور قصہ کہانیوں کا نہیں ہے۔ شاعری کرنا ہے تو افسانوں کو چھوڑ دیجئے۔ نقاشی مت کیجئے بلکہ

فوٹو گرافری کیجئے۔ ورنہ آپ کی نقاشی کے ایک سے ایک بڑھکر
نمونے فوٹو کی ایک کھنچ دینے والی تصویر پر سے قربان کر دئیے جائیں
گے .... یورپ کی افسانہ نگاری کا عروج اسی میں ملتا ہے
اور اگر آج نئی پود اپنے افسانہ نگاروں میں سے گل و بلبل نکال
پھینکے اور سیدھی سادی وقائع نگاری پر آجائے تو [illegible]
کہ ہم یورپین افسانہ نگاروں سے بڑھ جائیں کیونکہ یہ ممکن
ہے کہ دلچسپ واقعات روس میں تو ہوتے ہوں مگر ہندوستان
میں نہ ہوتے ہوں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ چونکہ ہندوستان میں
سیکڑوں مذہب، رسمیں، قومیں، زبانیں اور روس اور
فرانس سے کہیں زیادہ اختلافات یہاں موجود ہیں۔ قدم قدم
پر طرح طرح کے قانون ہیں۔ [illegible] روس اور فرانس کے
ہندوستان کی معاشرت ایسے ایسے تماشے کے واقعات پیش
کرتی ہے جن کے عجیب وغریب پلاٹ دوسری جگہ مرتب ہونا
ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ [illegible] جو کچھ ہو رہا ہو، اور جو
دکھائی دے وہ لکھو۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

* * *

"... ایک طرف پولیس کا وہ پنشن خوار داروغہ ہے
جو تمام عمر اپنی فرعونیت اور ہوس پرستی کا مظاہرہ کرنے کے
بعد تسبیح کے دانوں پر اپنے گناہوں کا شمار کر رہا ہے۔ اُسے
ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اُس کو رُلانے اور سُلانے میں
مدد دے سکیں پھر وہ مولوی ہے جو دین کے پردہ میں دُنیا
دار ہے جس کی ہوس پرستی کو اشعار کے اس ناپاک دفتر سے
ایک گونہ تسکین ہوتی ہے اور وہ تعلیم زدہ لڑکیاں ہیں جو زن مُرید
شاعروں کی ٹھنڈی سانسیں سنکر کسی مجنوں کے انتظار میں ہیں۔
وہ ایسی کہانیاں پڑھنا چاہتی ہیں جن کی ہیروئین وہ خود ہوں اور
جن کے ہیرو خودکشی کر کے بٹیروں کی طرح تڑپ رہے ہوں۔ کیا
آپ کی اُمنگ کا وقت ان ہی کیلئے وقف ہوں گی۔

دوسری طرف وہ کسان ہے جو سماج کا سنگ بنیاد ہے
زمیندار اور سُود خوار جونک کی طرح اُس کا خون پی رہے ہیں
مولوی اس پر خود گذاری اور صبر و شکر کا جادو پھونکتے ہیں۔ اس
کی بیوی روٹیوں کیلئے عصمت فروشی پر مجبور ہے۔ اُس کے بچے
بھوک سے تنگ آکر آپکی جیب پر گھات لگائے ہوئے ہیں۔ وہ مزدور
ہے جو سماج کی عمارت کا ستون ہے وہ مال اس لئے پیدا کرتا ہے
کہ منافع کے نام سے ایک دوسرا شخص اُسے ہتھیا لے جس کے لئے
لغت میں مالک کا لفظ تراشا گیا ہے۔ قید خانہ کی کوٹھریوں سے بدتر
جھونپڑیوں میں پلیگ اور ہیضہ میں تڑپکر وہ بھوکا اور ننگا مزدور اس
حسرت میں مرجاتا ہے کہ مارواڑی کا سانڈ یا کسی امیر کا کتا کیوں نہ ہوا۔
کیا اس کے حال زار نے کبھی آپ کے دل میں چٹکی لی ہے۔ کیا کبھی
آپنے سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیا کبھی ان اسباب وعلل کو
مٹانیکا خیال آپکے ذہن میں آیا ہے۔ اگر نہیں تو آپ ادب کیلئے
باعث ننگ ہیں۔ ایسے ادیبوں کیلئے کروپاٹکن کہتا ہے:۔

کیا تم مصنف بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے مصائب کی
داستان پر نظر ڈالو اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہوجاتا تو
اپنے قلم کو پھینکدو اس قلم کا مصرف صرف یہ ہے کہ تمہارے جیسے دل کی
ناپاکی کا پردہ فاش کرتا رہے۔" اختر حسین رائیپوری بی، اے

# "نہرِ صفا" کے کنارے [۱]

## مصر کی سحر طراز ادیبہ آنسہ "می" کا ایک نظر افروز شاہکار

(مترجمہ: صلاح الدین قریشی دہلوی)

یہاں کائنات کا ہیولیٰ اور وجود کے ذرّے ایک سیّال مادّے کی صورت میں بہ رہے ہیں۔

یہاں سطحِ آب پر پیدا ہونے والے بلبلے حرارتِ شباب سے برمائے ہوئے دل کے جذبات و احساسات کا نقشہ پیش کر رہے ہیں

یہاں خوشبوئیں نرم و گداز سانس لے رہی ہیں۔ اور حسین گلاب سنہری شعاعوں سے کھیل رہے ہیں۔

قوس قزح شاید یہیں سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کے سحر کار رنگ سطحِ آب پر تیرتے پھر رہے ہیں۔

قوس قزح کے یہ سرمدی رنگ، شاید جوانی کے رنگین خوابوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

یہاں اُفق کی بستیاں اپنے اسرار و رموز سنہری شعاعوں کے ذریعہ سطحِ زمین پر بکھیر رہی ہیں۔

یہاں دوشیزگانِ فطرت کی نگاہوں میں ازلی سائے تھرتھرا رہے ہیں، یہاں نور و ظلمت، بیداری و خواب ایک دوسرے میں جذب ہیں۔

یہاں شعر و شباب کے نغمے آوارہ طیور کی طرح پرواز کر رہے ہیں، اور نسیم شرابیوں کی طرح ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔

ننھی ننھی موجیں جس وقت اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ایک دوسرے کے آغوش میں سما جاتی ہیں، تو اُن کے چہروں پر تبسم اور نگاہوں میں شوخی ہوتی ہے۔

یہاں سرسبز ٹہنیوں پر پتوں کا ارتعاش، ایک پُراسرار پیغام ہے، جو کرۂ زمین کو غور سے دیکھنے والے ستاروں کو دیا جا رہا ہے۔

لچکدار شاخوں کی جنبش اور بار بار جھکنا، وہ الہامی سرگوشی ہے، جو معصوم فرشتوں سے کی جا رہی ہے۔

یہاں منوّر راتیں اور دُھندلی سحریں ہیں جنہیں نغموں، رنگ آمیزیوں اور احساسات کے معنے جلوہ گر اور پوشیدہ ہیں۔

جب سحر کی دیوی پہاڑ کی چوٹیوں پر سے گذرتی ہے، تو وہ اس نہر کے بلوریں آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی ہے۔ وہ اس میں شباب کی دل آویز نظری کو، مع ان آرزؤں کے جو پھولوں کی طرح متبسّم ہیں اور مع اُن جذبات کے جو فضا میں پرواز کرنیوالے پرندوں کی طرح مضطرب ہیں دیکھ لیتی ہے۔ پھر غروبِ آفتاب کے وقت اُس کی گہرائیوں میں آلام کی تلخی مع ترچھی نگاہوں، پھیکے تبسموں شکن آلود پیشانیوں اور ساکن لبوں کے نظر پڑتی ہے۔

یہاں حزن و ملال کا بربط آہ و زاریاں کر رہا ہے۔ وہ مجروح دل کے ساتھ رو رہا ہے۔ ہر لحظہ یہی گمان ہوتا ہے

[۱] اس مضمون میں میں نے کہیں کہیں تغیر و تبدل یا ایزاد و ترمیم سے کام لیا ہے۔ "ص۔ق"

کروہ آخری سانس لیے مترواں ہی نے رہا ہے۔ جن میں دل شکستگی اور پوشیدہ رازوں کا اتنا ہی عنصر ہے جتنا کہ عظمت و جلال اور شجاعت و مردانگی کا۔۔!

لیکن آبِ رواں نہ تو کبھی فنا ہوتا ہے اور نہ کوئی اس کی یقینی حد ہے، اس میں ماضی کی یاد پنہاں ہے اور مستقبل کی جھلکاریاں نظر آتی ہیں۔ اس میں خوشی کے قہقہے اور غم کی آہیں دفن ہیں۔

یہاں زندگی کا معمہ اور زمانے کی گردش میری پیش نظر ہے۔ اس معمہ کے سامنے میں خود ایک معمہ ہوں۔ اور ایک مسلسل گردش۔۔! میں اکیلی اس غمگین ساحل کے پاس سرگرداں ہوں، مجھے سب کچھ نظر آرہا ہے، لیکن دیکھ نہیں سکتی سن رہی ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتی، ڈھونڈھ رہی ہوں لیکن کچھ نہیں پاتی، جاننا چاہتی ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔ ... میرا دل اس نہرِ رواں کے قلبِ مضطر کے ساتھ برابر دھڑک رہا ہے۔ میری روح خوابوں اور نغموں میں گھری ہوئی ہے۔ میں ایک ذی روح معمہ ہوں اور سرسبز شاخوں کے نیچے کھوئی ہوئی ہوں۔ میں مستفسرانہ نظروں سے سامنے سطحِ آب کو دیکھتی ہوں لیکن وہ خود چیستاں ہے اس میں مجھے اپنی ہی صورت نظر آتی ہے اور میں اس میں گم ہو جانا چاہتی ہوں۔

---

دن چھپتے ہی میں نہر کے کنارے آپہنچی اور قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ میں بیٹھ گئی اور تخیلات کی عطر بیزیاں جن میں "نباتِ بحر" کی سی رعنائی تھی میرے شعور پر چھا گئیں۔ سامنے دیوتا شفق کے رنگین ٹکڑوں سے کھیل رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ تاریکی کی لہروں پر تیرنے لگے۔ اس وقت روح پرور بنفشہ کے تاج اُن کے سروں اور یاسمین کے ہار اُنکی گردنوں کو زیب دے رہے تھے۔ جب وہ مسکراتے تھے تو ستارے چمکنے لگتے تھے۔ صنوبر کے درختوں کے نیچے تخیلات کی دیویاں بیم و رجا کے رموز منظرِ عام پر لا رہی تھیں۔ عیش و طرب کی کنواریاں احساسات کے خوشوں سے وہ شراب کھینچ رہی تھیں جن سے دیوتا مخمور ہو جاتے ہیں۔

اس جہاں دیدہ پتھر پر جہاں اس وقت میں تخیلات اور احساسات کی شراب سے مخمور خواب کی سی حالت میں بیٹھی ہوں مجھ سے پہلے سینکڑوں آنیوالے بیٹھے ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک کا دل فطرت کے زیر و بم اور ابدیت کی جھنکار دل سے زور زور سے دھڑکنے لگا ہوگا۔ اس وقت جو خیال میرے دماغ میں چکر لگا رہا ہے وہی اُن کے دل میں بھی ہوگا، اس لئے کہ افکار و احساسات کا منبع اور اُن کا لازمی نتیجہ ایک ہی ہے۔ گو وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے متعدد اور متضاد ہوں۔ نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں پرورش پانے والے متعدد مشاعر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک یہی سوچتا ہوگا۔ نہ جانے یہ آبِ رواں کتنا قدیم ہے۔ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور انتہا کہاں ہوگی؟

ننھی ننھی لہریں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسری سے بڑھ جانا چاہتی ہے۔ اس مسلسل کشمکش سے ایک سرمدی نغمہ پیدا ہو رہا ہے۔ فطرت کا سیّال عنصر جس میں فیوض خداوندی کے اسرار پوشیدہ ہیں ایک نرم و گداز تصادم کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کی حدود پر ابدیت کے شہپر مصروفِ پرواز ہیں۔

میرے دماغ میں نامعلوم افکار کی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور دل میں جذبات کا مد و جزر تھا۔ میں کنارے پر بیٹھ کر شوخ لہروں سے کھیلنے لگی۔ نیچے تہ میں رنگین سنگریزے

ساکن وجامد پڑے تھے۔ میں نے ان میں سے چند یہ کہتے ہوئے
اٹھالئے: "اے جواہر پارو! میں تمہیں اپنے ساتھ لیجاؤنگی۔
تاکہ تم ان لامحدود جذبات کی یاد تازہ کرتے رہو جنھوں نے
"نہر صفا" کے سامنے میرے دل میں تلاطم برپا کردیا۔ تم
اس وقت کی لاثانی یادگار ہو جو میں نے یہاں گذارا ہے!"
جب میں نے نظریں اٹھائیں تو سطح آسمان پر چمکنے والی
زہرہ ستارے کی نظریں تاریکی کے دیوتا پر جمی ہوئی تھیں جس
کا نامعلوم ہاتھ فلک کی چادر پر لاتعداد آسمانی نقوش ثبت کر
دیتا ہے۔

---

اے "نہر صفا" میں تیرے پاس ایسی حالت میں آئی
جبکہ میری روح اور جسم دونوں تھکے ہوئے تھے۔
میں نے صبح ہی صبح روزنامے میں موجودہ صورت
حالات کا مطالعہ کیا، تو میری فضائے خیال میں توپوں کی ہیبتناک
آوازیں گونجنے لگیں، جنگی ہوائی جہازوں کا شوروغل اور
لاتعداد بندوقوں کی گونج میرے احساس میں سرایت کرگئی۔
مجھے "جنگ کا دیوتا" اپنے سامنے مجسم نظر آنے لگا۔ پھر میں نے
تصور ہی میں کانفرنسوں اور دیگر مجالس کا قصد کیا۔ جہاں
امن وعافیت کا سبق دیا جاتا ہے۔ وہاں بے معنی تقریروں
اور مضحکہ خیز تجویزوں نے میری سماعت کو زخمی کردیا۔ میری
روح ان کے سطحی خیالات اور منحوس مقاصد کے احساس سے
کانپنے لگی۔ مجھے انسانوں کی بیوقوفی اور انکے خیالات کی گندگی
پر تعجب ہونے لگا۔ اس دوران میں میں نے تیرا موسیقیت
سے پُر نام سُنا، تو مجھے تجھ سے محبت ہوگئی۔ چونکہ یہاں سب
کچھ ہے ــ حسن بھی اور شیرینیٔ حیات بھی ــ! ــ امن
بھی اور صداقتِ جذبات بھی ــ!!
کذب وافتراء کے گرم ریت نے میرے پاؤں جُھلسا
دیئے ہیں اور جھوٹی زندگی کے نکیلے کانٹوں نے میرے ہاتھ
زخمی کردیئے ہیں۔ میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ اس ماحول
میں اپنے زخموں کیلئے مرہم تلاش کروں۔ میری بینائی پر
مادی غبار چھایا ہوا ہے۔ جو جمال معنوی کو میری نظروں سے
چھپائے ہوئے ہے۔ میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ اپنی
نگاہوں کو تیرے پاک اور مقدس پانی میں غسل دے
لوں۔
میرا دل سینے میں مضطرب ہے، وہ چاہتا ہے کہ تیرے
دھارے پر بہتا ہوا عمیق سمندر کے آغوش میں چلا جائے،
جو دور سے مجھے پکار رہا ہے۔
تو دخترِ سحاب ہے، تو بادلوں کی کنواری ہے۔ تو حوادث
ہوا کا کھلونا ہے، تو مانعِ دائمی کا تبسم ہے، تو وادیوں اور
پہاڑیوں کے درمیان فضائے آسمانی کا قہقہہ ہے، تو آفتاب
کا بوسہ ہے سمندر کے لئے۔ تو سربلند پہاڑ کا گیت ہے وادی
میں گونجتا ہوا۔ تو جزوی روح ہے جو "روح کُل" کی گود کی
طرف تیزی سے رواں ہے۔
تو دل کے رازوں کی طرح گہری ہے، شرابی کی نظروں
کی طرح میٹھی ہے، تیرے نام میں موسیقیت ہے، تیرے
مزاج میں تلوّن ہے۔
میں تجھ سے محبت کرتی ہوں اے "نہر صفا"! تو مجھے اس
زندگی اور اس کے شوروغوغا سے دور لے چل۔ مجھے اپنے
ساتھ لے چل...... لیکن، یہ میں کیا کہہ رہی ہوں......
وفورِ جذبات میں میں یہ کیا کہہ گئی...... مجھے تجھ سے کیا
نسبت؟
تو ایسے سیّال مادوں کا مجموعہ ہے جو وجدان سے عاری
ہیں۔ تیرے سینے میں کوئی دل نہیں دھڑکتا۔ اور میں....
میں تجھ سے بالکل متضاد ہوں۔ تو اُفق اور سمندر کا درمیانی
معمّہ ہے ــ اور میں زندگی اور لانہائیت کے درمیان

ایک چیتاں ہوں۔ میں انسان کی جہالت اور اس کے مصائب کو خوب جانتی ہوں۔ لیکن، تو ــــ تو اپنے آپ سے بھی بے خبر ہے۔

اے "مہر صفا"! تو بہے جا، تو بہتی رہ اور مجھے چھوڑ دے ــــ تو نباتات اور پودوں کو سیراب کر، دہانِ گلاب میں چمکتے ہوئے موتی بکھیر، زمین کے جلتے ہوئے سینے کو سکون پہنچا، کہسار کی تنہائی میں گاتی رہ، تو اپنا نہ ختم ہونے والا افسانہ سناتی رہ، شور مچا اور خاموش رہ، گا اور روتی رہ۔ یہ تیرا معمول ہے ..... یہ ہوتا ہے اور یہ ہوتا رہے گا۔

تو شور مچاتی چلی جا، اور مجھے تنہا چھوڑ جا تاکہ میں انسان کی بدنصیبی پہ روتی رہوں۔

میرے دماغ کے خلاء پر احساسات کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور میرا دل تیزی سے دھڑک رہا ہے ــــ مجھے تجھ سے اور اس مایوسی سے کیا کام؟ ــــ میرا دل تو اس غم کے عالم میں بھی "حیاتِ نو" کیلئے تڑپ رہا ہے۔

صلاح الدین قریشی

# افسانۂ غم

زباں بن گئی ہے مری بے زبانی ... نہ اب قیدِ لفظی نہ بندِ معانی

ہے آتش فشانی، نہ شعلہ مزاجی ... گئی ساتھ سر کے وہ سر کی گرانی

تغیّر پسندی نہیں خوب اے دل ... محبّت ہے آزادِ قیدِ زمانی

نگاہوں سے چھپنا مبارک! مبارک!! ... تری دید تک تھی مری زندگانی

کسے یاد ہے اب وہ افسانۂ غم ... مگر داغِ دل ہے اسی کی نشانی

ترے بعد راتوں کو رو رو کے جاذبؔ

ستارے سنائیں گے تیری کہانی

جاذب دہلوی

# بال جبرئیل

نوٹ:- ذیل کا مضمون دائرۂ ادب" بمبئی کے اجلاس منعقدہ ۲۶ر جولائی ۱۹۳۵ء میں خاکسار نے پیش کیا تھا۔ (شہاب)

شاعر مشرق ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہ کے اردو کلام کا دوسرا مجموعہ بیس سال کے بعد "بال جبرئیل" کے نام سے تاج کمپنی لاہور نے صرف ۲۲۴ صفحات پر۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع کیا تھا۔ جس کی کتابت وطباعت بہت حسین ہے۔ اور موضوع فکر۔ زندگی۔ گو مطالب عالیہ اور لطائف ادبیہ وشعریہ کے لحاظ سے یہ کتاب ہیروں میں تولنے کے قابل ہے۔ مگر مفلوک الحال ہندوستان کے شعر نواز۔ فاقہ مست ادیبوں اور فلسفیوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہ ہیروں کی مالا۔ چاندی کے تین چار سکوں میں بہت گراں معلوم ہوتی ہے۔

میں نے اپنی استعداد اور مذاق کے مطابق چاہا تھا کہ بمبئی میں علم وادب کے ستھرے مذاق کا نمونہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ "جوہر" کے نام سے سال گزشتہ ایک ہفتگی تعلیمی وادبی پرچہ شایع کرنا شروع کیا تھا۔ جو آٹھ نمبروں کے بعد "جوہر"۔ ہو کر رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہاں اسی جوہر کے ابتدائی دو نمبروں میں خاکسار نے "بال جبرئیل" پر مختصر اظہار خیال کیا تھا۔ اب چاہتا ہوں کہ پھر اسی حکایت شیریں کو احباب کرام کی خدمت میں نئے اسلوب سے حک واضافہ کے بعد پیش کر دوں۔ کیونکہ کہا گیا ہے ؎

باز گو از نجد واز یاران نجد تا در و دیوار را آری بوجد

واقعہ یہ ہے کہ "حکایت دل"، کے متن کی تفسیریں۔ ہمیشہ پرکیف رہی ہیں۔ اور ان کی تکرار میں لطف زندگی کا وہی نشہ وکیف برقرار رہتا ہے اور رہے گا۔

اقبال کے کلام پر کوئی مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے۔ بجا طور پر اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا جا سکتا ہے۔ کہ "چھوٹا منہ بڑی بات"، تاہم اس مقالہ مختصر کا منشا یہ ہے کہ اور نہیں تو کم از کم اپنے ملک کے شاعر ادیب۔ فلسفی اور مسلمان مفکر کے خیالات کا اعادہ ہی اپنے ذی علم واہل نظر احباب کی مجلس میں کہ دیا جائے۔

## اقبال کی شاعری کی ابتدار

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کی عمر کم وبیش چالیس سال ہے۔ زمانہ قیام سیالکوٹ کی شاعرانہ شگوفہ کاریوں سے قطع نظر۔ ابتداً آپ اردو کے ایک نوخیز نغمہ گو شاعر کی حیثیت سے لاہور کی ادبی مجلسوں میں شامل ہوئے۔ یہ زمانہ آپ کی کالجی تعلیم کا تھا۔ پھر ترقی کرتے کرتے کالج کا یہ طالب علم۔ پروفیسر اقبال کے نام سے قومی مجالس میں داد سخنوری دینے لگا۔

گورنمنٹ کالج لاہور کا یہ طالب علم جو بعد میں پروفیسر اقبال۔ ڈاکٹر اقبال۔ اور سر اقبال کی منازل ارتقائی سے گزر کر اب علامہ اقبال کہلا رہا ہے۔ اس نے اولاً فارسی وعربی ادبیات کی تحصیل مولوی سید امیر حسن سیالکوٹی سے کی تھی۔ جو بعد میں شمس العلماء کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔ فلسفہ کی تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر آرنلڈ سے حاصل کی۔ اور اردو شاعری میں رسمی شاگردی کا شرف۔ ہندوستانی شعراء کے دستور عام کے مطابق جگت استاد۔ نواب مرزا خان داغ دہلوی مرحوم سے حاصل کیا۔

اقبال کی منت پذیر اور شکر گزار طبیعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ نے ان تینوں بزرگوں کا ذکر نہایت خلوص کے ساتھ اپنی نظموں میں کر کے ان کے کمالات واحسانات کا اعتراف کیا ہے۔

ابتدا سے پندرہ سولہ برس تک آپ نے جو طبع آزمائی فرمائی۔ اس دور کا سارا کلام ادوار مختلفہ میں تقسیم ہو کر "بانگ درا" کے نام سے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکا ہے۔ بانگ درا کی شاعری پر سر شیخ عبد القادر مدظلہ کا مقدمہ جو اقبال کے یار غار اور ہم نوالہ وہم پیالہ دوست ہیں اقبال کی شاعرانہ تدریجی ترقیوں کے سمجھنے کے لئے "کلید سخن" کا حکم رکھتا ہے۔ اکثر با مذاق اصحاب اقبال کی "بانگ درا" کو "کتاب ارادت"

کی طرح عزیز رکھتے اور وظیفہ اس کا ورد کرتے ہیں۔ میں ایسے نوجوانوں سے بھی واقف ہوں۔ جن کو اقبال کی بہت سی نظمیں حفظ ہیں۔ جنہیں وہ خود اکثر پڑھتے۔ احباب کو سناتے۔ آپ سر دھنتے اور سننے والوں پر وجد و رقص اور رقت طاری کردیتے ہیں۔

## اقبال کا فارسی کلام

اس کے بعد اقبال نے فارسی شاعری کی طرف توجہ کی۔ اور پیا پے "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" نامی دو مثنویاں رومی کے تتبع میں تصنیف فرمائیں۔ "اسرار خودی" عجمی تصوف پر ضرب کاری ثابت ہوئی۔ اس کے پہلے ایڈیشن میں حافظ وغیرہ پر جرح تھی۔ خرقہ نشینوں کو جذب آگیا۔ اقبال کی شدت سے مخالفت ہوئی۔ اقبال ان مخالفانہ ہنگاموں سے صرف اتنا متاثر ہوا کہ اس نے حافظ وغیرہ پر تنقید کی جزوی اصلاح کردی۔ ورنہ عجمی فلسفہ تصوف پر حملات کو جوں کا توں بحال رکھا۔ ان مثنویوں کے بعد۔ فارسی زبان ہی میں اقبال کے کلام کے متعدد مجموعے "پیام مشرق" "زبور عجم" اور "جاوید نامہ" کے نام سے مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہیں۔ شایع ہو چکے ہیں۔ ان کتابوں میں سے "زبور عجم" وہ کتاب ہے جس کی نسبت اقبال خود بال جبریل میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

اک اضطراب مسلسل غیاب ہو کہ حضور میں خود کہوں تو میری داستاں دراز نہیں
اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

"زبور عجم" کے بعد "جاوید نامہ" کا نمبر ہے۔ جو اقبال کی فارسی شاعری کا معراج اور ان کے فلسفہ خودی یا فلسفہ زندگی کی روح اور عالم معانی میں ہفت افلاک اور مادری آن کا مرقع ہے۔ اس کے بعد چھوٹے سائز کے ستر صفحات کا ایک منظوم فارسی رسالہ "مسافر" نام کا ہے۔ اس میں اقبال نے اپنے افغانستان کے سفر ہفت روزہ کے تاثرات پیش کئے ہیں۔ اسی رسالہ مسافر میں علامہ اقبال نے اپنا اور حکیم سنائی غزنوی کا اتحاد اور فرق ایک شعر میں یوں بتا دیا ہے ؎

ہر دو را از حکمت قرآں سبق اوز حق گوید من از مردان حق

ان سب کتابوں کی تدریجی اشاعت کے بعد "بال جبریل" کا نمبر بلحاظ اشاعت کے آتا ہے۔ یہ کتاب چند ماہ کی مسلسل کاوش فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ اندرونی شہادت یہ ہے کہ کم و بیش چار یا پانچ سال میں تیار ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف اقبال کے گول میزی سفر کے پہلے سے شروع ہو کر۔ کابل کے سفر پر بلکہ ۱۹۳۴ء کے آخر میں ختم ہوئی ہے۔

"بال جبریل" کے متعلق اگر مختصراً اظہار خیال کیا جائے۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب "فلسفہ اقبال" کا جامع ترین خلاصہ ہے۔ اگر اس سے ترقی کیجائے تو یوں کہینگے کہ "شراب اقبال" دو آتشہ نہیں۔ سہ آتشہ ہوگئی ہے۔ اگر اس پر بھی قناعت نہ کی جائے۔ تو پھر یوں کہینگے کہ خود اقبال اپنے خیالات پر متمکن ہوکر۔ رمز و کنایہ اور اغلاق سے نکلکر۔ ایسی زبان میں اپنے مکنونات قلبی پیش کر رہا ہے کہ اب بھی اگر اسے نہ سمجھا جائے۔ تو اس میں اقبال کا گناہ نہیں۔ بلکہ خود اس شخص کا ہے جو اس "شیشہ معانی" کی "مہر" کھولنے کی جرات نہیں کرتا۔

بال جبریل اپنے موضوع کے لحاظ سے۔ جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں۔ پیغام زندگی یا آب حیات کا سرچشمہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال اپنے ہر لفظ۔ ہر استعارہ۔ ہر تشبیہ۔ ہر اشارہ اور کنایہ۔ ہر تلمیح اور آیت و حدیث کے ہر استدلال یا دوسروں کے اقوال و معقولات کے نقل واخذ و استدراک میں سے ایک ہی راگ گاتا اور الاپتا ہے۔ جسے زندگی اور متعلقات زندگی کا راگ کہنا چاہیئے۔ کہیں وہ "زندگی" کو "خدا" کہتا ہے کہیں "خدا سے" کہتا ہے۔ کہیں اسے توحید بتاتا ہے کہیں "توحید میں" ثابت کرتا ہے۔ اور زندگی کو خودی کہنا تو اس کا تکیہ کلام ہے۔ کہیں زندگی کو حیات و اسوہ رسول میں دیکھتا اور کہیں اصحاب رسول میں۔ اس کا فرشتوں سے مکالمہ ہو یا شیطان سے مجادلہ۔ وہ حور و غلمان سے گفتگو کر رہا ہو۔ یا رواق نیلی اور قصور بہشتی کی سیر میں مشغول ہو۔ وہ پریوں کے جھمگٹ میں ہو یا دیووں کے نرغے میں۔ وہ امیروں کے دربار کا نقشہ کھینچ رہا ہو یا فقیروں کے حلقۂ ذکر کا۔ وہ مجاہدوں کی تلوار کی جھنکار سنا رہا ہو یا ذاکروں کے ہو حق کی پکار۔ وہ مجلس عیش میں بیٹھا ہو یا تلواروں کی چھاؤں کے نیچے چل رہا ہو۔ وہ شاعروں کے اشعار اور افکار فلاسفہ کی فلک سیری پر حیران ہو یا عشاق کی دل گرمیوں پر مصروف نالہ و فغاں۔ وہ واعظوں اور درویشوں کی بے عملی حب جاہ سے نالاں ہو یا جو نما گندم فروشوں سے دست و گریباں۔ غرض اس کے پاس یہی ایک راگ ہے اور یہی اس کا محبوب ہے۔ وہ اسی کو ساری راگنیوں اور ساری استادانہ صناعیوں اور رعنائیوں اور مہارتوں اور گلے بازیوں کے ساتھ الاپتا ہے اور اسی ایک نکتہ کی توضیح و تشریح کے لئے نئے نئے اسالیب بیان تلاش کرتا ہے۔ بس "زندگی" اور "عشق" اقبال کے ہاں ہم آہنگ اور مترادف الفاظ ہیں۔

# بال جبریئل کے مضامین

یوں اگر "بال جبریئل" کے مضامین کو بڑے بڑے عنوانوں پر تقسیم کیا جائے۔ تو سارا کلام ذیل کے عنوانوں سے باہر نہیں جائیگا۔

۱۔ اقبال خدا سے شکوہ و شکایت کرتا ہے۔ اسے مدد و مناجات یا عرض نیاز بھی کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ اقبال۔ نبی کریم محمد مصطفٰے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جامع جمیع کمالات انسانی ہستی کے دربار میں نہایت مودبانہ حاضر ہوتا ہے۔

۳۔ اقبال اصحاب رسول کریم کی خصوصیات کا ذکر کرتا اور خصوصیت و مناقب کو مسلمانوں کی جماعت و افراد میں دیکھنا چاہتا ہے۔

۴۔ اقبال تنگ نظر علما اور جاہ طلب صوفیوں کو بڑی بیباکی مگر حکیمانہ دلائل سے بے نقاب کرتا ہے۔

۵۔ اقبال مغربی نظام حکومت پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ مگر مغربی پالیسی کے ساتھ۔ یعنی مخمل میں لپٹی فولادی شمشیر کو بظاہر کم آزار پیرایہ میں پیش کرتا ہے۔

۶۔ اقبال نے "زندگی" کو جتنے ناموں اور القاب سے یاد کیا ہے۔ وہ ہم پہلے بتا آئے ہیں۔ انہی ناموں" میں عشق" بھی ہے۔ اور خودی بھی اور وہ زندگی کو زیادہ تر انہی دو ناموں سے یاد کرتا ہے۔

۷۔ اقبال۔ عمل اور صرف عمل کا قائل ہے۔

۸۔ اقبال۔ روحانیت یا صفائے باطن کے ساتھ ظاہری طاقت کا بھی قائل ہے۔

۹۔ اقبال بے عملی کی دریوزہ گری۔ یا "توکل" کے بہانے سے گوشہ نشینی اور تعطل کا قائل نہیں۔

۱۰۔ اقبال مسلمانوں کو ان کے ماضی کی یاد دلا کر موجودہ پستی کا طعنہ دیکر۔ ٹھنڈا نہیں کر دیتا۔ بلکہ ان کو اپنے یقین کی روشنی میں روشن مستقبل کا وعدہ دیتا ہے۔

۱۱۔ اقبال کا مذہبی تخیل اکثر لفظ پرست کوتاہ نظر جامدوں سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔

۱۲۔ اقبال قومیت و وطنیت کے موجودہ مغربی تصور کا مخالف اور وطن کی اسلامی یا قرانی تعریف کا قائل و داعی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور ایسی ہی بے شمار باتیں پڑھنے والوں کو بال جبریئل کے صفحات پر جا بجا منتشر نظر آئیں گی۔

مناسب تو یہی تھا کہ کم از کم ان تمام عنوانوں کو مثالوں سے آراستہ کیا جاتا۔ لیکن فرصت کسے کہ یہ دیدہ ریزی کرے۔ تاہم چند باتیں مثالاً ذیل میں عرض کرنے کی جرات کی جاتی ہے۔

## اقبال خدا کے حضور میں

اقبال خدا کے حضور میں ایک لاڈلے بچے کی طرح حاضر ہو کر گفتگو کرتا ہے۔ وہ کسی درباری تنخواہ دار کی عرض و معروض سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے اور یہ اس کے کلام کی ایسی خصوصیت ہے۔ جو اسکی شاعری کی ابتدا سے" بال جبریئل" تک نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی گئی ہے۔ مثلاً ؎

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ     اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سو

کہنا یہ تھا کہ" مرد مومن" کو سارے عالم میں نہیں سمانا چاہئے بلکہ اس کے لئے ایک نہیں بہت سے عوالم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اے خدا وہ" تیرا بندہ ہے۔ مگر سہے یہ کہ آپ حد و مکان سے ماورا ہیں۔ اور" آپ کا بندہ" محض" چار سو" یعنی عالم کون و فساد ہی میں گھر کر رہ گیا ہے۔ اوپر کے شعر میں شکوہ لاڈلوں کا شکوہ ہے ورنہ اقبال کا اقرار یہ ہے ؎

میرا نشیمن نہیں درگہ میر و وزیر     میرا نشیمن بھی تو شاخ نشیمن بھی تو

شعر اول میں لفظ" جنوں" کا استعمال غور طلب ہے۔ جس سے اقبال کی وسعت نظر۔ قدرت بیان مگر محتاط طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ " روس" کے موجودہ طرز حکومت کے بانی" لینن" کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ خدا کا منکر تھا۔ لیکن عقیدۂ عام کے برخلاف۔ اقبال اسی لینن کو خدا کے حضور میں یوں عرض گزار پاتا ہے ؎

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا     جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود     وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی     مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں     ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟     دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

فرشتے جن کے شب و روز۔ دربار کبریائی میں تسبیح و تقدیس الٰہی کرتے گزرتے ہیں۔ ان کے بھی یہی عبیدانہ نغمات کہیں اقبال نے بھی سن لئے۔ ان میں سے ایک نغمہ اقبال نے ہمیں ہماری زبان میں سنایا ہے۔ اس نظم کا ایک شعر جو دراصل فرشتوں کی خدا کے حضور میں" پہونچ" ہے۔ حسب ذیل ہے ؎

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر     تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی

مرزا غالب مرحوم کو اتنا معلوم تھا کہ خدا کی سلطنت کی خفیہ پولیس کی وہ شاخ جس کے ذمہ انسانی اقوال و اعمال کی نگرانی ہے اسے کراماً کاتبین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ غالب کو ان فرشتوں کی یک طرفہ رپورٹوں پر شاید معقول اعتراض تھا۔ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

مگر خدا بھلا کرے اقبال کا جس نے جہاں فرشتوں کی رپورٹوں کی اہمیت و واقعیت ظاہر کر دی وہاں غالب کا اعتراض دور کر کے ظاہر کر دیا کہ گو فرشتے جنس غیر سے ہیں مگر آدم زادوں کے دیو زادوں اور ذریت شیطان کی طرح دشمن نہیں۔ بلکہ بہت درد مند ہیں اگر انسانی دعاؤں کے مدارج میں ترقی ممکن ہے تو ہم دست بدعا ہیں کہ خدایا مجبور انسانوں سے اس ہمدردی کے بدلے میں فرشتوں کو اپنے قرب خاص ہی نہیں قرب اخص سے ممتاز فرما۔

ایک مرد مفلس کی زبان سے اقبال کا خدا سے یہ سوال اسی طرز خطاب کا بہترین نمونہ ہے جو اقبال سے خاص ہے ملاحظہ ہو۔

اک مفلس خود دار یہ کہتا تھا خدا سے
میں کر نہیں سکتا گلہ درد فقیری
لیکن یہ بتا تیری اجازت سے فرشتے
کرتے ہیں عطا مرد فرومایہ کو میری؟

اگر نقل کرتا چلا جاؤں تو اس مجموعہ کلام میں بعض ایسے گرم اشعار بھی ہیں۔ جن کی گرمی بیان قیامت برپا کر سکتی ہے۔ مگر عنوان بالا کی بحث کو دو ایسے اشعار کے نقل کرنے پر ختم کرتا ہوں جن میں ناز نہیں نیازمندی و افتادگی ہے۔ اقبال دعا کرتا ہے ؎

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

# اقبال دربار مصطفوی میں

اقبال کی خداوند کریم سے عرض نیاز آپ پڑھ چکے۔ اب آپ اسی بے ہوش بندے کو دربار نبوی میں دیکھئے۔ کس کس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا اور سوچ سوچ کر زبان سے الفاظ نکالتا ہے۔ اگر وفور عشق و مستی کے عالم میں بھی اسے شرف حضوری حاصل ہوا ہو تو وہ یوں عرض کیا کرتا ہے۔ ؎

کافر ہندی ہوں میں۔ دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

یا

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

آنحضرت صلعم فداہ روحی کے معراج مبارک سے نیا مضمون پیدا کر کے کہتا ہے کہ۔ ؎

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

حدیث لولاک مشہور ہے۔ اس کی بنا پر اقبال کہتا ہے کہ ؎

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

یہی مضمون بال جبرئیل کے ایک دوسرے شعر میں یوں ادا ہوا ہے کہ ؎

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

وہی اقبال جو غلامان محمدیہ محمدیوں کو لولاک کا مصداق دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے آپ خدا سے گفتگو کرتے سن چکے اب آپ نے رسول کے متعلق اس کی گفتگو سن لی۔ دونوں کا فرق آپ کے سامنے ہے۔ لیکن اب اسی اقبال کو حضور مصطفےٰ میں عرض و معروض کرتے ملاحظہ کیجئے۔ ؎

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

اس شعر سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب تک مسلم "دانش افرنگی" کا دیوانہ اور زناری ایمان رکھتا ہے۔ وہ ان نکات و لطائف کا جو لولاک سے پیدا ہوتے ہیں۔ مورد و مصداق نہیں ہو سکتا۔

# اقبال اور اصحاب نبوی رضوان اللہ علیہم اجمعین

اقبال اصحاب نبویؐ کے کمالات کا اظہار ان کے صفات و خصائص کی تفصیل سے کرتا ہے۔ اور ہر نامور صحابی کے کمال و امتیاز خاص کو نمایاں کر کے۔ ملت کو ان کے اقتدار کی دعوت دیتا ہے مثلاً

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری
مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی
حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسمٰعیل
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

اشعار بالا میں سے پہلے شعر میں فاروق اعظم اور حیدر کرار کے قلوب بیدار کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا ہے کہ شاہی تاج اور امیری کی سند لینے کے بعد عموماً دل مر جایا کرتا ہے۔ اگر مرتا نہیں تو سو ضرور جایا کرتا ہے۔ لیکن فاروق و حیدر کی طرح شاہی اور امیری پا کر بھی اگر دل بیدار ہے تو انسانی خامیوں کے مس کے لئے۔ یہی دل کی بیداری کیمیا کا کام کرتی ہے۔ دیکھو دارا و سکندر کے پاس صرف دارائی اور سکندری (بادشاہی) ہی تھی مگر اصحاب محمد کے پاس دارائی اور سکندری کے علاوہ۔ ایسی فقیری بھی تھی۔ جس نے فاروقی عدالت و سطوت اور اسد اللٰہی قوت کا دو بالا شمول

سے بھی منوا لیا تھا۔

تیسرے اور چوتھے شعر میں شہادت کا رز آشکارا کیا ہے ایک جگہ کہا کہ یہ دور شہادت اسمٰعیلؑ سے شروع ہو کر حسینؑ پر ختم ہو گیا۔ مگر پھر ترقی کرکے بتایا کہ دور شہادت کی ابتدا اور انتہا کو ازلیت و ابدیت کی وسعت حاصل ہے یعنی مقام شبیری یعنی شہادت ایک حقیقت ابدی ہے۔ مطلب یہ کہ شہید ہمیشہ موجود ہیں۔ اور حق کے لئے شہادت ہوتی ہی رہتی ہے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ کوفیوں اور شامیوں کے انداز بدل بدل کر نئے نئے طریقوں سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ مقام شہادت شبیری سے مراد اہل حق ہیں اور انداز رومی و شامی سے مراد وہ طاغوتی قوتیں ہیں جو ہمیشہ حق سے ٹکرایا کرتی ہیں۔

## جاہ طلب صوفی اور شائق جدال ملا اور اقبال

اس موضوع پر اقبال نے بال جبریل میں جا بجا نہایت اچھوتے اور دلکش ترین طریقوں سے گفتگو کی ہے جس میں تجربہ کی بجلیاں تڑپ رہی ہیں مثلاً۔ ؎

خداوندا یہ تیری سادہ دل بندے کدھر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

اس شعر میں سلطانی اور فقیری دونوں کو عیاری اور مکاری بتایا ہے۔ مگر آپ دیکھیں گے کہ یہی کتاب فقیری یا درویشی کی مدحت طرازیوں سے نغمہ زار بنی ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اقبال کے ہاں مقبوح اور ممدوح فقیری دو جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس لئے لفظوں سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ اقبال کے نزدیک ایک فقیری تو وہ ہے جسکی طرف اوپر مسدلّلہ کے لفظ میں اشارہ کر چکا ہے اور دوسری یہ ہے کہ ؎

اب حجرۂ صوفی میں کچھ فقر نہیں باقی خون دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

یا ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ ؎

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

اقبال کا ممدوح فقر وہی ہے جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "الفقر فخری" لیکن یہ آجکل کا ہمارا قومی فقر یا ہماری قوم کے فقیر ان سے خدا بچائے۔ اقبال کہتا ہے کہ میں نے ایک بار سیدنا حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہو کر ؎

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھکو آنکھیں مری بینا ہیں ولیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار

باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق طروں نے چڑھایا نشۂ خدمت سرکار

اب سوال ہوتا ہے کہ حضرت مجدد فاروقی نے تو اقبال سے فرمایا تھا کہ پنجاب میں خصوصاً اور ہند میں عموماً کوئی فقیر نہیں۔ تو پھر یہ خانقاہوں اور درگاہوں میں کون بھرے پڑے ہیں۔ اس سوال کا جواب اقبال زرا آزاد ہو کر یوں دیتا ہے کہ ؎

رمز و ایما اس زمانے کیلئے موزوں نہیں اور آتا بھی نہیں مجھکو سخن سازی کا فن
قم باذن اللہ جو کہتے تھے وہ رخصت ہوئے خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

آجکل کے پیروں اور پیرزادوں کی حقیقت اس سے زیادہ اچھی طرح ظاہر نہیں کیجا سکتی تھی جیسی کہ اقبال نے بال جبریل کی نظم "باغی مرید" میں ظاہر کی ہے۔ اقبال باغی مرید کا قول نقل کرتا ہے ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

اب رہے قال اقوال کے عادی ملا صاحب۔ ان کے متعلق اقبال کہتا ہے کہ جس وقت خدا نے اپنی رحمت عام سے ان کو جنت میں داخلہ کی اجازت عطا فرمائی تو میں بھی دربار میں حاضر تھا۔ عادت سے مجبور ہوں۔ خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے عرض کی خداوندا! تقصیر معاف۔ ان حضرت کو جنت میں جانے کی تکلیف نہ دیجئے۔ کیونکہ مناظر جنت ان کی مناظرہ پسند طبیعت کے مناسب چیز نہیں۔ سبب یہ کہ ؎

نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقول بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بدآموزی اقوام و ملل کام اس کا اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

## شاہ و گدا

اقبال کا فلسفۂ شاعری۔ زندگی کا مکمل نظام پیش کرتا ہے۔ لے اصرار ہے کہ اس کا فلسفہ۔ اسلام کے پیغام کہن کی تعبیر جدید کے سوا کچھ نہیں وہ نظامی کا قائل نہیں۔ وہ حکومت چاہتا ہے۔ حکومت بھی ایسی جو آج سے صدیوں پہلے خلفائے حق کے عہد میں قائم تھی۔ اسی لئے وہ امیری کے ساتھ فقیری کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اقبال فلسفۂ مغرب کا شناور ہے۔ اس فلسفہ میں جتنے نقائص ہیں وہ ان سب کی طرف صاف صاف اشارے کرتا ہے۔ اسکی نظر مشرق و مغرب دونو کی چھین جھپٹ اور لوٹ کھسوٹ پر ہے۔ چنانچہ پرانی بحث ہے کہ شاہی کا رتبہ بڑا ہے یا گدائی کا۔ ظاہر پرست دنیا نے ہمیشہ تلوار کی چمک اور سونے چاندی کی دمک دیکھ کر یہی فیصلہ کیا کہ گدائی کو شاہی سے کوئی نسبت نہیں۔ کہاں آفتاب چرخ مدار اور کہاں ذرہ بے مقدار لیکن مشرقی شاعروں میں سے شاید انوری پہلا شاعر ہے جس نے باوجود شاہی درباروں کو قبلہ حاجات سمجھنے کے اتنی جرات کی کہ شاہی اور گدائی

کے نقلی پردے کو درمیان سے اٹھا کر دور کر دیا ایک ہی بیڑ کہدیا۔ جب اقبال کا دور آیا تو اس نے انوری کی شاعری کو منہ دسانی لباس پہنا کر تاج لینے والے اور بھیک مانگنے والوں میں نام کے سوا اور کوئی فرق نہ دیکھا۔ باوجود جمہوریت کے زبان بندی کے خوف سے یہ پتہ کی بات آج بھی میخانہ میں رند لاابالی ہی کی زبان سے یوں ادا کی گئی ہے ؎

میکدے میں ایک دن اک رند زیرک نے کہا ۔ ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے ۔ کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقاں سے کشید ۔ تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانہ کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی ۔ دینے والا کون ہے مرد غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

بہر اقتدار قوم یا انجمن یا وقت حکومت کے متعلق۔ اقبال کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وہ رمز و کنایہ میں کہتا ہے کسی کمزوری کے باعث نہیں۔ بلکہ محض اسلئے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ... بات ... نہیں سنی جاتی۔ اور جب کوئی بات چڑانے کے لئے نہیں۔ اصلاح کے لئے کہی جائے۔ اور مخاطب متکلم کی صفائی اور طرز بیان سے چڑ جائے۔ تو اصلاح کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔ یہی مصالح ہیں جن کو مد نظر رکھکر اقبال کہتا ہے کہ ؎

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں ۔ میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے ۔ لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کا راز

## زندگی کے تغیرات

اقبال کے نزدیک زندگی تغیر مسلسل کا نام ہے۔ اس کے نزدیک اگر زندگی میں تغیر نہیں۔ بلکہ یکسانیت ہی رہتی ہے۔ تو وہ اسے زندگی کے نام سے نہیں موت کے نام سے موسوم کرتا ہے ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی ۔ روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

## لیڈر کے صفات

عموماً لوگوں نے لیڈری یہ سمجھ رکھی ہے کہ جو شخص مجامع عام میں لیکچر دے۔ کسی سیاسی یا مذہبی ادارہ کا صدر یا سکریٹری یا ممبر ہو۔ گاہ بے گاہ قوم قوم پکارتا رہے۔ اور سرکار یا ہمسایہ اقوام کو اناپ شناپ سناتا رہے۔ قوم کے غم میں پلاؤ کھائے۔ دوسروں کی مذمت کرے اور اپنے گن گائے۔ ذات والا کے لئے ہر جگہ صدر نشینی کی تاک میں لگا رہے بس وہی لیڈر ہے۔ لیکن برخلاف اس کے اقبال لیڈر کے صفات کچھ اور ہی بتلاتے ہیں ؎

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز ۔ یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

قوم میں بے دلی پھیلی ہوئی ہے۔ جتنے افراد ہیں اتنے ہی مقاصد ہیں۔ جتنے نمازی ہیں ان سے دو چند قبلے اور کعبے ہیں۔ مقاصد بھی عظیم الشان نہیں۔ نہایت ادنیٰ اور چھوٹے چھوٹے۔ بحیثیت قوم کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ وہ جن کو خدائی بلکہ خدا سے دوسری خدائی کا مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔ ادنیٰ ملازمتوں اور ممبریوں۔ اور حکام دنیا کی ہر ذلیل چیز پر سجدہ کے لئے جھک گئے ہیں۔ قیامت سے پہلے اسی دنیا میں نفسی نفسی پڑی ہے۔ مجالس کی کثرت اور کثرت سے ہنگامے ہیں۔ مگر یکجہتی نہیں۔ ہونٹ زہر خند سے آلودہ ہیں۔ شیرینی گفتار و تبسم کا نام نہیں۔ پھر کارواں تیار ہو تو کیسے؟ اور منزل کی فکر ہو تو کیسے؟ کہنے کو سب چل رہے ہیں مگر رخ ایک طرف نہیں۔ شش جہت کیا۔ شش ہزار جہت دوڑ رہے ہیں۔ "حرم" سے بدگمانی کی وجہ یہ ہے کہ "مرشد" اور "لیڈر" دونوں "خوئے دلنوازی" سے بے نصیب اور عاری ہیں۔ ایک زبان پر "خدا" ہے مگر دل میں "بت" چھپا بیٹھا ہے۔ دوسرے کی زبان پہ قوم ہے مگر قوم سے مراد صرف ذات والا صفات حضرت اعلیٰ ہے۔ اپنے نفس کا محاسبہ کرنے والا کوئی نہیں۔ کمزور ساتھیوں کی ہمت بڑھانے والوں کا پتہ نہیں ہاں ڈانٹ ڈپٹ کرنے والوں کے ہاتھ میں عنان قیادت ہے۔ ساتھیوں کو "عمل صالح" کا مطالبہ ہے۔ اپنے "عمل صالح" روحانی ائمہ بھی اندھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت آوارگی و شک و رسوم و ظن کے جنگل میں پڑی بھٹک پھر رہی ہے اسی کا نقشہ ذیل میں کھینچا گیا ہے ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے ۔ کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

اقبال مرد مومن یا قوم کے لیڈر کے صفات کی ذیل میں بیان کرتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ۔ غالب و کار آفریں کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ۔ ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل ۔ اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو ۔ رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین ۔ اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

## اقبال کی نظر میں ایمان و یقین

اقبال کو اصرار ہے کہ محض دلیل و برہان سائنس و فلسفہ کی ارزانیوں اور فراوانیوں سے قوم زندہ نہیں ہو سکتی۔ اگر انہی خشک علوم کو اصل ٹھہرالیا

جائے تو سینوں کی بے نوری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسلئے اقبال کی قوم کو دعوت یہ ہے کہ ؎

یہ پیران کلیسا و حرم اے وائے مجبوری! صلہ انکی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری
یقین پیدا کر اے ناداں یقین سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کے جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

## اہل اللہ اور جمادات کی تکبیر کا فرق

یہ مسلم کہ مخلوقات کا ذرہ ذرہ اپنے اپنے رنگ میں تکبیر، تسبیح و تہلیل الٰہی کر رہا ہے۔ لیکن مسجود افلاک انسان اور ذرۂ بیابان کی تسبیح میں جو فرق ہے اسے اقبال نے ذیل کے اشعار میں ظاہر کیا ہے ؎

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اس میں نکتہ یہ ہے کہ "تکبیر کہنے والے" چھوٹے "کس مپرس" اور ذلیل نہیں رہ سکتے۔ اگر نظر آتے ہیں تو ان کی "تکبیر" میں نقص ہے ان کے ایمان و یقین اور فعل و عمل کا قصور ہے۔

## تقدیر

اگرچہ اقبال نے "بانگ درا" میں یہ کہا تھا کہ ؎

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مگر بال جبریل میں ایسی تقدیر، کا بھی اعتراف کیا ہے جو نہیں بدلتی ؎

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ نہ تھے ترکان عثمانی سے کم ترکان تیموری

مغربی طبیبوں کا ٹھہرایا ہوا عثمانی بیمار، جب اپنے "معالجوں" کی رائے میں مر گیا۔ تو اپنے اطبا کے علی الرغم میں انگورا میں زندہ ہو کر یورپ والوں کو آنکھیں دکھانے لگا۔ لیکن تیموری ترک جب دلی میں تھا تو لال قلعہ میں بندا اور بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا۔ اسی جان کنی کی حالت میں اسے جب رنگون لیجایا گیا تو اسی غربت میں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر گیا۔ جہاں اس کے مزار پر دیا جلانے والا اور فاتحہ پڑھنے والا بھولے بھٹکے ہی کوئی نہیں پہونچتا۔ اگر عثمانی ترک مر کر زندہ ہو سکتا ہے تو تیموری ترک کیوں زندہ نہوا۔ اقبال تقدیر کی اسی منطق میں الجھ گئے۔ لیکن بے ادبی معاف! واقعہ یہ ہے کہ عثمانی ترک نے مرنے سے انکار کر دیا۔ اسلئے زندہ ہو گیا۔ اور تیموری ترک نے زندگی کو گھر سے خود دھکے دیکر باہر نکال دیا تھا۔ کیا اقبال۔ غلام قادر روہیلے کی داستان نظم کرتے ہوئے خود ہی یہ اعلان نہیں کر چلے؟ ؎

حمیت نام ہے جسکا گئی تیمور کے گھر سے

## اقبال کی شاعری

عموماً لوگ شعر صرف ہنسنے۔ ہنسنے ہنسانے اور دل بہلانے کے لئے کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شاعر "داد" کے لئے مرتے ہیں۔ مگر اقبال کی شاعری عام شاعروں سے الگ ہے۔ اس کی شاعری سے سامع پر ناچنے اور رقص کرنے کی امنگ نہیں۔ مرنے اور میدان جہاد میں نیم بسمل ہو جانے کی آرزو ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے ٹیگور یا دوسرے مشرقی شعرا میں جو بات عام ہے اس کا نام و نشان بھی اقبال کے ہاں نہیں پایا جاتا۔ فرماتے ہیں ؎

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی کہ بانگ صور سرافیل دل نواز نہیں

اقبال شاعری میں فلسفہ کے نام سے الفاظ کا کھیل یا جھوٹا فلسفہ پیش کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا مقصد شاعری یا فلسفیانہ شاعری سے دربردہ اظہار تمنا ہے ؎

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا! حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

پس اقبال کے نزدیک سچا فلسفہ۔ یا سچا شعر دربردہ حرف تمنا کا لب پر لانا ہے۔ اسلئے جب تک دل میں تمنا اور خالص آرزو نہیں۔ نہ شاعری ہو سکتی ہے نہ فلسفہ بن سکتا ہے۔ لیکن اقبال کے ہاں یہی جنس عام ہے۔ دوسروں کے ہاں وہ جنس ملتی ہے جس کو وہ خود حق نہیں سمجھتے۔ اسی لئے ان کی شاعری رنگین تو ہو۔ مگر جاندار نہیں اور جس چیز میں روح نہ ہو اس کی محبوبیت معلوم۔

## مولانائے روم

عارف روم کو ہمارے علما نے ابتدا سے ابتک مختلف نگاہوں سے دیکھا اور متضاد ناموں سے یاد کیا ہے۔ ایسے بھی ہیں جنہوں نے آپ پر نعوذ باللہ کفر کا فتویٰ لگایا ہے اور ایسے بھی جنہوں نے آپ کو ظل محمدؐ اور آپ کے کلام کو "مغز قرآن"، یا قرآن بہلوی، ٹھہرایا ہے۔ لیکن ہمیں موقع کے لحاظ سے رومی کے موافقوں میں سب سے نہیں صرف تین خیالات سے بحث ہے۔ ایک خیال عام ہے جس کے ماننے والوں کی تعداد لاتعداد ہے۔ وہ یہ کہ رومی صوفی ہے۔ دوسرا خیال جہانتک میری محدود معلومات ہیں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کا ہے۔ آپ نے رومی کے "تصوف" سے زیادہ رومی کے "کلام" کو اہمیت دی ہے اور رومی کو صوفی سے زیادہ متکلم کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تیسری آواز اقبال کی ہے۔ چنانچہ اقبال رومی کو صوفی و متکلم سے بڑھکر کچھ اور ہی سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک رومی فلسفی ہے۔ رومی میں شان پیمبری ہے۔ رومی کے کلام میں مغرب کے الحاد اور مشرق کی بے عملی و تعطل کا علاج ہے

اقبال کا خیال ہے کہ رومی، بیٹس اور ٹیگور ... جو یورپ پر چھائیں اور دلوں پر مسلمانی شان سے حکمرانی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین اور متاخرین اہل حال وقال میں سے رومی ہی ایک ایسے بزرگوار ہیں جن کا نام بار بار اقبال کی زبان پر آتا ہے۔ چنانچہ بال جبریل کلیۃً پیر رومی کے الہامات سے بھری ہوئی ہے۔ شاید پیر رومی سے بڑھی ہوئی محبت و عقیدت ہی کا نتیجہ ہے کہ بال جبریل میں اقبال نے خود کو "خضر" اور "قلندر" کے نام سے بار بار یاد کیا ہے۔

## اقبال اور پیارے صاحب رشید

اس (بال جبریل) میں کہ اپنی کسی بھی کتاب میں اقبال نے اپنے کو شاعر زبان دان کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ لیکن اس زبان کے تصور میں مجھے وہ دلچسپ واقعہ یاد آگیا جو مجھ سے جناب سالک بٹالوی (رشتہ گر در شتہ شاگرد داغ) مدیر انقلاب لاہور نے بیان کیا تھا۔ جو یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کی ابتدا تھی گو وہ اردو کے خوش گو اور صاحب طرز شاعر کی حیثیت سے شہرت پا چکے تھے۔ انہی دنوں میں آپ کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں آپ کو حضرت پیارے صاحب رشید مرحوم سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ جس شخص نے حضرت رشید سے آپ کی ملاقات کرائی تھی اس نے اقبال کے اور علمی فضائل کے ساتھ بحیثیت شاعر بھی آپ کا تعارف کرایا تھا۔ گفتگو کے آخر میں پیارے صاحب رشید نے خواہش ظاہر فرمائی کہ اقبال اپنا کلام سنائیں۔ چنانچہ آپ نے اپنا اردو کلام سنانا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقبال نے فارسی میں کہنا شروع نہیں کیا تھا بہرحال اقبال پڑھنے لگے رشید مرحوم سننے لگے۔ کسی شعر پر رشید صاحب خاموش رہتے۔ کسی پر ہلکی سی آواز سے خوب کہتے کسی پر مکرر لفظ خوب کہتے۔ کسی شعر پر لفظ خوب کو خوب کھینچ کر خوب کہتے۔ جب اقبال اپنا کلام سنا چکے تو حضرت رشید نے کمال سادگی سے فرمایا "کیا آپ اردو میں بھی کچھ فرماتے ہیں؟" حضرت سالک کے یہ الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں کہ (غالبًا) اقبال "سخن فہمی عالم بالا..." کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اگر ایسا ہو تو کسی ایسے بزرگ کا جو سلاست زبان ہی کو شاعری سمجھتا اور روزمرہ پر جان دیتا ہو اقبال کی زبان اردو کو غیر اردو کہنا یا سمجھنا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ مگر اقبال کے پڑھنے والے اسے زبان و روزمرہ سیکھنے کے لئے نہیں پڑھتے۔ اسلئے اقبال سے یہ چیز طلب کرنا جس کا وہ مدعی ہی نہیں۔ غیر مناسب ہے۔ ہاں اقبال کے خود اپنے زبان دانی سے انکار اور پنجابی نژاد اور فارسی شاعر ہونے کے باوجود بال جبریل محض زبان کے نقطۂ نظر سے بھی مجموعہ نوادر اور توجہ کی مستحق چیز ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار — اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح — اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے — ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

یہاں تک تو سادگی زبان اور سلاست بیان اور جوش بیان کی روداد تھی۔ اب اسی زبان اور بیان میں فلسفۂ اقبال کی تفسیر بھی سن لیجئے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق — تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج — من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

ان چیزوں کے باوجود اگر اقبال کی زبان اردو نہیں۔ تو میں کہوں گا کہ اردو زبان کا خدا حافظ۔ لیکن ہم کو ایسے اہل زبان سے واسطہ نہیں۔ جو صوبوں کی قید میں ابتک مقید ہیں۔ بحمد اللہ صرف پنجابی اور بہاری ہی نہیں لکھنؤ میں بھی اکثر باخبر اہل قلم زبان اقبال کی تائید اور بیان صرف کر رہے ہیں۔

## آج کے حالات سے مایوسی

اقبال عصر حاضر کی ظاہرداریوں کے متعلق کہتا ہے ؎

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام — مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں — چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

## فلسفۂ اقبال کا خلاصہ

گزشتہ صفحات میں اقبال کے خیالات مختلف مسائل پر کسی قدر تفصیل سے پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن اب ساری بحث کو مختصر کرنے کیلئے اس کا بھی خلاصہ ضروری ہے۔ البتہ خلاصہ وہی زیادہ مستند ہو سکتا ہے جو خود اقبال نے ہی ترتیب دیا ہے۔ ملاحظہ ہو اقبال نے اپنے مقاصد کا خلاصہ ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے ؎

ضمیر لالہ مے لعل سے ہوا لبریز — اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز
بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی — کیا ہے اس نے فقیروں کو وارث پرویز
پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ — جہاں وہ چاہئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

(از جناب اختر انصاری - بی۔اے۔ آنرز - بی ٹی)

جب پیٹ کے لئے ایندھن کی کمی ہو تو چولہے کیلئے ایندھن کہاں سے آئے! اس کا دستور تھا کہ تقریباً روزانہ شہر سے نکل کر باہر جنگل میں چلی جاتی اور درختوں کے سوکھے پتے اور سوکھی ٹہنیاں جمع کر کے لے آتی۔ یہ اس کے چولہے کا ایندھن تھا۔ اسی کی مدد سے وہ روٹی پکاتی اور اسی کے سہارے جاڑوں کی سرد راتیں گزارتی۔

اور آج کا دن اس کے لئے بڑی خوشی کا دن تھا۔ نکلتے جاڑے تھے، خزاں نے ہرے بھرے درختوں کو اجاڑنا شروع کر دیا تھا، جنگلوں میں خاک اڑانی شروع کر دی تھی۔ دن بھر تیز اور تند ہوائیں چلی تھیں، جن کے تھپیڑوں نے درختوں کا لباس تار تار کر دیا تھا۔ چنانچہ سورج چھپنے سے ذرا پہلے جب وہ جنگل میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ زمین پر سوکھے پتوں کا فرش بچھا ہوا ہے اور ٹوٹی ہوئی خشک ٹہنیوں کی بھی کمی نہیں۔ اس نے بڑے شوق اور ولولے کے ساتھ ان پتوں اور ٹہنیوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی باغ کی زمین سے پھول چن رہی ہے یا آسمان سے من برس رہا ہے اور وہ سمیٹ کر اپنی جھولی بھر رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اس نے بہت سے پتے اور ٹہنیاں اکٹھی کر لیں۔ اور آج جب وہ گھر کی طرف چلی تو اس کے سر پر ایندھن کا ایک انبار تھا جس کے بوجھ کے نیچے وہ دبی جاتی تھی۔

جنگل سے نکل کر شہر میں داخل ہوئی۔ شہر کے اس حصے میں جو شہر سے باہر تھا۔ جہاں بڑے بڑے لوگوں کے عالیشان مکانات اور شاندار دوکانیں تھیں۔ جہاں تکلف تھا اور آرائش تھی، روشنیوں کی جگمگاہٹ تھی اور موسیقی کی تانیں تھیں۔ وہ شہر کے اس حصے میں داخل ہی ہوئی تھی کہ یکایک مینہ برسنے لگا۔ برسات کا موسم نہ تھا، مہاوٹوں کے دن نہ تھے، لیکن معلوم نہیں بادل کہاں سے آ گئے اور ساون کی گھنگور گھٹا کی طرح برسنے لگے۔ ہوا جو دن بھر تیزی کے ساتھ چلی تھی اب اور بھی تیز ہو گئی۔ ٹھنڈک اتنی بڑھی کہ فروری کے مہینے میں دسمبر کی یاد تازہ ہو گئی۔ جونہی یہ چھینٹا پڑا لوگ سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر دوڑے۔ کچھ موٹروں میں بیٹھ گئے، کچھ تانگوں اور بگیوں پر سوار ہو گئے، اور کچھ مکانات اور دوکانوں میں گھس گئے۔ لیکن وہ غریب عورت جو جنگل سے سوکھے پتے اور سوکھی ٹہنیاں جمع کر کے لائی تھی کہیں نہ جا سکی۔ اس کے لئے کہیں پناہ نہ تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر اسے کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جہاں پہنچکر وہ اپنے آپ کو اور اپنے خشک پتوں کے ڈھیر کو بارش سے بچا سکتی۔ سب دوکاندار اپنی اپنی دوکانوں کے آگے سائبانوں کے نیچے کھڑے تھے اور پتلونوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے بارش کے منظر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اس بیچاری کو جرأت بھی نہ ہوئی کہ ان کے سائبان میں جا کر پناہ لے۔ بارش بڑے زور سے ہو رہی تھی۔ وہ بھیگی جا رہی تھی۔ اس کے سر کا بوجھ بھیگا جا رہا تھا۔ اور اس مصیبت سے کسی نہ کسی طرح بچنا ضرور تھا۔ دو دوکانوں کے بیچ میں اسے ایک زینہ نظر آیا جلدی سے اس کی طرف بڑھی۔ لیکن ابھی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا تھا کہ برابر کی دوکان سے ایک کتا اس پر بھونک کر جھپٹا اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک آدمی نے ڈانٹ کر کہا "کیا ہے! کہاں جاتی ہے؟" الٹے پاؤں واپس پھری۔ اور آگے بڑھ گئی۔ ذرا فاصلے پر ایک گلی تھی۔ اس میں مڑ گئی۔ وہاں بڑی کوٹھیاں تھیں، انگریزی وضع کی۔ یعنی ایسی کہ پیچھے عمارت ہے اور عمارت کے آگے ایک بہت بڑا احاطہ اور احاطے میں داخل ہونے کے لئے ایک بہت بڑا دروازہ۔ مگر وہ کسی دروازے میں کیونکر داخل ہو سکتی تھی! اور ہو بھی جاتی تو کیا کوئی اس کو کوٹھی کے اندر بھی گھسنے دیتا۔

مایوس ہوکر واپس ہونے لگی۔ لنگڑا کھڑا رہ ... کہ تانگے باہر گیا ہے اور وہی سڑک اور وہی مینہ۔ غرض اُسی گلی میں ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی اور بارش کے تھمنے کا انتظار کرنے لگی

دنیا اس منظر کو بھلا سکتی ہے؟ ایک درخت ہے جس کی پتی پتی سے پانی ٹپک رہا ہے اس کے نیچے ایک عورت کھڑی ہے اُسکے کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ اس کے سر پر جو بوجھ ہے اس سے پانی ٹپک رہا ہے اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے بھی پانی ٹپک رہا ہے۔

**اختر انصاری**

سلسلہ صفحہ ۱۲۱

جو وطن کے غم میں بدن کے کپڑے بھی اتار پھینکیں ان کا یہ مردانہ کام بھی ظرافت سے خالی نہیں۔

بعض اوقات کسی قوم کی قوم کو کوئی ایسا حادثہ پیش آجاتا ہے کہ وہ عقل و ہوش سے بیگانہ ہوکر اصالتاً یا وکالتاً ظریف بن جاتی ہے اور جب سر پھٹول اور لپاڈگی کے لئے اور کوئی بہانہ نظر نہیں آتا تو زبان کا جھگڑا کھڑا کر دیتی ہے۔

---

افسوس کہ مضمون شیطان کی آنت بنا جاتا ہے اور ناصری صاحب کا حکم ہے کہ مختصر ہو تو ہم صرف اتنا کہہ کر اسے ختم کئے دیتے ہیں کہ اردو رسائل کے عارضی یا کرایہ کے ایڈیٹروں میں بھی ظرافت کے جراثیم ضرور پائے جاتے ہیں اور جو اسکی مثال درکار ہو تو جناب ناصری کو دیکھ لیجئے کہ ہم تو ساری عمر "حزنیات" (بالکل نیا لفظ ہے) میں پڑے رہے اور آپ ہیں ظرافت نگار بنے بیٹھے ہیں۔

بات ختم

**ایم اسلم**

# رواج کی بھینٹ

ازدمی اشرف

سلیم پور دو ڈہائی سو گہرونکا ایک اچھا خوش حال گاؤں ہے آبادی عموماً مسلمان مہوائیوں کی ہے۔ پچاس برس پہلے احمد زماں خاں سالم گاؤں کے مالک تھے۔ ان کا مکان قلعہ کہلاتا تہا۔ اصطبل میں دس بارہ گہوڑے۔ ناگوری بیلوں کی کئی جوڑیاں۔ تین چار اونٹ۔ بہتیں بہلیاں خدا کے دئے ہوئے سارے امیری کے ٹھاٹ تھے۔ لیکن اب نہ وہ محل ہے نہ وہ لوازمات ایک چہوٹا سا مکان ہے دو چار گائے بہینسیں تہوڑی سی زمین اور ایک بیلوں کی جوڑی غنیمت ہے کہ آبرو سے گذر ہو رہی ہے۔ ورنہ اپنی صاحبی کے زمانے میں خانصاحب نے بڑی بے جگری سے دولت اڑائی۔ پانچ بیٹوں کی شادیاں کیں۔ اولاد میں صرف یہہ لڑکیاں ہی زندہ رہیں تہیں۔ اور خوب دل کھول کر ارمان نکالے۔ ایک ایک تقریب پر کئی کئی روز تک کھانے کھلائے گئے۔ رنڈیاں نچائی گئیں اور شہر والوں کی حرص میں جہیز دینے میں بھی کسر نہیں کی۔

باوجود ان فضول خرچیوں کے احمد زماں خاں نے یہہ بات ضرور کی کہ لڑکے تعلیم یافتہ انتخاب کئے اور اسوقت ان کے ہاں بھی دولت تہی اسلئے دولت مند گھرانے بہی میسر آ گئے۔ اب ایک لڑکی جو سب سے چہوٹی اور اسی کچے مکان میں پیدا ہوئی ہے باقی ہے۔ بڑی کوشش سے نجیب گڑھ کے ایک متمول زمیندار کے ہاں اس کی نسبت قرار پائی ہے۔ لڑکا گذشتہ مہینے میں لاہور سے وکالت کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ لڑکے والے تقاضے پر تقاضہ کر رہے ہیں کہ جلد سے جلد شادی کی تاریخ ٹہرا دیجائے وداع نہ سہی مگر نکاح تو ہو جانا چاہئے۔ احمد زماں خاں پریشان ہیں۔ نہ زیور کا انتظام ہو سکا ہے نہ دوسرے سامان کیلئے روپیہ کا بندوبست ہے۔ اور مصیبت یہہ ہے کہ اگر سیدہے سبھاؤ وقت کا لحاظ رکہکر شادی کرتے ہیں تو برادری میں ناک کٹتی ہے۔ اور یہہ ایک ایسی ہتک ہے جسکا بدلہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے سمدہیانے والوں کو کون سمجہائے۔ وہ اپنی ناک کا تحفظ کیوں چہوڑ دیں۔ وہ پانچ بیٹیاں خانصاحب کی تہیں۔ کیا یہہ چہٹی کسی غیر کی ہے۔ اسکے لئے بھی ان کے برابر زیور اور جہیز ہونا چاہئے اور جتنا دوسرے دامادوں کو دیا تہا اس داماد کو بھی دینا لازمی ہے۔ خواہ اس ادعائی ناک کو بچاتے بچاتے اصلی ناک ہی کیوں نہ غائب ہو جائے۔

⁂

"اب تو اپنے بس کی کوئی بات نہیں رہی۔ ہر طرف سے" جواب ہے" ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھکر احمد زماں خاں نے کہا۔

"پہر کیا ہوگا"، خانصاحب کی بیوی فاطمہ نے کہا۔

"کیا بتاؤں"، رہی سہی زمین بھی بیچ ڈالی۔ مکان بہی دیدیا۔ مویشی بھی پرائے ہو گئے لیکن نجیب خاں کے مطالبات پورے نہیں ہوئے۔

فاطمہ۔ ارے یہہ کیا کہا۔ اب کس منہ سے اس گاؤں میں رہیں گے اور کس برتے پر جئیں گے۔

خانصاحب۔ جینے کو تو جس طرح خدا جلائیگا جئینگے۔ میں تو یہہ مر رہا ہوں کہ اگلے جمعہ کو برات آجائیگی اور یہاں نہ پورا جہیز طیار ہو سکا ہے نہ دولہا کو دینے کیلئے کچہہ آیا ہے۔

فاطمہ۔ اے تو اتنا روپیہ کیا ہوا۔ گھر میں تو جو کچہہ تم لائے ہو۔ وہ زیورات میں یا کپڑے لتے ہیں اور وہ بھی خدا رکھے دوسری بہنوں کے برابر نہیں۔

خانصاحب۔ چار ہزار روپیہ میں مکان، زمین، بیل، گائے سب چیزیں بکی تہیں بائیس سو کے یہہ چاندی سونے کے زیور بنے ہیں۔ آٹھ سو

کا کپڑا لتّا اور دوسرا سامان بیا ہوا ہے۔ سارا روپے میں برادریوں اور برادری کو کھانا کھلانے کا بندوبست کرنے کی غرض سے تمہارے بھائی کو دیدیا ہے۔ الحمد اللہ خیر صدا ہم نے بہت جہاز چکے

فاطمہ۔ اور دولہا کے واسطے کچھ بھی نہیں کیا۔

خانصاحب۔ کہاں سے ہوتا۔ خیال تھا کہ شادی مال سے کچھ روپیہ قرض ملجائیگا تو یہہ کام بھی ہوجائیگا۔ مگر برے وقت کا کوئی ساتھی نہیں۔ جبتک ہمارے پاس سونے کی ڈلیاں تھیں وہ دم ہلا ہلا کر انہیں چھوڑا کرتا تھا۔ اب کہا دوسرا ہے کہ وہ پھر کہا ہے۔ صاف جواب دیدیا کہ "خانصاحب خالی ہاتھوں۔ روپیہ کہاں سے آئے گا!"

فاطمہ۔ افوہ ری دنیا۔ یہہ وہی شادی ہے جو ہماری بدولت لالہ بنا بیٹھا ہے۔ موئے کو انکار کرنے شرم نہیں آئی۔

خانصاحب۔ جن سے نفع کی امید نہیں رہتی اس سے کسی بات کی شرم۔ پھر ہمارے بھائیوں نے کچھ ایسی بد دیانتیاں اور زیادتیاں کی ہیں کہ بنئے جیسی قوم کو قصائی بنا دیا ہے اور قصائی بھی ایسا کہ اب وہ ہم زمینداروں کو تو بے چھری ذبح کرنے لگے۔

فاطمہ۔ مگر تم نے تو کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ سدا نقصان ہی اٹھایا اور اپنی بات میں فرق نہ آنے دیا۔

خانصاحب۔ یہہ سب سچ ہے لیکن کوئی دے تو کس بھروسہ پر دے۔

فاطمہ۔ لیکن یہہ بیل تو کسی نہ کسی طرح منڈھے چڑھانی ہے۔ میرے ہاتھ گلے میں جو کچھ رہگیا ہے اس کو لیجاؤ اور شادی کا منہ جھلس کر کچھ لاؤ۔ سمدھی اور براتی تو تھو تھو نہ کریں۔

خانصاحب۔ ان دو چار سونے چاندی کی چیزوں پر کیا ملیگا۔ لڑکے کا باپ تو موٹر مانگتا ہے۔

فاطمہ۔ کیا ان کی ایسی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ ہماری حالت کو نہیں جانتے۔

خانصاحب۔ ان کو ہمارے حال سے کیا واسطہ۔ دوسری شادیاں کا رنگ دیکھکر ان کے تو دیدے پھٹے ہوئے ہیں۔

فاطمہ۔ ہائے کم بختی۔ ارے وہ زمانہ اور تھا۔ اب اور وقت ہے۔ جب ہمارے پاس سب کچھ تھا۔ اور اب کچھ نہیں ہے۔

خانصاحب۔ یہہ کس سے کہیں اور کون سُنے۔ سُنے بھی کیوں۔ وہ تو اپنی دولت پر پھولے ہوئے ہیں۔

فاطمہ۔ تو پھر بسم اللہ کی شادی امیر گھرانے میں کرنی ہی نہ تھی۔ کسی اپنے جیسے غریب کا لڑکا ڈھونڈا ہوتا۔

خانصاحب۔ یہہ بھی مشکل تھا۔ بھائی بند کیا سمجھتے اور بسم اللہ کیا کہتی کہ دوسری بہنوں کا بیاہ تو امیروں میں کیا اور مجھے ایک گنوار کے حوالہ کر دیا۔ پھر پڑھی لکھی لڑکی پڑھا لکھا ہی بر مانگتی ہے۔

فاطمہ۔ میرا تو دم الٹنے لگا۔ تو تم یہہ زیور لیجاؤ اور جو جی میں آئے کرو۔ بے چاری فاطمہ نے اپنے ہاتھ گلے میں جو کچھ تھا اتارا اور خانصاحب کے آگے رکھدیا۔ خانصاحب غریب نے آنسو بہاتے ہوئے ان کی پوٹلی باندھی اور گھر سے نکلے۔

"اماں! میں اپنا بیاہ کرنا نہیں چاہتی" بسم اللہ نے شرم سے سر جھکا کر کہا۔

فاطمہ۔ کیوں بیٹی۔ بیاہ کیوں نہیں کرو گی؟ کیا تم کو دلہن بننا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

بسم اللہ۔ اماں! میں ایسی دلہن بننا پسند نہیں کرتی جسکا نتیجہ میرے والدین کیلئے تباہی اور خانہ بربادی ہو۔ مجھے سب معلوم ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ والد میرے کارن ایک ایسی مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں جسکو وہ اس بڑھاپے میں برداشت نہیں کر سکتے رہنے کا مکان اور زندگی کا سارا سامان بک گیا مگر جہیز کی رقم پوری نہیں ہوئی۔ اب سمدھیانے کا ناواجب مطالبہ پورا کرنے کیلئے تمہارا ہاتھ گلہ ننگا کر کے گئے ہیں۔ جاتے وقت وہ رو رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ میں اندھی نہیں ہوں۔ میں اتنی بیدرد نہیں کہ اپنے خوشی کے واسطے اپنے بڑھے باپ اور اپنی ضعیف ماں کا خیال نہ کروں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے سکھ کی خاطر تم سب دکھ میں مبتلا ہو اس گھر سے نکلو۔ مزدوری یا غلامی کر کے اپنا پیٹ پالو۔ میری آنکھیں ہرگز ہرگز یہہ منظر نہ دیکھ سکینگی"

یہہ کہکر وہ زار قطار رونے لگتی ہے۔

فاطمہ۔ بیٹی! اب کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ تقدیر کے لکھے کو کوئی میٹ نہیں سکتا۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو یہہ دعا ہے کہ خدا تم کو اپنے گھر میں آباد کرے۔ اور تم اپنے میاں کے ہاں سکھ چین سے رہو ہم سے دن جیتے رہینگے۔ صبح کے چراغ ہیں۔

بسم اللہ۔ میری خوشی تو جب تھی کہ آپ اپنے گھر میں خوش رہتے۔ یہہ تو ساری عمر کا رنج ہے۔

فاطمہ۔ رنج کس بات کا؟ تیری شادی تو اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں ہو گی۔ تیرا دولہا وکیل ہے۔ سمجھدار ہے۔ وہ ہماری خوشی کے لئے یہی کافی ہے۔

بسم اللہ۔ سسرال والے امیر ہیں تو کیا ہوا۔ جس سے میری شادی ٹھہرائی ہے وہ تعلیم یافتہ ہے تو ہونے دو لیکن یہہ تو دیکھو کہ میری وجہ سے آج یہہ گھر اجڑ رہا ہے۔ ماں باپ کنگال بن رہے ہیں۔ برادری کو پرواہ نہ ہو نہ سہی۔ دنیا اس انقلاب سے متاثر نہیں یہ ان کی سنگدلی ہے میں ایک بیٹی بنکر کس طرح برداشت کر سکتی ہوں کہ ماں باپ کا گھر بگڑ کر میرا گھر بنے۔ ہائے اباجان کی یہہ قابل رحم حالت۔ آنکھوں میں آنسو۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تمہارے سہاگ کی پوٹلی ضعیفی۔ چلنے کیلئے لکڑی کا سہارا۔" یہہ کہتے کہتے بسم اللہ۔ اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے اور باوجود ضبط کے وہ چیخ چیخ کر رونے لگتی ہے۔

٭٭٭

"جب تک دولہا کیلئے موٹر دروازے پر آکر نہ کھڑی ہو گی نکاح نہیں ہو سکتا۔" دولہا کے باپ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

احمد زماں خاں۔ پناہ لیجئے خانصاحب پناہ لیجئے۔ جس نے بیٹی دی اس نے کیا انکار کیا۔ وقت کی بات ہے آپ کے سارے مطالبے تو پورے ہو گئے بس ایک موٹر رہ گئی ہے۔

دولہا کا باپ۔ کبھی نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور جو کچھ دیا ہے تم نے اپنی لڑکی کو دیا ہے میرے لڑکے کا شوق تو پورا نہیں کیا۔

دولہا کا ماموں۔ خانصاحب جبتک موٹر نہ آجائیگی نکاح نہیں ہوگا۔ آخر تم نے سمجھا کیا ہے۔

احمد زماں۔ سنو بھائی! آپ کو ایسی بات تو منہ سے نکالنی نہیں چاہئے میری سفید ڈاڑھی کی بے عزتی نہ کرو۔ اپنے ایک تباہ شدہ بھائی کی لاج رکھو۔ خدا جانے اتنا ہی سامان کیونکر کیا ہے۔ موٹر کا بندوبست نہیں ہو سکا تو معاف کرو۔ نکاح ہو جانے دو۔ خدا کو منظور ہے تو وداع تک جس طرح بھی بنیگا موٹر بھی ہو جائیگی۔

دولہا کا باپ۔ یہہ واہیات باتیں سننے کو ہم نہیں آئے ہیں۔ موٹر لاؤ۔ ورنہ برات اٹھ جائیگی۔

احمد زماں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ برادری کے اس سخت رواج کو کچھ نرم کر دو۔ گھر بار زیور۔ برتن۔ کمپنی باڑی سب بیچ کر تو میں نے تمہاری لاج رکھی ہے اور تم ایک موٹر کے لئے میری پگڑی اتارنے پر آمادہ ہو۔ خانصاحب جی بس سچ کہتا ہوں کہ اب ہم میاں بیوی کے سوا ہمارے پاس کچھ نہیں رہا ہے جس کو فروخت کر کے موٹر خریدیں۔ پھر بھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ جیتا رہا تو یہہ مطالبہ بھی پورا کر دوں گا۔

دولہا کے ماموں۔ یہہ بوڑھے جسم بھی کیوں رہنے دئے۔ انہیں بیچ ڈالتے یا بھرا ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی داماد نہ تلاش کرتے۔ چیز اچھی لوگے تو دام بھی اچھے دینے پڑینگے۔ لاؤ لاؤ جلدی موٹر لاؤ یا موٹر کی رقم نکالو نہیں تو ہم واپس جاتے ہیں۔

احمد زماں۔ رقم ہی ہوتی تو اسی طرح کیوں گڑگڑاتا۔ ہمارے ہارے ہوئے جسموں کی کوئی قیمت ہوتی تو آج برادری کے سامنے یوں ڈاڑھی نہ نچواتا۔ ارے پتھر جیسے دل والے بھائیو۔ میوات کے سپوتو! کوئی تم میں ایسا ہے جو ایک بوڑھے اور ایک بوڑھی کے دام لگائے۔ دام نہیں لگتے اور ان پرانی ہڈیوں کو کوڑے پر پھینکنے کے قابل سمجھے ہو تو میں تم سے بھیک مانگتا ہوں۔ تمہارا ایک ہمقوم بھائی جو کبھی امیر تھا اور آج غریب۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہے خدا کا واسطہ دیکر انسانیت کے نام پر بھیک مانگتا ہے۔ تمہارے سامنے دامن پھیلاتا ہے۔ روپیہ کی بھیک نہیں۔ صرف رحم کی بھیک۔ کیا کوئی

مانی کا دل ہمت والا میری مدد کر بیٹا۔ تم کو بھی خدا نے لڑکیاں دی ہیں اور تم بھی دیر سویر ان کی شادی کرو گے۔ اس وقت تم کو میری بیکسی کا اندازہ ہوگا۔

باہر احمد زماں خاں رحم کی درخواست پر درخواست کر رہے تھے اور اندر فاطمہ اور بسم اللہ کا برا حال تھا۔ دولہا کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن رسم و رواج مانع تھے۔ محفل میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بعض باراتی بھی احمد زماں کی تقریر سے متاثر نظر آتے تھے مگر ہمدردی کی توفیق کسیکو نہ ہوئی۔ آخر برادری کی جہالت اور ضد کے سامنے ساری منت سماجت فضول ثابت ہوئی۔ دولہا کے والد اپنی دولت کے گھمنڈ اور ماموں صاحب اپنے بھانجے کی فضیلت کے غرور میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ براتی بھی آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے چلتے بنے۔ احمد زماں مصیبت زدہ کے دل پر جو گذری وہ گذری۔ براتیوں کی خاطر حسب دستور جو کھانا تیار ہوا تھا وہ پڑا کا پڑا رہا۔ اس المناک منظر کے زیر اثر بیٹی والوں کے مہمانوں میں سے بھی کسی نے نہ کھایا۔ اور یونہی رخصت ہو گئے۔

دل شکستہ احمد زماں بے عزتی۔ مایوسی اور افلاس تین تیروں کا شکار ہو چکا تھا مگر تھام کر بیٹھ گیا۔ آنسوؤں کی جگہ آہیں تھیں۔ چاروں طرف وحشیوں کی طرح دیکھتا تھا اور اپنے زانوؤں پر ہاتھ مارتا تھا۔ آخر اٹھا۔ گاؤں کے کرکمیں اور قرب وجوار کے غریب لوگ جو کھانے کے لالچ میں آئے بیٹھے تھے ان کو کھانا تقسیم کیا۔ اس کام سے فراغت پاکر گھر میں گیا۔ رشتے کنبے یا پاس پڑوس کی جو عورتیں مہمان آئی ہوئی تھیں شادی میں اس طرح کھنڈت پڑتے دیکھکر اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ سامان تتر بتر پڑا تھا۔ ایک کونے میں دلہن کی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ بسم اللہ جہاں دلہن بنی تھی۔ اسی کوٹھڑی میں پلنگ پر روتے روتے سو گئی۔ احمد زماں خاں ننگے پاؤں گھر میں آیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مرتا کا مکان ہوتا ہے۔ آنسو جن کو بڑی دیر سے ضبط کئے ہوئے تھا ٹپکنے لگے۔ صحن میں رکا۔ آنکھیں پونچھیں آگے بڑھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"بسم اللہ کی ماں! بسم اللہ کی ماں! کہاں ہو!"

فاطمہ جو اپنی مصیبت پر ماتم کرتے کرتے کسی خیال میں محو ہو گئی تھی چونک کر بولی۔

فاطمہ۔ "کیا برات گئی۔ ہائے اس ناموسی سے تو اچھا تھا کہ ہم مرجاتے"

احمد زماں۔ ہاں برات اٹھ گئی۔ اب ہمیں کہیں منہ دکھانے کو جگہ نہیں رہی۔ اللہ کی مرضی اس کے کام میں کسکو دخل ہے۔

فاطمہ۔ "جی چاہتا ہے کہ کچھ کھا کر سو رہوں۔"

احمد زماں۔ مگر موت بھی تو اپنے بس کی نہیں ہے۔

فاطمہ۔ "تو پھر اب کیا ہوگا۔ میرا تو اس سامان کے دیکھنے سے کلیجہ پھٹتا ہے۔"

احمد زماں۔ "اس سامان میں آگ لگا دو۔ یہی ایک علاج ہے۔ کیونکہ یہہ مکان بھی تو ہمیں چھوڑنا ہے آج ہی تک خریدار نے اجازت دی تھی۔" یہہ کہکر احمد زماں نے چولہے میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی نکالی اور سامان کا ایک جگہ ڈھیر لگا کر آگ دیدی۔ چوبی سامان اور ریشمی وسوتی کپڑے دھڑ دھڑ جل رہے ہیں۔ احمد زماں اور فاطمہ دونوں روتے جاتے ہیں اور اس ہولی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

احمد زماں۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) اب ہمیں نہ چوروں کا کھٹکا رہا نہ ٹپکے کا ڈر۔ رات کو اندھیرے اندھیرے یہاں سے نکل چلیں گے۔ وہ جو پرانی باولی کے پاس فقیر نے ایک جھونپڑی ڈالی تھی کئی مہینے سے خالی پڑی ہے۔ اسکو ٹھیک ٹھاک کر کے چل رہیں۔ دن بھر محنت مزدوری کرنا اور پیٹ بھرنا۔

آگ کے شعلوں کی گرمی پاکر بسم اللہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ کوٹھری سے نکلکر باہر آئی اور اپنے جہیز کو آگ لگتے دیکھکر چپکی کھڑی ہو گئی۔ فاطمہ اور احمد زماں خاں میں جو باتیں ہوئی وہ اس نے سُنیں مگر جب اس نے رات کو گھر چھوڑنے کا ذکر سنا تو روتی ہوئی سامنے آئی اور بولی۔

"ابا جان۔ کیا ہمیں اب اس گھر میں رہنا نہیں ملیگا؟"

احمد زماں۔ ہاں بیٹی۔ اب اس گھر میں ہم کیونکر رہ سکتے ہیں۔

بسم اللہ۔ کیوں نہیں رہ سکتے؟

احمدزماں۔ اسلئے کہ یہہ فروخت ہوچکا ہے اور اب اس میں رہنے کا ہمیں کوئی حق نہیں رہا۔

بسم اللہ۔ اگر ہم اسکا کرایہ دیں اور رہنا چاہیں"۔

احمدزماں۔ وہ شاید اس کو کرایہ پر نہ دیں۔ سنا ہے کہ وہ خود رہینگے اور اگر وہ کرایہ پر دیں بھی تو ہم کرایہ کہاں سے ادا کرسکیں گے

بسم اللہ۔ میرے لئے جو زیور آپ نے بنوائے ہیں ان کو بیچکر۔

احمدزماں۔ توبہ۔ توبہ۔ بیٹی ایسی منحوس فال منہ سے نہ نکالو۔

بسم اللہ۔ ان کا بیچنا منحوس نہیں ہے بلکہ انکا رکھنا منحوس ہے۔ ان ہی رسم ورواج کی نحوست نے ہم کو یہہ دن دکھایا ہے۔ آپ قطعی طور پر ان کو بیچ ڈالئے اور اسی مکان کو کرایہ پر لیکر رکھئے۔ جب تک روزی کا کوئی وسیلہ پیدا ہو آخر گذارے کیلئے بھی تو کچھہ نہ کچھہ روپیہ کی ضرورت ہوگی۔

مایوسی نے احمدزماں کی رہی سہی عقل بھی کھودی تھی وہ بیٹی کی اس معقول گفتگو کا کوئی جواب نہ دیسکا۔ فاطمہ بھی لڑکی کا منہ دیکھہ رہی تھی اور حیران تھی کہ کیا کہے۔

بسم اللہ۔ اباجان اگر آپ کو مجھہ سے محبت ہے تو آپ میرا کہنا مانیں۔ موت سے پہلے مرنا اور مصیبت کا جواں مردی سے مقابلہ نہ کرنا کہاں کی بہادری ہے۔ آپ ابھی جائیں اور اس مکان کو جس طرح بنے کرایہ پر لیں۔ اسی میں ہماری ساکھہ ہے اور یہیں رہکر ایک دن ہم اپنی بگڑی ہوئی قسمت بنا سکتے ہیں۔

بیٹی کی یہہ باتیں احمدزماں۔ نے بڑے غور سے سنیں اور یہہ کہکر کہ اچھا بیٹی جو تم کہتی ہو وہی کرینگے۔ جو خدا کی مرضی تھی ہوا اور جو اس کی مرضی ہے ہوگا اب تو تم ہماری بوڑھی عقل کی روشنی ہو۔

٭٭٭

"بسم اللہ۔ بسم اللہ! بیٹی کہاں ہو؟ جلدی آؤ۔ دیکھو تو یہہ کیا ہورہا ہے" فاطمہ نے بیچینی سے پکارکر کہا۔ بسم اللہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے والد کے کپڑوں میں پیوند لگارہی تھی۔ ماں کی آواز سن کر دوڑی ہوئی آئی۔ دیکھا کہ احمدزماں۔ چارپائی پر بے حس وحرکت پڑے ہوئے ہیں اور فاطمہ رورہی ہے۔ بسم اللہ آکر باپ کے سرہانے کھڑی ہوگئی اور غمناک آواز سے پوچھا" اباجی کیسے ہیں؟ ایسے نڈھال کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ ابا! ابا! بولتے کیوں نہیں ابا! ہائے۔ ان صدموں نے ہمیں ماردیا۔ ضعیف باپ کی یہہ حالت دیکھکر بسم اللہ رونے لگی اور بیٹی کو روتا دیکھہ کر مصیبت زدہ فاطمہ کی بھی چیخ نکل گئی۔ چیخ کی آواز سے احمدزماں نے آنکھہ کھولی۔ ماں بیٹیوں کو روتا دیکھکر اس کا دل بھر آیا اور وہ بھی منہ ڈھانک کر رونے لگا۔ رونے سے جب ذرا طبیعت ہلکی ہوئی تو بولا۔ روتی کیوں ہو۔ میرے مرنے میں ابھی دیر ہے۔ تکلیفوں کے خاتمہ کا وقت نہیں آیا۔ لیکن آنے والا ہے ضرور آئیگا۔ شاید آج ہی آجائے۔ آج ہی۔ ابھی ابھی میں نے ایک خواب دیکھا ہے بہت مبارک خواب"۔

بسم اللہ۔ کیا خواب دیکھا ہے اباجان؟

احمدزماں۔ تم سے کہنے کا نہیں ہے۔ دن کا خواب کسی سے نہیں کیا کرتے۔ تاثیر جاتی رہتی ہے بس یہہ سمجھہ لو کہ اس کی تعبیر نجات ہے۔ اس دکھہ بھری زندگی سے نجات۔ اب تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ میں اچھا ہوں۔ جاؤ شام ہورہی ہے گھر کا دہندا کرو۔

فاطمہ و بسم اللہ دونوں آہستہ آہستہ اٹھ کر چلیں اور چلتے چلتے بسم اللہ نے پوچھا" اباجی آپ کے واسطے کیا پکایا جائے۔ کس چیز کو آپ کا جی چاہتا ہے"۔

احمدزماں خاں نے ایک بیچینی سی محسوس کی۔ بیٹی کے چہرہ پر محبت بھری نظر ڈالی۔ ایک لمبا سانس لیا اور کسی گہرے فکر کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

بیٹا آج تو گڑ کے میٹھے چاول پکالو۔ سب ملکر کھا لینگے۔ کئی دن سے دل چاہ رہا ہے چاول بھی ہیں اور گڑ بھی ہے صبح کو لے آیا تھا۔ میری چارپائی کے نیچے ہنڈیاں میں رکھا ہے۔ دیکھو کیسا اچھا ہے" بسم اللہ نے اس فرمائش پر اعتراض کیا اور فاطمہ نے بھی بہت کچھہ کہا لیکن بوڑھے احمدزماں نے یہہ کہکر کہ" ان چاولوں کا خواب سے تعلق ہے اور ان ہی کے کھانے پر ہماری نجات ہے"۔ ٹالدیا چنانچہ چاول پکے۔

اور دونوں ماں بیٹیوں نے بڑے اہتمام سے پکائے۔ ماں نے بیٹی سے کہا۔ "بسم اللہ۔ تم ذرا باپ ہی کے پاس بیٹھو۔ شاید انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو۔" بیٹی نے جواب دیا "تم بھی چلو اب یہاں کیا کام ہے۔ چاول تو پک چکے ہیں۔ چاولوں کی پتیلی کو کرو۔ ... کیا کھوپل پر۔ پھر دونوں احمد زماں کے پاس گئیں۔ احمد زماں صاحب نماز پڑھکر مصلے پر بیٹھے دعا مانگ رہے تھے اور خدا نے تندرست ... سے بیمار ہونے کے ان میں کوئی مرض ... کی علامت نہ تھی بسلام پھیرا تو بسم اللہ نے پوچھا " اباجان ... کا بڑا شکر ہے کہ آج آپ خوش ہیں۔ ہمارے دن اب پھر گئے۔" خانصاحب نے کہا " ہاں بیٹی۔ اس کو مہربان ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔" فاطمہ بولی " اب میری بسم اللہ کی شادی کا فکر بھی جلدی ہی کرنا۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ لیکن خدا کیلئے پہلا جیسا سماں پیدا نہ ڈھونڈھنا غریبوں کی کن ... تی گھر جائے تو اچھا ہے۔" احمد زماں نے ایک عجیب حسرت آمیز نگاہ سے بیوی اور بیٹی کیطرف دیکھا اور کسی گہرے غم کو چھپانے کیلئے پلنگ پر جالیٹا بعد عشاء تینوں نے ملکر کھانا کھایا۔ چاول اچھے پکے تھے سب نے خوب کھائے اور پیٹ سے زیادہ کھائے۔ جب کھانے سے فراغت پائی تو احمد زماں خاں نے کہا۔ اب تم جاؤ میں خدا کے فضل سے اچھا ہوں بیفکر ہوکر سو رہو۔ اور یہ سمجھ لو کہ ہماری ساری مصیبتیں ختم ہوگئیں۔ بیٹی ذرا وضو کیلئے مجھے پانی دیتی جانا۔

بسم اللہ پانی لائی۔ احمد زماں نے وضو کیا۔ جانماز بچھائی اور نماز کیلئے کھڑا ہوگیا۔

چارپائی پر لیٹا ہوا احمد زماں زیادہ بےچین ہے۔ بار بار پیاس لگتی ہے۔ سانس کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے۔ سر چکرا رہا ہے۔ کراہتا ہے۔ آواز دینا چاہتا ہے لیکن آواز نہیں نکلتی۔ اٹھتا ہے تو اٹھا نہیں جاتا صبح نمودار ہو چکی ہے اور وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہے مگر حالت بگڑتی جاتی ہے۔ بدن سرد ہے۔ آخر بمشکل چارپائی سے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا اس کمرے میں گیا جہاں دونوں ماں بیٹیاں سو رہی تھیں۔ آواز دی بسم اللہ کی ماں۔ بسم اللہ کی ماں۔ جواب ندارد۔ بسم اللہ کو ٹٹولا۔ وہ بھی نہ بولی۔ ہاتھ سے دیکھا تو اس کو اپنے بستر پر بےحس پڑا ہوا پایا۔ منہ پر ہاتھ رکھا بالکل برف۔ سانس کا نام نہیں۔ بیوی چادر میں لپٹی پڑی تھی اس کا منہ کھولا۔ ایک چیخ ماری اور گر پڑا زبان سے صرف یہہ نکلا "برادری کے رواجوں پر لعنت۔ لعنت۔ لعنت!"

پھر زبان رک گئی آنکھیں بند ہوگئیں۔ سانس دھیما پڑنے لگا اور چند منٹ کے بعد اس مکان میں جہاں بسم اللہ کی برات کے آنے کی امیدوں کے چراغ جلاکر روشنی کا خیال تھا اب اندھیرا اور ہمیشہ کے لئے اندھیرا تھا اور تین مردے پڑے ہوئے تھے۔ ایسے بیکس۔ ایسے بے یار و مددگار کہ کوئی کفن دینے والا اور گور گڑھا کرنے والا بھی نہ تھا۔

**وصی اشرف**

---

بسلسلہ صفحہ ۷۲ سوراخ میں سے دیکھتا ہے۔ نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

اسی قسم کے ہمارے خلاف کئی رزولیشن پاس کئے گئے حتیٰ کہ ہم گھبرا کر وہاں سے ہٹ گئے۔ چند ہی منٹ میں کیا دیکھتا ہوں کہ ہم ... قاصد رزولیشن کی ایک کاپی ہمارے پاس بھی لایا اور ہماری گود میں ڈال کر بھاگ گیا۔ رفیقہ میری بیوی نہیں ہوسکتی۔ جو لڑکی مجھ سے اس قدر بیزار ہو وہ مجھے کب قبول کرسکتی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز میں نے اکرام صاحب سے تمام واقعات من وعن کہدیئے۔ انھوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ میں اور جھینپ گیا پھر وہاں سے دُم دباکر جو بھاگا ہوں تو وطن آکر دم لیا +

قیسی رامپوری

# ظرافت

از حضرت ایم۔ اسلم۔

مغرب کے مشہور مزاح نگار "ملّا" سٹیفن لی کاک نے مزاح نگار انسان کی جو تعریف لکھی ہے وہ ہم صرف "شاہجہاں" والوں کی خاطر یہاں نقل کئے دیتے ہیں۔ کیونکہ دہلی سے جناب ناصری کا حال ہی میں جو وارنٹ طلبی مضمون بلاضمانت ہمیں موصول ہوا ہے۔ اور وہ بھی پہلی بار۔ تو اس میں صاف لکھا ہے کہ کوئی مختصر سا مضمون شاہجہاں کیلئے بھیجئے۔ اور اسکے ساتھ ہی ہم سے یہ وعدہ بھی کیا گیا ہے کہ آیندہ ہمیں تکلیف نہ دی جائیگی۔ ہم اپنے دہلوی احباب کی خاطر یہ کہنے کی جرات تو کر نہیں سکتے کہ ہم اس قسم کے چکموں میں کم ہی آیا کرتے ہیں۔ لیکن خیر! ہم سب سے پہلے جناب ناصری کی خدمت میں عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ "مزاجی" کے حال پر تو اب رحم فرمائیے۔ وہ بیچارے تو جناب مولوی شاہد احمد صاحب کے سر کو دعا دیتے ہیں کہ ان کی نظر عنایت سے انکی "وہ تشہیر" ہوئی کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اردو رسائل کے ایڈیٹر صاحبان سے تو خدا ہی سمجھے کہ ان شریف لوگوں نے گڑے مردے اکھیڑنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ مزاجی کی "ہست و بود" کو ایک مدت ہو چکی لیکن یہ حضرات اب بھی انہیں کاغذی پیراہن پہنائے چلے جاتے ہی۔ پھر ہزار شاباش ہے ہندی والوں پر جو مزاجی غریب ایسے بھولے بھالے آدمی کو برابر "شدھ" کئے جاتے ہیں۔ اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔ اور پھر یہ دہلی کے براڈ کاسٹنگ والوں پر ادو ہی کی مار جنہوں نے مزاجی غریب کی وہ گت بنائی کہ انہیں معجون مرکب بنا ڈالا۔

---

اسلئے ہم ان سب باتوں کا اعلیٰ رؤس الاشہاد کھاری باؤلی والے "ساقی جی" کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ داورِ محشر کے حضور میں جب مزاجی داد طلب ہونگے تو ہم سب سے پہلے "ساقی" والوں کے خلاف گواہی دینگے کہ ہم نے مزاجی کے متعلق جو کچھ لکھا محض "ساقی" والوں کی تحریک سے لکھا۔ ہاں! اگر جناب مولوی شاہد احمد صاحب کسی روز چپکے سے لاہور تشریف لاکر ہم سے کچھ "ساز باز" کرلیں تو ممکن ہے ہم مان جائیں۔

---

تو خیر! یہ تو ایک جملہ معترضہ تہا۔ تو آمدم برسر مطلب "سٹیفن لی کاک" کا قول ہے کہ

"حقیقت میں مزاح نگار وہی شخص ہو سکتا ہے جسے ہجوم افکار نے پریشان کر رکھا ہو۔ لانبے قد کا ہو چہرے پر زردی سی نمایاں ہو۔ اگر چندیا صاف ہو تو یقیناً شہرت اسکے قدم چومے گی۔"

تو اب جناب ناصری سے کوئی یہ تو پوچھے کہ "سٹیفن لی کاک" کے قول کے مطابق کیا ہم انہیں مزاح نگار نظر آتے ہیں؟ یا آپ نے محض سنی سنائی پہلے باندھ لی ہے۔

حضرات! مزاح نگاری تو کوئی تعریف کی بات نہیں شاہان مغرب کے دربار میں ظریف کا اصلی نام تو "کورٹ جسٹر"

ہوتا تھا اور لوگوں کو اسکی باتوں سے تو شاید کم لیکن اس کی ہیئت کذائی دیکھکر ضرور ہنسی آجاتی تھی۔ تو اسلئے ہم یہ سمجھنے کے لئے بے حد مجبور ہو رہے ہیں کہ آپ اپنے مزاح نگار دوستوں کو "کورٹ جسٹر" تو نہیں لیکن "پبلک جسٹر" ضرور سمجھتے ہونگے

---

ہمیں خوف ہے کہ کوئی "ڈکشنری داں" حضرت جسٹر اور ہیومرسٹ کی بحث نہ لے بیٹھے اس لئے ہم اس موضوع کو یہیں ختم کئے دیتے ہیں کیونکہ جب اردو ہندی کا قضیہ موجود ہو تو پھر کسی اور موضوع پر بحث کرنا "کوڑ مغزی" کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

تو مختصراً عرض یہ ہے کہ انسان پر جب ہجوم افکار کا غلبہ ہوتا ہے اور "کوئی امید بر نہیں آتی" والا مضمون بن جاتا ہے تو قدرت اسے ایک ایسی قوت عطا کردیتی ہے کہ اسکا اظہار یا مظاہرہ دیکھنے اور سننے والوں کے لئے سامان تفریح بن جاتا ہے۔ مزاح نگاری کوئی آسان چیز نہیں۔ اگر اسے افسانہ نگاری کی ایک شاخ تسلیم کیا جائے تو یہ فن سب سے مشکل ہے۔ مزاح نگاری ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا فن ہے جس سے کڑوی بات بھی بھلی ہی لگتی ہے یعنی انداز بیان میں ایک خوشگوار کیفیت پیدا کردینا اصل مزاح نگاری ہے۔

---

آج کل اکثر لوگ شکل و صورت سے اپنے آپ کو ظریف بزلہ سنج ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن قسم لے لیجئے ہنسنا تو رہا درکنار ان کے گدھے پن پر رونا بھی نہیں آتا۔ اگر آپ اس خیال سے خامہ فرسائی فرمادیں کہ آپ کی تحریر پڑھکر انسان "لوٹن کبوتر" بن جائے تو یقین جانئے جہانتک ظرافت اور مزاح کا تعلق ہے آپ کی تحریر گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچ سے زیادہ پر لطف نہ ہوگی۔ آمد اور آورد کا جو تعلق شعر سے ہے وہی مزاح نگاری سے ہے تحریر میں مذاق یا مزاح کا رنگ پیدا ہونا طبیعت کی افتاد پر منحصر ہے۔ وہ لوگ جو تفکرات میں گھرے رہتے ہیں اور زیادہ غور و فکر کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ خود تو ڈوبتے ہی ہیں لیکن ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ لیکن وہ پاک نفس جو یہ سمجھے کہ ؎

دم زندگی رم زندگی۔ غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

وہ آپ کو ہر حالت میں خوش اور قانع نظر آئے گا۔ وہ اگر شکوہ بھی کرے تو انداز بیان میں ایک لطف ہوگا بیفکری اور مزاح میں قدرتی میل جول ہے۔ گو اس کا اظہار بہت کم ہوتا ہے وہ شخص کبھی مزاح نگار نہیں ہوسکتا جو ہمچوں من ڈیگرے نیست۔ بنا پھرتا ہو۔ جو شخص زندگی کی تگا پو میں ہر ہم نفس کو نیچا دکھانے کے فکر میں رہے اسکی طبیعت میں ظرافت نام کو بھی نہیں ہوا کرتی۔

---

مزاح یا ظرافت ان لوگوں میں آپ پائیں گے جو دنیا کے سرد و گرم سے آشنا ہوچکے ہوں۔ مزاح حقیقت میں دل بہلانے کی ایک چیز ہے خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو۔

لیکن خیر! یہ تو محض کام کی باتیں ہیں جنکا ذکر تضیع اوقات کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ آپ جانئے کہ عام طور پر حاکم۔ قومی لیڈر قومی کارکن۔ علماء اور بڑے نام کے ادبا ظرافت سے اسی طرح کورے ہوتے ہیں جیسے عام ہندوستانی رواداری یا وطنیت سے۔

لیکن وہ بزرگ جو قوم کے نام پر روپیہ سمیٹنے کے مرض میں مبتلا ہوں اور "حساب کتاب" کے نام سے اس طرح بھاگیں جیسے شیطان لاحول سے ان کی عادات و اطوار میں ظرافت ضرور پائی جاتی ہے یہی صورت اُن لیڈروں کی ہ

بقیہ بر صفحہ ۱۲۲

# دامنِ گلچیں

## پنہارن

میں دنیا کو پانی پلاتی ہوں لیکن خود پیاس سے مرتی ہوں۔

جب میں سر پر گاگر رکھ کر چلتی ہوں لوگ کہتے ہیں رس چھلکنے لگتا ہے لیکن میرا پریشان دل جو ہاہاکار مچاتے رہتا ہے اگر اسے کوئی دیکھ پاتا۔

اگر اسے کوئی سن پاتا؟

نہ جانے پہلے پہل کب یہ گھڑا میرے سر پڑا۔ نہ جانے کب یہ گھڑا اترے گا؟

ہاں! دھندلی سی یاد تو ہے۔

ماں کا آنچل پکڑ کر پہلی مرتبہ کنوئیں کی طرف چلی اور ضد پر ضد کی تو اس نے ایک چھوٹی سی ٹھلیا میرے لئے بھی مول لے دی۔

سچ مچ پہلے دن میرے اس چھوٹے سے گھڑے سے رس چھلکا تھا۔

میری لال چونری بھیگ گئی تھی۔

لیکن آج؟

اوڈگل،" تو ابھی آنے کو ہے جب کہ بڑھاپا میری کمر توڑ دے گا۔ لیکن مجھے سر پر گھڑا اٹھانا ہی پڑے گا۔

کیونکہ اس گھڑے نے میرے سر سے ہی نہیں میرے پیٹ سے بھی مضبوط رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ سر پر جس دن گاگر نہ ہو اس دن اس پاپی گڈھے میں اینٹ پتھر کہاں سے پڑیں گے۔

+ + + + +

میرے سر پر پانی کا گھڑا ہے۔ میری چھاتی میں امرت کی کلش ہے۔ میرا تھکا ماندہ مالک کہیں تالاب یا ندی کا گدلا پانی چلو سے بھر کر پیتا ہوگا۔ میں دن رات سر پر پانی سے بھرا پیتل کا خوبصورت گھڑا ڈھوتی ہوں۔

میرے سر پر گاگر ہے آنکھوں میں کاجل ہے، پیلے کپڑے پہن کر آج میں گھر سے نکلی ہوں۔

وہ چھیلا گنگنا پڑا " سر پر گھڑا لئے پنہارن"!

نہ جانے کیوں سچ مچ میرے گھڑے سے رس چھلکنے لگا۔

میری دنیا کو نرک کرنے والی آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے ترچھی چتون آگئی۔

اس پیلی ساری کے رنگ نے میرے دل کو گلابی بنا دیا۔

کاجل! تیرا برا ہو۔ میرے تمام جیون پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا۔

جن کے پیٹ کے لئے یک مٹھی اناج کی صورت نہیں ان کے دل میں محبت کی سوت کہاں سے پھوٹ سکتی ہے۔

بوڑھے برہما۔ تیرا ناس ہو۔

یگ یگ سے گاگر ڈھو رہی ہوں اور یگ یگ تک میں گاگر ڈھونے کے لئے قید کی جاؤں گی۔

دنیا میں کچھ لوگ بغیر ہاتھ پیر ہلائے بیٹھے بٹھائے پانی پیتے رہیں۔ اس کیلئے یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ گاگر ڈھوتے رہیں۔ ماگھ کا آغاز ہے۔ پچھوا ہوا بھی کرتی کو چھید کر چھاتی کی ہڈی کو بھی بلا رہی ہے۔ انگ انگ سکڑا جا رہا ہے۔ لیکن مجھے گاگر ڈھونی پڑے گی کیونکہ کسی کو سویرے ہوتے ہی کنوئیں کا گرم

گرم پانی چاہئے۔

جیٹھ کی دوپہر۔ اوپر سے آگ کی بارش۔ نیچے توے سے جلتی زمین۔ لیکن مجھے گاؤں سے دور کے اس "امرائی" کے کنوئیں کا تارو ٹھنڈا پانی ڈھو کر اس کو پلانا ہی ہوگا۔ برسات کا سیاہ فام آسمان ہو۔ یا جاڑوں کی چاندنی رات میرے سر پر گاگر ہوگی گاگر ——— گاگر!! کہیں شادی ہو یا ماتم کہیں عید ہو یا محرم کہیں راگ ہو یا آہ و زاری میرے سر پر گاگر ہوگی۔

\+ + +

بھگوان مجھ سے یہ گاگر اب نہیں ڈھوئی جاتی۔ میری مدد کر۔

یا ——— یا تو میرے سر سے یہ گاگر اتار دو۔

یا — یا تو میرے سر سے یہ گاگر اتار دو۔

ہاں — یا تو میرے سر سے یہ گاگر اتار دو۔

یا اپنی اس ٹیڑھی گاگر (سنسار) کو پھوڑ دو۔

آخر کار کچھ نہیں تمہاری اس گاگر کو بہت دیکھا۔ بہت پرکھا یہ رکھنے لائق رہنے لائق نہیں ہے نہیں ہے۔ تو پھوڑ دو ہاں! یا تو میرے سر سے یہ گاگر اتار دو۔ یا اپنی اس ٹڑی گاگر کو پھوڑ دو۔

نہیں پھوڑو گے؟ تو یہ ایک دن پھوٹے گی ہی۔

یاد رکھو چھوٹی کنکری کی چوٹ سے بڑی گاگریں پھوٹ چکی ہیں۔

اندرجیت شرما۔

# دکھیا ماں

تجھے کس نے ستایا ہے ماں؟

تیری آنکھوں میں آنسو ہیں؟

تو رو رہی ہے!

ماں! — پیاری ماں!

تجھے کس نے ستایا ہے؟

---

تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

وہ تیرے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیں گے۔

ماں، تو غم نہ کر۔ تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں۔

ماں! وہ لڑ سکتے ہیں۔ ان میں ہمت ہے، حوصلہ ہے، دماغ ہے سب ہے ماں۔ سب کچھ ہے تو فکر نہ کر، غم نہ کر۔

---

وہ دن گئے ماں جب وہ بچے تھے، جب وہ نادان تھے۔

اب وہ تیری عزت کو، تیری آبرو کو سمجھنے لگے ہیں۔

اب ان میں عقل آ گئی ہے۔

وہ کریں گے۔ ماں۔ وہ سب کچھ کریں گے۔

وہ تیرے دشمنوں کو پچھاڑ دینگے۔ ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھیں گے۔

ہاں، ماں، تیرے بیٹے جوان ہو گئے ہیں!

---

جب وہ سب ملکر تیرے گرد جمع ہوں گے تو تو خوشی سے پھولی نہ سمائیگی تیری خوشی کا ٹھکانا نہ رہیگا۔ تو مسکرا دیگی۔

اور ——— اور جب وہ سب کر ملکر تیری جے کے نعرے لگائیں گے، تیری فتح کا گیت گائیں گے۔ تو تیرے دشمن کانپ اٹھیں گے۔

---

جب وہ حسن و عشق، دھرم ادھرم، مذہب و ملت کے جھگڑے چھوڑ کر آپس کی رنجشوں کو بھلا کر میدان میں کود پڑیں گے اور دشمنوں کو للکاریں گے تو دشمن خوف سے تھرا اٹھیں گے!!

---

وہ تجھے خاک سے اٹھا کر تخت پر بٹھائیں گے۔ تیرے سر پر تاج رکھیں گے تیری پوجا کریں گے۔ تو۔

تو ان دنوں کو بھول جائے گی۔

ہاں۔ ماں..... تو یقیناً ان مصیبت بھرے دنوں کو بھول جائیگی۔

ہاں ہاں ماں ——— اب تیرے بچے جوان ہو گئے ہیں۔!!

گوردھن داس بھواتی